لسانی مطالعے
گیان چند
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

لسانی مطالعے

لسانی مطالعے

گیان چند

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

پہلی اشاعت : 1973
چوتھی طباعت : 2010
تعداد : 550
قیمت : -/65 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 674

Lisani Mutaley
by
Giyan Chand

ISBN :978-81-7587-438-1

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159
ای-میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈس، 1397، بازار مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھر پور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تا کہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

انتساب

اپنے مخلص کرم فرما

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

پی ایچ ڈی - ڈی لٹ (پیرس)

پروفیسر و صدر شعبۂ لسانیات مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کے نام

فہرست

مقدمہ

اُردو میں لسانیات کی ابتدا ڈاکٹر زورؔ کی کتاب "ہندوستانی لسانیات" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک سناٹا رہتا ہے۔ آزادی کے بعد ہند و پاک دونوں ممالک میں اس موضوع پر اکا دُکا کتابیں لکھی گئیں۔ پچھلے دس سال سے رسالوں میں لسانیات پر مضمون بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔ شروع شروع میں عام قارئین ان مضامین کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن اب ان کی بھڑک کم ہو گئی ہے

لسانیات کی جدید شاخ تجزیاتی لسانیات ہے جس کا اہم ترین شعبہ صوتیات ہے۔ اُردو میں اس کا مطالعہ بہت ابتدائی منزل میں ہے۔ ابھی تک اُردو میں اس موضوع پر کوئی مکمل کتاب نہیں۔ مضامین متعدد ملتے ہیں۔ آئندہ اوراق میں بیشتر اسی کی طرف توجہ کی گئی ہے

میں نے اپنی محدود متاع کے باوجود اُردو صوتیات کے بعض مسائل پر غور و خوض کیا اور اپنی فکر کے نتائج قلم بند کر لیے۔ ان کے بارے میں میں نے اپنے لسانیات کے استاد، ڈاکٹر اشوک کیلکر، ریڈر شعبۂ لسانیات دکن کالج پونا سے بالتفصیل تبادلۂ خیالات کیا۔ ان سے صاد کرانے کے بعد ہی میں نے انھیں سپردِ قرطاس کیا۔ 'اُردو مصوتے'، 'اُردو کی قنائی اصوات' اور 'اُردو میں بَل اور زور' ایسے مضامین ہیں جن کے بیشتر تشکیلات موصوف کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

اپنی صوتیاتی کھوج کے ذیل کے نتائج پر فاضل قارئین کی توجہ چاہتا ہوں؛

۱۔ اُردو میں ہندی سے مشترک دس مصوتے معروف عام ہیں۔ تین خفیف مصوتوں یعنی خفیف اے (نہر)، خفیف اے (سہرا) اور خفیف اُو (کہرام) کو تین مختلف اشخاص نے غالباً ایک دوسرے

ے آزاد طریقے سے دریافت کیا۔ یہ ہیں حیات اللہ انصاری[1] صاحب، شان الحق حقی[2] صاحب اور راقم الحروف[3]۔ بعد میں میں نے ایک چودھواں مصوتہ بھی دریافت کیا جو اُردو سے مخصوص ہے اور ہندی میں نہیں پایا جاتا۔ یہ خفیف اُو (شورا) ہے۔ تفصیل اُردو مصوتوں کے باب میں ملاحظہ ہو

۲۔ اُردو میں جڑواں مصوتوں کی تعیین

۳۔ خفیف ہم مخرج مصوتوں کی دریافت (باندھا، حنڈیر، مانجھا، منگانا) جنھیں گمپرز نے Pre-Nasalised stops، کہا ہے ان کی تفصیل اس مجموعے کے مضمون "اُردو کی خنائی اصوات" کے آخری حصّے میں ملے گی

۴۔ مشہور ہے کہ ہندی انوسوار ہمیشہ مصوتے کے بعد میں آتا ہے۔ میں نے بھنگا، لہنگا، منہدی جیسے چند الفاظ کی نشان دہی کی جس میں انوسوار ہے لیکن مصوتے کی بجائے ہ کے بعد آتا ہے۔

۵۔ اُردو میں تفعّل بِل کے قوانین کی دریافت ڈاکٹر اشوک کیلکر نے اپنی انگریزی کتاب ہندی اُردو میں نقل کیا ہے۔

۶۔ اُردو عروض میں تفعّل بِل کی کار فرمائی کا انکشاف

اُردو ہندی کے مسئلے پر اس مجموعے کے تین مضامین "اُردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ" "اُردو اور ہندی" اور "زبان کا مسئلہ" میں قاری کو بہت سا مواد ملے گا۔

مجموعے کے مختلف مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے اس لیے اس میں کہیں کہیں تکرار راہ پاگئی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

اس مجموعے کی اشاعت کے لیے میں محترمی پروفیسر محمد مجیب، نائب صدر ترقی اُردو بورڈ نیز محبی ڈاکٹر مسعود حسین خاں رکن لسانیات کمیٹی ترقی اُردو بورڈ کا ممنون ہوں۔

گیان چند

---

[1] کشمیری زبان کے لیے ایک رسم الخط از حیات اللہ انصاری اُردو ادب، دسمبر ۱۹۵۸ صفحہ ۵۴۔ ۵۵

[2] اُردو زبان کی رومن املا از شان الحق حقی اُردو نامہ بابت اپریل تا جون ۱۹۶۰ء ص ۸۱

[3] اُردو مصوتوں کی صحیح تعداد از گیان چند نیا دور ستمبر ۱۹۶۱ء

لسانیات کے مطالعے کی افادیت

اس مضمون کو ایک نجی تجربے کے بیان سے شروع کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک بار میرے ایک کرم فرمانے کہا۔

"آپ نے یہ کیا لسانیات پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ ادبیات پر لکھیے۔ آپ مجھے معاف کریں گے۔ جس طرح پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اسی طرح آج کل یہ سچ ہے کہ بگڑا ادیب لسانیات نگار"

ان کا یہ مفروضہ صحیح ہو کہ نہ ہو لیکن اس سے یہ سچائی ضرور سامنے آجاتی ہے کہ اردو میں لسانیات کس قدر نامقبول ہے۔ کسی رسالے میں لسانیات پر کوئی اصطلاحی مضمون لکھیے تو دل کو یہ خلش رہتی ہے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے والے مشکل سے دس افراد ہوں گے۔ بقیہ یہی کہیں گے کہ قابلیت کی نمود کر رہا ہے۔

محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال کے دیباچے میں انگریزی کے مقابلے میں اردو ادب کی تنگ دامانی پر ماتم کیا تھا کہ تہذیب کے دربار میں آج اردو صفِ آخر میں کھڑی ہے۔ کیا تمھیں اس کی یہ بیکسی گوارا ہے' انھوں نے جو بات اردو انشا کو پیشِ نظر رکھ کر کہی تھی وہی بات آج لسانیات کو لے کر اردو پر صادق آتی ہے۔ مغربی زبانوں کو تو چھوڑیے ہندوستانی زبانوں کا دربار ہو تو اس میں بھی اردو سب سے پیچھے رہے گی۔ اردو والے لسانیات کیوں پڑھیں اور اس موضوع پر کیوں لکھیں اس مسئلے کے افادی پہلو پر غور کرنے سے پہلے یہ دلیل سامنے آتی ہے کہ اردو والوں کو لسانیات اس لیے پڑھنی چاہیے کہ ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں والے پڑھ رہے ہیں۔ چاند پر زندگی کے آثار نہیں لیکن اس کے باوجود امریکہ اور روس دونوں وہاں پہنچنے کی قیمتی دوڑ میں لگے تھے محض اس لیے کہ فریقِ ثانی اس شغل میں لگا تھا اور ایک دوسرے سے پیچھے نہ رہنا چاہتا تھا۔ اردو کو بھی دوسری ہندوستانی زبانوں کے دوش بدوش چلنا ہے۔

لسانیات میں اردو کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ ہر سال گرمیوں میں منعقد ہونے والے گرمائی

اسکول لسانیات میں ہوتا ہے۔ ان میں تقریباً سوا سو متعلّم شرکت کرتے ہیں۔ پانچ سات کے علاوہ یہ متعلّم دراصل کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کسی زبان و ادب کے شعبے کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد ہندی کے معلّموں کی ہوتی ہے اور سب سے کم اردو کے اردو والے دو یا تین سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ واضح ہو کہ نصاب کسی مخصوص زبان سے وابستہ نہیں ہوتا۔ درس صرف انگریزی زبان میں دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جنوب کی چاروں ریاستوں، مہاراشٹر، گجرات وغیرہ میں ہندی کے پڑھانے والے انھیں ریاستوں کے اصل باشندے ہوتے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی کا شعبۂ ہندی تامل بولنے والے اساتذہ پر مشتمل ہے تو میسور بنگلور کا کنڑ بولنے والوں پر۔

لسانیات اسکول میں تمام زبانوں اور ریاستوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہاں اندازہ ہوتا ہے کہ کہ ہندوستان میں لسانیات کے بڑے علما غیر ہندی والوں میں سے ہیں ہندی والے نہیں۔ طلبہ میں بھی اچھے اصل اپنی درس گاہوں میں لکچرر ہوتے ہیں) دوسری زبان والوں کو لسانیات میں جو دخل اور درک ہوتا ہے وہ ہندی والوں کو نہیں ہوتا اور اس کی خاص وجہ انگریزی کا ذریعۂ تعلیم ہونا ہے۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ ہندی والے لسانیات میں کسی دوسری زبانوں سے پیچھے ہیں ہندی اور اردو کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

مختلف یونیورسٹیوں سے ایم۔ اے ہندی کرنے کے بعد ہندی کے کسی لسانیاتی موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد دیکھیے وہم و قیاس سے زیادہ ہوتی ہے۔ آگرہ یونیورسٹی کی فہرست نظر سے گزری جس میں اب تک ہندی میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کے نام اور موضوع بھی دیے تھے اور ان کے علاوہ جو آج کل محو ریسرچ ہیں۔ اس فہرست میں لسانیات کے اتنے زیادہ اور اتنے متنوع موضوعات تھے کہ دیکھ کر ہوش پراں ہو گئے۔ ہندی کی کوئی بولی اور کوئی اہم مصنّف باقی نہیں جس کا لسانیاتی مطالعہ نہ کیا گیا ہو۔ کسی کالج یا یونیورسٹی کی لائبریری میں ہندی کا سیکشن دیکھیے موٹی موٹی جلدیں رکھی ہوں گی سور کی بھاشا، تلسی کی بھاشا وغیرہ۔ اردو میں کسی ادیب کی زبان پر ایک کتاب نہیں۔ بلا مبالغہ اردو اور ہندی میں لسانیاتی کتابوں کا تناسب ایک اور پچاس کا ہوگا اس سے کم نہیں۔

اردو میں لسانیات کی قابلِ ذکر کتابیں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور یہ جس موضوع پر جس معیار کی ہیں ہندی میں اس موضوع اور اس معیار کی کتابیں اردو کی کتابوں سے کم از کم تیس سال پہلے وجود میں آ چکی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کو تو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، اس کا ہر طرف بول بالا ہے۔ اردو کو کون پوچھتا ہے؟ لیکن پاکستان میں تو اردو کو سرکاری پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ہم اردو کے ذخیرے پر نظر کرتے ہیں تو ہند و پاک دونوں کی تحریروں کو شامل کر لیتے ہیں کیونکہ ابھی تک اردو ادب کی تقسیم نہیں ہوئی

ہند و پاک کا اردو ادب ایک اکائی ہے۔ اس طرح لسانیات کے باب میں اردو کے بے نہایت فلاح کے سبب اردو میں لسانیات کے ذکر و فکر کی اشد ضرورت ہے۔

بیسویں صدی کے ربع اوّل میں گریرسن نے ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ لیا تھا۔ یہ جائزہ سرانجام دے کر گریرسن نے ہمارے ملک کی بہت بڑی علمی خدمت کی لیکن اس کا طریق کار سائنسی نہ تھا۔ اس نے نثر کے ایک ایک دو صفحات لکھ کر کلکٹروں کو بھیج دیے اور انھوں نے پٹواریوں کی مدد سے ان کا مقامی بولی میں ترجمہ کرا دیا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر گریرسن نے فیصلہ کیا کہ کس علاقے کی کون سی بولی ہے اور کس زبان اور بولی کا کون سا علاقہ ہے۔ جہاں زبانوں یا بولیوں کے ڈانڈے ملتے ہیں وہاں کا تشفی بخش مطالعہ لسانیات میں تربیت یافتہ شخص ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے سے اب تک آبادی میں بہت کچھ نقلِ مکانی ہوا ہے جس کی وجہ سے گریرسن کا جائزہ موجودہ صورتِ حال کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا۔ اشد ضروری ہے کہ ماہرینِ لسانیات کی مدد سے ملک کا از سرِ نو لسانیاتی جائزہ لیا جائے۔ مردم شماری کے اندازے پر اس جائزے کے لیے دو ہزار والنیٹروں کی ضرورت ہوگی۔ وہ کہاں ہیں! ۱۹۵۵ء تک ہمارے ملک میں صرف دو درس گاہوں کلکتہ یونیورسٹی اور دکن کالج پونا میں لسانیات کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ لسانیات میں تربیت یافتہ والنیٹروں کی ضروری تعداد بہم پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پانچ ہفتے کا اسکول کیا جائے جس کی مدد سے پندرہ بیس سال میں لسانیات کی مبادیات جاننے والے کافی تعداد میں مل سکیں گے۔ موسم گرما کے یہ اسکول بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت کب لسانیاتی جائزے کا منصوبہ بناتی ہے۔ آج جو یہ بحث ہوتی ہے کہ پنجاب و ہریانہ یا میسور و مہاراشٹر کے سرحدی اضلاع کی زبان کیا ہے اگر ایک باقاعدہ سائنٹفک لسانیاتی جائزہ ہوا ہوتا تو ہر مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا۔ ہر سوال کا صحیح صحیح غیر جانب دارانہ جواب پہلے سے ہی موجود ہوتا۔ مغرب کے ممالک میں بولیوں کے مفصل اٹلس بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کو بھی زبانوں اور بولیوں کا اٹلس تیار کرنا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے لسانیاتی جائزے کے وقت اردو والے لسانیاتی والنیٹر قابلِ قدر تعداد میں مل سکیں تاکہ اردو کے حقوق محفوظ رہ سکیں۔ اردو بولنے والی آبادی کے لحاظ سے ایسے لسانیات داں رضاکار نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مختلف یونیورسٹیوں میں ایم اے اردو کے نصاب میں لسانیات کا پرچہ بھی ہوتا ہے، لیکن یہ اکثر محض انگلی میں لہو لگا کر شہید ہونے کے مترادف ہے۔ اردو کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشتِ الفاظ جیسے موضوعات کو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب تک تجزیاتی لسانیات نہ پڑھی جائے

زبان کی ساخت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ زبان کی بنیاد آوازیں ہیں۔ اس لیے صوتیات کے مطالعے کے بغیر لسانیات کا علم محض خام اور ناقص ہے۔ صوتیات ہی طلبہ کو سب سے زیادہ بوکھلا دینے والا مضمون ہے۔ الجبرے کی طرح عملی زندگی میں اس کی کوئی افادیت محسوس نہیں ہوتی لیکن ایسی بات نہیں۔ ذیل میں اردو کے مخصوص مسئلے سے قطع نظر عام طور سے لسانیات کے مطالعے کی اہمیت روشن کی جاتی ہے

قومیت نے بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے پچھلی دو صدیاں سامراجیت کے عروج کا زمانہ تھیں۔ حاکم قوم محکوم قوم کو ایک فروتر مخلوق سمجھتی تھی اٹھارویں صدی میں جب تاریخی و تقابلی لسانیات کو فروغ ہوا تب معلوم ہوا کہ قوموں کی تقسیم محض جغرافیائی ہے نسلِ انسانی کی تقسیم نہیں۔ اسی صدی کے آخر میں جب سر ولیم جونس نے کالی داس کی شکنتلا کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی ایک خاندان کی زبانیں ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ یورپ کے گورے اور ہندوستان کے کالے باشندے ایک ہی نسل کے ہیں۔ اس سے انگریزوں کے احساسِ برتری کو بڑا دھکا پہنچا لیکن اس سے وسعتِ نظر بھی پیدا ہوئی۔ قوموں کی طرح لسانیات بھی پوری بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں بانٹتی ہے لیکن لسانی بہت بڑے ہیں اور اکثر انھوں نے ملکی سرحدوں کو مسمار کر دیا ہے مثلاً آئرلینڈ سے بنگال تک ایک نسل ہے۔ انڈونیشیا اور دور افتادہ مدغاسکر کی زبان مماثل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اہلِ مدغاسکر چل کر انڈونیشیا تک پہنچے۔

رسم الخط کے اشتراک کا پھیلاؤ زبان کے پھیلاؤ سے بھی زیادہ ہے۔ تبتی رسم خط ہندوستان سے ماخوذ ہے۔ چین اور جاپان کے لوگ بہ ظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی زبانوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود دونوں کا رسم خط ایک ہے۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک بار ایک پبلک سروس کمیشن کے صدر نے میرے ساتھ نجی بات چیت میں اردو رسم الخط پر اعتراض کیا کہ اور سب لکھاوٹیں بائیں طرف سے دائیں طرف کو لکھی جاتی ہیں لیکن اردو خط اُلٹی گنگا بہاتا ہے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ اردو اور انگریزی خط ایک ہی نسل سے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اردو کا خط بھی سامی سے ماخوذ ہے اور یونانی رسم خط بھی۔ یونانی کے ابتدائی حروف تہجی الفا، بیٹا، گاما، ڈیلٹا، عبرانی ابجد کے الف، بیت، جمل اور دالتہ کی ترمیم شدہ شکلیں ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ بعض انگریزی حروف کی ترتیب آج بھی عربی ابجد سے مماثلت کا اعلان کر رہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

	K	L	M	N
کلمن یعنی	ک	ل	م	ن

Q R S T

قرشت یعنی ت ش ر ق

مختلف ملکوں کی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے تاریخ کے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ آریہ نسل کے باشندوں کا اصلی وطن کیا تھا یہ قدیم ترین ہند آریائی زبانوں کے بعض الفاظ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ قبل تاریخ دور میں آریہ کس طرح مختلف گروہوں میں مختلف مقامات پر آباد ہوئے۔ پھر وہاں سے ان کی کون کون سی شاخیں پھوٹیں یہ سب آریائی زبانوں کے باہمی تعلق اور ان کے شجرے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ یونانی سے لاطینی کا نکلنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آریہ پہلے یونان میں بسے اور وہاں سے ان کی ایک ٹکڑی اٹلی میں گئی۔ انگریزی کا جرمن خاندان سے ہونا اور فرانسیسی سے نسبتاً دور ہونا ظاہر کرتا ہے کہ انگریز قوم لاطینی گروہ سے پہلے جدا ہوئی اور جرمن سے اس کے بعد۔ یورپ کے خانہ بدوش قبائل کی ہندوستانی آمیز زبان اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں ہندوستان سے یورپ گئے۔ کشمیری زبان کی باقی ہند آریائی زبانوں سے علیحدگی صاف بتاتی ہے کہ کشمیر میں آریوں کا کوئی دوسرا گروہ آباد ہوا جو بقیہ ہند و پاک کے باشندوں سے الگ تھلگ اس برِ عظیم میں وارد ہوا۔

مغرب میں لسانیات کو ریاضی کے انداز پر ڈھالا جا رہا ہے۔ لسانی زمانیات Glotto Chronology لسانیات کا ایک نیا شعبہ ہے جس سے زبانوں کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ایک اندازہ ہے کہ ایک صدی میں زبان کے ذخیرے میں کتنے فی صدی الفاظ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ دو قرابت دار زبانوں میں الفاظ کے اختلاف کی مقدار دیکھ کر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ کب ایک دوسرے سے جدا ہوئیں۔ اس سے ایک لسانی برادری کے ذیلی گروہوں کے نقلِ مکانی کا زمانہ معلوم ہو سکتا ہے۔

زبان و ادب کا تعلق اتنا عیاں ہے کہ بیان کی ضرورت نہیں۔ زبان کا آغاز اور ارتقا لسانیات کا موضوع ہے جس پر نظر رکھے بغیر ادب کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ بعض ادیب اس میدان میں جس سراب میں کھو کر رہ جاتا ہے لسانیات اس سے نکال کر صراطِ مستقیم دکھاتی ہے۔ اردو ادب کے آغاز کے بارے میں ادیبوں نے نہ معلوم کیا کیا طوطا مینا اڑائے۔ جب ماہرینِ لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس موضوع کو لیا تب کوئی مدلل بات سامنے آئی۔ قدیم ادب کی فرہنگ کی تفہیم میں تو لسانیات سے مدد ملتی ہی ہے، بعض اوقات قدیم ادب کی رسمِ تحریر بھی ماہرینِ لسانیات کے طفیل ہی واضح ہوتی ہے۔

بعض اوقات ادبی مخطوطوں کا زمانہ متعین کرنے میں لسانیات سے مدد ملتی ہے۔ فارسی زبان کے عالم جانتے ہیں کہ نویں صدی کے آخر تک فارسی میں دال اور ذال دو الگ حروف نہ تھے بلکہ متبادل آوازیں تھیں جو حسب ضرورت بدلا کرتی تھیں۔ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں کیمیائے سعادت کا جو مخطوطہ ہے اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مصنف امام غزالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کا معائنہ کیا تو اس میں دال ذال کا وہ فرق نہ پایا جو قدیم کتابت میں ہونا چاہیے۔ اس کی بنا پر انھوں نے طے کیا کہ یہ مخطوطہ غلط طور پر ان سے منسوب ہے۔ اسی طرح فارسی خط کی کچھ اور خصوصیات ہیں، مثلاً ساتویں صدی ہجری تک کاف بیانیہ 'کہ' کو 'کی' لکھا جاتا تھا۔ بارھویں صدی ہجری تک گ کو ک ہی لکھا جاتا تھا۔ اردو میں پہلے پہل ٹ، ڈ، ڑ کے بالائی ط کے لیے چار نقطوں کا استعمال ہوتا تھا۔ جن مخطوطوں میں ان موقعوں پر ط لکھا ہوا ہو وہ زیادہ پرانے نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کسی مخطوطے میں ہائے مخلوط کا دو چشمی ھ سے لکھا ہونا اس کے نئے پن پر دلالت کرتا ہے۔ زبان اور کتابت کے ارتقا سے یہ واقفیت تحقیق میں بہت سی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ لسانیات کی ایک نئی شاخ ہے اسلوبیات۔ اس میں دریافت کیا جاتا ہے کہ کن آوازوں اور اجزائے الفاظ کی تکرار اور کمی بیشی سے اسلوب میں جان پڑتی ہے۔ یہ شعبہ ابھی عالم طفولیت میں ہے لیکن اس سے کسی شاعر یا انشا پرداز کا اسلوب محض ذوقی نہیں رہ جاتا بلکہ اس کے ہیتی تجزیے میں بعض اصولوں کی کارفرمائی دریافت کی جا سکتی ہے۔

الفاظ آوازوں کے مجموعے ہیں جنھیں رسم الخط کا لباس دے کر کاغذ پر ٹانک دیا جاتا ہے۔ کسی زبان کی آوازوں یعنی مصوتوں اور مصمتوں کو دریافت کرنا صوتیات کا کام ہے اس لیے صحیح رسم الخط صوتیات کی نگرانی ہی میں تیار ہو سکتا ہے۔ کسی زبان کے موجودہ رسم الخط میں جو خامیاں ہیں ان کی گرفت اور تدارک صوتیات ہی کر سکتی ہے۔ جو بزرگ جدید صوتیات سے بے بہرہ ہیں وہ جب اس موضوع پر کچھ لکھتے ہیں تو وہ ہوا میں لاٹھی چلانے کی مثال ہو جاتا ہے۔ جو معالج جسم انسانی کی ساخت اور تشریح اعضا سے واقف نہ ہو وہ کیا تشخیص مرض کرے گا اور کیا علاج تجویز کرے گا۔

صوتیات کا ایک اور مفید کام یہ ہے کہ جن زبانوں کے پاس اپنا رسم الخط نہیں ہے۔ ان کی آوازوں کا تجزیہ کرے اور اسے ایک رسم الخط دے۔ اگر اسے کسی دوسری زبان کا خط دیا جائے تو اس میں حسب ضرورت ترمیم و اضافہ کرے۔ قبائلی زبانوں میں تحریر کا رواج نہیں ہوتا۔ ماہرین صوتیات

لہ و ٹ تحقیق و تصحیح متن کے مسائل از ڈاکٹر نذیر احمد مشمولہ نقوش بابت مارچ ۱۹۶۳ء

ان زبانوں کو سیکھ کر اور آوازوں کی صحیح صحیح تفریق کر کے ان کے لیے رسم تحریر فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح ان زبانوں کا عوامی ادب قلم بند کر کے محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ کشمیری جیسی ترقی یافتہ اور ہم سے اتنے پاس کی زبان کے معاملے میں یہ کوئی بڑا کارنامہ معلوم نہ ہو لیکن جب دور دراز افریقہ کے قبائل کی اجنبی زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کی آوازوں کا تعین ہی بڑا مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات اس سے دوچار ہیں جو زبانیں ابھی تک تقریری منزل میں ہیں صوتیات انھیں تو رسم الخط میں ڈھالتی ہی ہے ان کے علاوہ اگر کبھی کبھار ترقی یافتہ زبانوں کے اقتباسات یا الفاظ کو دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھنا پڑتا ہے تو صوتیات ہی اس کی مخصوص آوازوں کی ادائیگی کی ضمانت کرتی ہے۔ پنجابی کا مخصوص رسم الخط گورمکھی ہے جو اس کی آوازوں کا احاطہ کرتا ہے لیکن پنجابی کو اگر اردو یا ہندی خط میں لکھنا ہو تو اول الذکر کی چند مخصوص آوازوں کے لیے صوتیات کی مدد سے نشانات وضع کرنے ہوں گے۔ اس قسم کا عمل ہر زمانے میں ہوا ہے۔ فارسی نے جب عربی رسم الخط اختیار کیا تو اپنی مخصوص آوازوں پ ۔ چ ۔ گ ۔ ژ کے لیے مماثل عربی حروف میں نقطوں یا مرکز کے اضافہ سے کام چلا یا۔ اردو نے فارسی رسم الخط لیا تو ٹ ڈ ۔ ڑ اور ہائے مخلوط والی آوازوں کے لیے نشانات وضع کیے۔ یہ اختراع خواہ کسی نے کی ہو لیکن یہ صوتیات کا عمل تھا اور ان کا مخترع اس حد تک ماہرِ صوتیات تھا۔ آج بھی یہ عمل جاری ہے۔ ہندی میں انگریزی کے اُس مصوتے کے لیے جو آ اور اُو کے درمیان ہے ایک مخصوص ماترا ایجاد کی گئی ہے اور وہ آ کی ماترا کے اوپر ایک اُلٹے قوس کا اضافہ ہے۔ اس نازک مصوتے کی گرفت اور ترجمانی ماہرینِ صوتیات ہی نے کی ہے۔

موجودہ رسوم الخط اپنی زبان کی آوازوں کو بھی سو فی صدی ادا نہیں کر پاتے چہ جائیکہ دوسری زبانوں کی آوازوں کو۔ صحت کے اعلیٰ معیار کو پیشِ نظر رکھ کر بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط ایجاد کیا گیا جس میں حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ سے ہر زبان صحیح صحیح تلفظ کے مطابق ضبطِ تحریر میں لائی جا سکتی ہے۔

عروض اور صوتیات کا تعلق ظاہر ہے۔ شعر کا وزن کیا ہے لغرِ یزے کے طول یا بل کی گوناگوں ترتیبیں۔ انگریزی عروض بل پر مبنی ہے۔ اردو اور ہندی عروض صوت یا لغرِ یزے کے طول پر لیکن لسانی حس یہ بتاتی ہے کہ اردو عروض بھی گاہے گاہے لفظ کے بل سے متاثر ہوتا ہے۔ میں نے اس مجموعے کے ایک مضمون "اردو عروض اور لفظ کا بل" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اردو عروض کی اصلاح اور تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ہندی اور انگریزی عروض سے بھی فائدہ اٹھانا ہوگا۔

اور مروجہ عروض کو صوتیات کی اصطلاحوں میں ڈھال کر زیادہ سہل اور زیادہ سائنٹفک بنانا ہوگا۔ عروض صوتیات کے سوا کیا ہے۔ اس کی تراش و خراش صوتیات کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک سیاح یا مبلغ افریقہ، آسٹریلیا یا جنوبی امریکہ کے ایسے قبائلیوں کے بیچ پہنچتا ہے جہاں اب تک کوئی باہری آدمی نہیں گیا۔ وہ ان قبائلیوں کی زبان نہیں جانتا اور یہ قبائلی اس کی زبان نہیں جانتے۔ یہ لسانیات ہی کا کرشمہ ہے کہ ان انجان قبائلیوں کی زبان کو سمجھا اور سیکھا جا سکتا ہے اور سیکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مسیحی مشنریوں کی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ قبائلیوں کی تہذیب کو باقی دنیا سے متعارف کرانا انھیں ماہرینِ لسانیات کا کام ہے جن کے لیے زبان سیکھنا ثانوی مقصد تھا۔ امریکہ میں تجزیاتی لسانیات کے فروغ کی یہی وجہ ہے کہ اس کے ذریعے ان قبائل تک رسائی ہو سکی ہے جو دوسروں کے لیے ایک بند کتاب ہیں۔ اصل مقصد ان کو عیسائی بنانا یا سیاسی طور پر اپنا ہم خیال اور پیرو بنانا ہے۔ یہ مبلغ قبائلیوں کی زبانوں کو اس حد تک سیکھ لیتے ہیں کہ اہلِ زبان کی طرح بول سکتے ہیں۔

امریکہ کی فوج کے تینوں بازو، بحری، بری اور ہوائی، صوتیات کا شعبہ بھی رکھتے ہیں۔ ان شعبوں میں صوتیات کی مسلسل تحقیق ہوتی رہتی ہے۔ مغربی ممالک نے جس طرح سائنس دانوں کو ایٹم بم، کیمیائی اور جراثیمی آلاتِ حرب کی تحقیق کے لیے حلقہ بگوش کر لیا اسی طرح لسانیات کو بھی فوجی ضروریات میں ملوث کر لیا۔ فوج میں شعبۂ لسانیات کے قیام کی واحد وجہ جاسوسی کے فن کی تکمیل ہے۔ دنیا کا ہر ملک اپنے سفیروں اور فوجیوں کو پیغام بھیجنے کے لیے ایک کوڈ استعمال کرتا ہے جو تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد بدلتا رہتا ہے۔ فوج کے شعبۂ صوتیات کے دو کام ہیں:

۱۔ روز روز اپنی حکومت کے لیے ایسا کوڈ تیار کرنا جو دوسروں کے لیے لاینحل ہو

۲۔ دوسری حکومتوں کے کوڈ کو فاش کر کے ان کے خفیہ پیغام جان لینا

امریکہ میں مجلس اقوام کا بھی دفتر ہے جہاں ہر حکومت کے نمائندے رہتے ہیں اور اپنی حکومتوں سے مراسلت کرتے ہیں۔ گویا جاسوسی کے مواقع سرزمین امریکہ پر کچھ بہتر میسر ہیں۔ امریکی حکومت ان نمائندوں کے خفیہ پیغام جاننے کے لیے ان کی کوڈ توڑ لیتی ہے۔ اس معاملے میں دوست دشمن کی کوئی تمیز نہیں، ہر ملک کا کوڈ دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوڈ کو فاش کرنے کے طریقے بالکل وہی ہیں جن سے ماضی کی مردہ زبانوں کے مجہول رسم الخط پڑھے گئے۔

امریکہ میں لسانیات کو بالکل سائنس اور ریاضی بنا یا جا رہا ہے۔ لسانیات کی ایک قسم ہے کمپیوٹری لسانیات Computer Linguistics اس کی مدد سے مختلف زبانوں کے ترجمہ

کرنے کی مشین بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مماثل زبانوں مثلاً مغربی یورپ کی زبانوں میں ایک دوسرے سے مشینی ترجمہ ممکنات میں سے ہے اور لسانیات یہ کر کے دکھائے گی۔ اس کے علاوہ مشینوں کے ذریعے سے دنیا کی تمام زبانوں کے بیچ ایک قدرِ مشترک کی کھوج جاری ہے۔ اس کی تشکیل ہو جائے تو کسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ مشکل نہ رہے گا۔

اسکولوں میں زبانوں کی جو قواعد پڑھائی جاتی ہے اس میں مختلف اصولوں کے تحت مستثنیات کی فہرست بھی ہوتی ہے جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ یہ اصول جامع نہیں۔ زبانوں کا مروجہ صرف و نحو بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ لسانیات کا دعویٰ ہے کہ اس کے اصولوں کے تحت کسی زبان کا صرف و نحو لکھا جائے تو وہ جامع بھی ہوگا اور سہل بھی۔ میں نے اس قسم کی کوئی قواعد نہیں دیکھی۔ ترقی یافتہ زبانوں کی ایسی قواعد نہیں لکھی گئی لیکن قبائلی زبانوں میں سے بعض کی لکھی گئی ہے۔

سنسکرت میں اسم کی آٹھ حالتیں Cases ہوتی ہیں جن کی تقلید میں ہندی کے قواعد نویس بھی آٹھ حالتیں لکھتے ہیں۔ لسانیات نے انھیں مختصر کر کے محض تین حالتوں سے کام چلا لیا ہے Direct, Obligue, Vocative چند سطروں کے ایک چارٹ میں زبان کے ہر قسم کے اسما (مذکر، مونث۔ واحد، جمع) کی حالتوں کا احاطہ کر لیا جاتا ہے۔ اردو کے افعال کے مختلف زمانوں اور ان کی گردان کے قواعد بھی بڑے پیچیدہ ہیں۔ لیکن ماہرینِ لسانیات نے ان سب کو ایک چارٹ میں محصور کر دیا اور اس میں تمام فعلی تبدیلیاں واضح کر دیں۔

معنی کی حامل سب سے چھوٹی اکائی مارفیم کی دریافت سے لفظوں کی ساخت اور تبدیلی کا بیان بڑا آسان اور سائنٹفک ہو گیا ہے۔ ہماری قواعد میں مصدر کو بنیادی مادّہ مان کر اس میں تبدیلیوں کا ذکر کیا جاتا تھا۔ لسانیات نے مصدر میں سے علامتِ مصدر 'نا' حذف کر کے مادہ کا تعین کیا اور اس میں مختلف اضافوں کو صوتیات کی اصطلاحوں میں ادا کیا۔

دراصل ہماری مروجہ اسکولی قواعد اہل زبان ہی کے پڑھنے کے لیے ہے۔ دوسری زبان والوں کو اس قواعد کے ذریعے زبان سکھانا بڑا بارِدہ ہے۔ جو حضرات امریکیوں اور روسیوں وغیرہ کو اردو پڑھاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صوتیات اور لسانیات کے صرف و نحو کے بغیر قدم آگے بڑھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان طلبہ کو اس کی تاب نہیں کہ دو سال تک قواعد پڑھی جائے اور تب زبان سیکھی جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تین مہینے میں ہی وہ کچھ شُد بُد بول سکیں۔ مغربی ممالک میں ماہرینِ لسانیات نے ایسے طریقے نکالے ہیں جن سے کسی زبان کو تھوڑے عرصے میں سیکھا جا سکتا ہے۔ آج کے مصروف آدمی کے

پاس اتنی فرصت کہاں کہ کئی برس زبان سیکھنے ہی کی نذر کر دیے جائیں ۔

مولیر کا ایک کردار چالیس سال تک نثر میں باتیں کرتا رہا ۔ جب اسے نثر کی تعریف بتائی گئی تو حیران ہوا کہ جس چیز کو چالیس سال سے استعمال کر رہا ہے اس سے واقفیت بھی نہ تھی ۔ ہم سب بھی زبان کو ایک عمر سے استعمال کر رہے ہیں ۔ ہم تو مولیر کے کردار کے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم زبان کے بارے میں نہ صرف جانیں بلکہ اس کے دروں کے عارف بھی ہو جائیں ۔ زبان کے اس عرفان کے عمل کو لسانیات کہتے ہیں اور اس کے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے ۔

زبان اور علم زبان

انسان مدنی الطبع حیوان ہے۔ ماہرین علم الانسان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ بنی نوع انسان کی طفولیت میں بھی کوئی ایسا معاشرہ نہیں ہوا جس میں انسان خاندان کے بغیر تنہا زندگی گذارتا ہو۔ اگر متاہلانہ زندگی انسان کی گھٹی میں پڑی ہے تو یہ بآسانی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انسان ابتدا ہی سے ترسیل وابلاغ کا عادی ہوگا کیونکہ ترسیلِ خیالات ہی سے سماج کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ خیالات کی ترسیل اور جذبات کے اظہار کے لیے انسان نے زبان کی ایجاد کی۔ ترسیل نطق ہی کے ذریعے سے نہیں ہوتی یہ اشاروں سے بھی ممکن ہے۔ اشاروں کا استعمال ازلی اور آفاقی ہے۔ اتنا مہذب ہو جانے کے بعد بھی انسان اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اشاروں سے بے نیاز نہیں۔ دونوں ہاتھوں کو لوک بناکر منہ سے لگانا پانی مانگنے کا اشارہ ہے۔ سر کی جنبش سے ہم "ہاں" یا "نہیں" کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح زبان کے کم از کم دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔

۱۔ شعوری آوازیں جن کے ذریعے سے انسان اپنے خیالات وجذبات کا اظہار کرتا ہے۔

۲۔ اشاروں کی زبان۔ مخصوص معنی میں اشارے بھی زبان کے زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں اشارے تین قسم کے ہوتے ہیں:

الف ۔ اشاروں کی سب سے بڑی تعداد وہ ہے جن میں آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، مثلاً ہاتھ یا سر کی جنبش ۔ اسکاؤٹوں کی جھنڈیوں کے ذریعے گفتگو۔

ب ۔ جنہیں کان سے سُنا جاتا ہے۔ وقت کی تعین کے لیے گھڑیال بجانا یا دوڑ کا آغاز کرنے کے لیے پستول چھوڑنا۔ چٹکی بجانا۔ کسی کو بلانے کے لیے سیٹی بجانا۔

ج ۔ سب سے محدود وہ اشارے ہیں جن میں لمس سے کام لیا جاتا ہے۔ حسرت کہتے ہیں:

> بزمِ اغیار میں ہرچند وہ بیگانہ رہے
> ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

یہ ہاتھ دبانا اندھیرے میں بھی کارگر ہوتا ہے۔

اشارے کو الفاظ کی نسبت یہ فوقیت ہے کہ ایک ہی جنبش پورے کلام کو ظاہر کر سکتی ہے مثلاً کسی

کو بلانے کا اشارہ۔ اس کے علاوہ اشارہ مدعا کو مجسم اور متشکل کر کے پیش کرتا ہے لیکن ان کے باوجود اشارے صوتی زبان کے مقابلے میں بالکل بے دست و پا ہیں۔ ان کی دنیا بہت محدود ہے۔ یہ روزانہ زندگی کے چند خیالات و جذبات تو ادا کر سکتے ہیں لیکن بیشتر تصورات و تجربات ان کی گرفت سے باہر ہیں۔ مثلاً ذیل کے سیدھے سادے مطالب کو اشارے میں کہنا ممکن نہیں

'میں کل جاؤں گا'

'سچ بولنا چاہیئے'

'تمہارا کیا نام ہے'

4- Code رمز یا علامت ایک خیال یا تجربے کے اظہار کا کوئی بھی روپ دراصل ایک قسم کا رمز یا علامت ہے۔ ہم اس رمز کو آنکھ یا کان سے محسوس کرتے ہیں اور دفعتاً ہمارا ذہن اس تصور کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ان علامات کو استعمال کرنے والے دونوں فریقوں کے ذہن ان سے یکساں مفہوم مراد لیتے ہوں۔ علامات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک میں خیال اور خارجی علامت میں کوئی مشابہت ہوتی ہے مثلاً کسی کو بلانے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کرنا یا شاہی سواری کی تصویر۔ دوسری نوع میں اظہار کا روپ خیال سے بالذات کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ من مانے طور پر کوئی بھی علامت کسی بھی خیال کے لیے متفقہ طور پر متعین کر لی جاتی ہے مثلاً اسکول میں ایک مخصوص قسم سے گھنٹی بجانے کے معنی چھٹی ہو جانا۔ کسی کے گھر کے باہر سیٹی بجانے کے معنی اسے باہر بلانا کسی سے ملنے پر ہاتھ کو ماتھے کی طرف لے جانا یا دونوں ہاتھوں کو جوڑنا یعنی اظہارِ تعظیم۔ الفاظ اسی قسم کی رمزیت ہیں صوتی علامت اور اس سے مراد لیے جانے والے تصور میں کوئی فطری رشتہ نہیں ہوتا مثلاً آگ کہتے ہیں جو آواز ہوتی ہے اس میں سوزش یا حرارت نہیں ہوتی اس کے تلفظ سے ہونٹ نہیں جل جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صوتی علامت 'مارے' اردو میں 'ضرب' فارسی میں 'سانپ' اور انگریزی میں 'بگاڑنا' مراد لیتے ہیں۔ پیڑ کو ہندی میں پیڑ اور فارسی میں درخت کہتے ہیں۔ اس طرح "زبان ارادۃً" پیدا کی گئی من مانی صوتی علامات کا ایک آئین مقررہ — System of Arbitrary Vocal Symbols — ہے جس کے ذریعے ایک انسانی گروہ کے افراد اپنے خیالات اور جذبات دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ انسان درد میں چیختا اور خوشی میں ہنستا ہے لیکن یہ اضطراری آوازیں زبان کا جز و نہیں۔ صرف ارادی آوازیں ہی زبان کہلاتی ہیں۔

زبان کا استعمال محض صوتی علامات ہی کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے۔ ان صوتی علامات کو دوسرے طریقوں میں بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ کوڈ دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ اصل اور ثانوی۔ تقریری

زبان اصلی کوڈ ہے۔ ثانوی کوڈ کسی اصلی کوڈ کی ترسیل و ترجمانی کرتی ہے۔ تحریر ایک ثانوی کوڈ ہے۔ یہ صوتی علامات کو کاغذ یا کسی دوسری سطح پر ساکت کر کے قائم کر دیتی ہے۔ شارٹ ہینڈ۔ تار دینے کی مورس کوڈ بھی اسی قسم کی ثانوی کوڈ ہیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ آدمی تنہائی میں بھی تو بڑبڑا سکتا ہے۔ مسلمانے کی تنہائی میں بھی تو گا سکتا ہے۔ پھر ترسیل کی قید کیوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس غیر معمولی صورت میں ایک فرد خود کو دو شخصیتوں میں تقسیم کر لیتا ہے۔ قائل اور سامع اس سے بھی زیادہ پیچیدہ معاملہ ذہن میں سوچنے کا ہے۔ سوچنے میں بھی تو زبان کا استعمال ہوتا ہے وہاں نہ صوتی علامات ہیں نہ ترسیل ہے۔ ابھی تک ہم نے زبان کی دو شکلیں دیکھی تھیں۔ تقریری اور تحریری۔ تحریر صوتی الفاظ کی ثانوی علامت ہے سوچنا خیالات کے صوتی اظہار سے بھی پہلے کی منزل ہے۔ ہم ذہن میں خیالات کو صوتی علامات کے مقررہ آئین یعنی زبان میں ڈھال لیتے ہیں لیکن ہنوز ان کا خارجی اظہار نہیں کرتے۔ خیالات کی تشکیل ہم انہیں سانچوں میں کرتے ہیں جن سے سماج مراسلت کا کام لیتا رہا ہے۔ سوچنا صوتی علامات سے بے نیاز نہیں ان کا تابع ہے۔ ذہن میں غور و خوض کے بعد خیال صوتی اظہار و ابلاغ کے لیے بالکل پکا پکایا تیار ہوتا ہے۔ علم نفسیات ہمیں بتاتا ہے کہ سوچتے وقت سماعت والی رگیں Nerves ہمیشہ بر سر کار رہتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ نطق کی رگیں بھی ایک حد تک جنبش میں آتی ہیں لیکن پورے طور پر نہیں۔ چنانچہ اس نفسیاتی تجربے سے آپ بھی دو چار ہوئے ہوں گے کہ دیر تک فکر انگیز تحریر کے مطالعے یا دقیق غور و فکر کے بعد گلے میں تھکن کا احساس ہوتا ہے۔

زبان کے باقاعدہ مطالعے کو لسانیات یا علم زبان کہتے ہیں علم زبان ایک طویل نام ہے اس پر لسانیات کو ترجیح دینا چاہیے۔

زبان کا مطالعہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے (۱) زمانے کے ایک مخصوص نقطے میں۔ اور یہ نقطہ زمانۂ حال ہی کا ہوتا ہے (۲) تاریخ کی رو میں عہد بہ عہد ارتقا کو پیش نظر رکھ کر۔ ایک زبان کا، ایک مخصوص منزل میں مطالعہ تجزیاتی لسانیات کہلاتا ہے۔ اسے توضیحی لسانیات بھی کہا جاتا ہے۔ زبان کا ایک ڈھانچہ ہوتا ہے، یہ ڈھانچہ کیا ہے، زبان کے مختلف اجزائے ترکیبی اور ان کے باہمی تعلقات کا مطالعہ۔ زبان کا ایک وقت میں مطالعہ کیا جائے تو اس کی ساخت اور ڈھانچے ہی کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور یہی بنیادی چیز ہے۔ زبان کے تاریخی ارتقاء کا مطالعہ تاریخی لسانیات کہلاتا ہے۔ اگر ایک خاندان کی دو زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو اسے تقابلی لسانیات Comparative Philology،

کہتے ہیں۔ اگر دو مختلف خاندانوں کی زبانوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو اسے لسانی نوعیات Typology کہتے ہیں کیونکہ اس میں دو مختلف اقسام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی میں ڈارون نے انسان اور دوسرے حیوانات کے باہمی رشتے اور نسلوں کا تعین کیا۔ اسی طریقے پر زبانوں کے نسلی رشتے اور گزشتہ تاریخ کا بھی مطالعہ کیا گیا۔ تاریخی اور تقابلی لسانیات میں اصولی حیثیت سے فرق ممکن ہے لیکن واقعتاً یہ ایک ہی علم ہے۔ کسی زبان کی اصل جاننے کے لیے پیچھے کی طرف لوٹ کر منزل بہ منزل اس کی کھوج لگائی جاتی ہے۔ جہاں تک اس کی تحریریں اور کتبے ملتے ہیں تاریخی طریقہ ساتھ دیتا ہے۔ اس سے پہلے کی شکلوں کی دریافت اور بازتشکیل اس نسل کی دوسری زبانوں کے تقابلی مطالعے سے ہی ممکن ہے۔ ابتداً اس علم کو تقابلی قواعد اور بعد میں تقابلی لسانیات کہا گیا۔ تقریباً ۱۹۲۵ء میں پراگ اسکول کی بنا کے ساتھ تجزیاتی لسانیات کا دور دورہ شروع ہوتا ہے Phil-ology میں ادب کا مطالعہ بھی شریک ہو جاتا تھا اس لیے اس کی بجائے Linguistics کی اصطلاح رائج کی گئی۔

مناسب یہ دکھائی دیتا ہے کہ پہلے کسی زبان کی ساخت کا مطالعہ کیا جائے بعد میں اس کے تاریخی ارتقا کا لیکن سوءِ اتفاق سے ہوا اس کے برعکس۔ تاریخی لسانیات اور تجزیاتی لسانیات میں ایک رقیبانہ لاگ ڈانٹ، ایک حریفانہ چشمک پائی جاتی ہے۔ ان دونوں کا جھگڑا قدیم و جدید، بوڑھے اور جوان کا جھگڑا ہے۔ تاریخی لسانیات کے وکیل تجزیاتی لسانیات کو ایک عملی مطالعہ کہہ کر سائنس کے زمرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ سائنس تو اصول کی دریافت کا نام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان کی ساخت کا مطالعہ قواعد والوں کا کام ہے لسانیات کو اس سے کیا مطلب۔ تجزیاتی لسانیات کے جانب دار تاریخی علما پر معترض ہیں کہ وہ زبان کی ساخت فطرت اور سرشت ہی سے واقف نہیں۔ وہ ماہر لسانیات کیونکر ہوئے۔ ایک معنی میں تجزیاتی لسانیات ہی زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ زبان کے ڈھانچے کو منکشف کرتی ہے۔ تاریخی لسانیات تبدیلی اور ارتقاء کا مطالعہ کرتی ہے آج کل دنیا کے تمام بڑے بڑے ماہرینِ زبان تجزیاتی لسانیات ہی سے سروکار رکھتے ہیں۔ تجزیاتی لسانیات کو تاریخ سے یہاں تک چڑ ہے کہ اس کے دائرے میں زبان کی گذشتہ تاریخ قطعاً غیر متعلق اور غیر اہم ہے۔ کسی لفظ یا آواز کے ماضی میں کیا روپ تھے، تجزیاتی لسانیات کو اس کے سننے کی تاب نہیں۔

تقابلی لسانیات اور لسانی نوعیات میں بھی اسی طرح کی لاگ ڈانٹ ہے۔ تقابلی لسانیات میں تاریخی پہلو پیشِ نظر رکھا گیا۔ نوعیات میں تاریخی مطالعے کا سوال ہی نہیں کیونکہ یہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ زیرِ بحث دو زبانوں مثلاً ہندی اور چینی میں کوئی نسبی تعلق نہیں۔ اس لیے ان کے ڈھانچے اور قواعد

وغیرہ ہی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ نومیات کے حامی ایلن W.S. Allen نے طنز کیا کہ وہی علم و فن سائنٹفک کہا جا سکتا ہے جس میں عمومی اطلاق کی صلاحیت ہو۔ تقابلی لسانیات محض ایک ہی خاندان کی زبانوں کا مطالعہ کر سکتی ہے اس لیے وہ سائنس نہیں اس کے برعکس نومیات دنیا بھر کی زبانوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ فریقِ ثانی نومیات کے وکیلوں پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ تم مقابلہ کس چیز کا کرتے ہو، جب دو زبانیں اپنی ساخت اور جبلّت میں بالکل مختلف ہیں تو ان کا ایک ہی سطح پر تجزیہ نہیں ہو سکتا۔

تجزیاتی لسانیات نے زبان کے مختلف اجزا کے مطالعے کے لیے ذیل کی شاخیں قرار دی ہیں۔

۱۔ صوتیات Phonetics اس میں اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ شاخ کسی ایک زبان تک محدود نہیں اس میں تمام زبانوں کا مجموعی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یوں کسی ایک زبان یا ایک بولی کی صوتیات پر بھی بحث کی جاتی ہے۔

۲۔ تجصوتیات Phonemics اس میں کسی ایک زبان کے صوتیوں Phonemics کا تعین کیا جاتا ہے۔ صوتیات میں آوازوں کی زیادہ سے زیادہ نزاکتیں دریافت کی جاتی ہیں لیکن تجصوتیات میں غیر ضروری نزاکتوں کو نظر انداز کر کے صرف انھیں اختلافات کا جائزہ لیا جاتا ہے جو معنی کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس طرح اصوات کی متعدد ذریات کی گروہ بندی کر کے انہیں کم از کم صوتیوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ اس شاخ کو Phonology بھی کہتے ہیں۔

۳۔ صرف Morphology : اس میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً ایک مادّہ میں سابقے اور لاحقے لگا کر نئے الفاظ کا اشتقاق کیونکر ہوتا ہے۔

۴۔ نحو Syntex ، اس کا موضوع کلام یعنی جملہ اور فقرہ ہے۔ صرف و نحو کو ملا کر زبان کی قواعد کو کہا جاتا ہے۔

۵۔ معنیات Semantics ، اس میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

تجزیاتی لسانیات پہلی چار شاخوں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ ان میں تجصوتیات اور صرف و نحو کو مرکزی شاخیں قرار دیا جاتا ہے اور صوتیات اور معنیات کو نواحی۔ صوتیات میں چونکہ ان

موشگافیوں سے بحث کی جاتی ہے جو روزانہ ضروریات کے مصرف کی نہیں اس لیے اسے غیراہم قرار دیا گیا ہے۔ معنیات کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ یہ لسانیات کی شاخ نہیں اس کا مطالعہ لغت یا ادب میں کیا جانا چاہیے۔ تجزیاتی لسانیات کے علماء کا ایمان ہے کہ لسانیات کو زبان کی محض ہئیت سے سروکار ہے معنی سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معنیات کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہے۔

راقم السطور کی رائے میں دونوں دعوے انتہاپسندانہ ہیں۔ تجھوتیات صوتیات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ صوتیات کا بالاستیعاب اور مفصل مطالعہ ہی تجھوتیات کا سنگ بنیاد ہے۔ جدید لسانیات صوتیات کے مطالعہ پر زیادہ سے زیادہ وقت اور زیادہ سے زیادہ زور دیتی ہے اور اس کے بعد بھی اسے ضمنی مطالعہ کہنے کی جرأت کرتی ہے حالانکہ صوتیات ہی اصل لسانیات ہے۔ اب تو تاریخی و تقابلی مطالعہ بھی صوتیات کا محتاج ہے۔

تجزیاتی لسانیات کا دعویٰ کہ وہ معنی سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ایک قسم کی خود فریبی یا ڈھونگ ہے۔ یہ دعویٰ صوتیات کی حد تک تو صحیح ہے۔ لیکن تجھوتیات کو ابتدا ہی سے معنی پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ صوتیے کی تبدیلی معنی کو بدلنے پر قادر ہے۔ صرف و نحو میں کلام و کلمہ کے بامعنی اجزا ہی سے بحث کی جاتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تجزیاتی لسانیات کو زبان کے بامعنی اجزا ہی سے سروکار رکھتی ہے لیکن اس کا جائزہ ان کے وصل و فصل، ترکیب و ترتیب یعنی ہیئت ہی تک محدود رہتا ہے۔

تصریف کے عمل میں بعض اجزا کے صوتیوں میں تبدیلی ہو جاتی ہے مثلاً 'خرید' اور 'دار' کو ملانے پر ایک "د" حذف ہو کر مرکب خریدار بنتا ہے۔ ہندی الفاظ بھجن اور اپدیشک کو ملا کر بھجنوپدیشک بنتا ہے۔ یہ بحث صوتیے اور صرف دونوں پر نگاہ رکھتی ہے۔ تجھوتیات اور صرف کی اس کڑی کو Morphophonemics کہتے ہیں۔ اسے صرف ہی کے تحت شامل کیا جا سکتا ہے اور صرف و نحو کی طرح یہ بھی قواعد کا جزو ہے۔

تجزیاتی لسانیات نے لسانیاتی مطالعہ کے مندرجہ بالا شعبے فراہم کیے۔ تاریخی لسانیات کے تحت کسی زبان کے سابق ارتقاء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تقابلی لسانیات زبانوں کی خاندانی گروہ بندی کرتی ہے اور لسانی نوعیات زبانوں کی نحوی گروہ بندی۔ رسم الخط کا مطالعہ لسانیات کا جزو نہیں کیونکہ لسانیات کا موضوع زبان کی تقریری شکل ہے تحریری نہیں۔ پھر بھی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے لسانیات کے رسم الخط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

حال میں لسانیات کے مطالعے کے نت نئے شعبے ہوتے جا رہے ہیں جو ابھی عالم طفولیت

ہی میں ہیں جنہیں مندرجہ بالا پانچ شعبوں کی طرح تسلیم عام نہیں ملا۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ جائزے کے طریقے (Field Methods) اس کی ذیل میں کسی ایسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہنوز تحریر نہیں کی گئی اس شعبے کا کام ان اصولوں کو مرتب کرنا ہے جن کی مدد سے زبان سے صحیح نمونے اکٹھے کیے جا سکیں۔ اس شعبہ پر امریکہ میں کام ہوا ہے۔ یورپ کے ماہرین اسے علیحدہ شاخ نہیں مانتے وہ کہتے ہیں کہ زبان کے نمونے اکٹھا کرنا لسانیات کا جز و نہیں۔ کام کرنے والا جس طرح جی چاہے مسالہ جمع کرے۔ لسانیات اس فراہم شدہ مسالے کا تجزیہ کرے گی۔

۲۔ اسلوبیات (Stylistics) موخرالذکر کو یورپ کے ماہرین لسانیات کی شاخ مانتے ہیں لیکن اکثر امریکی علماء اسے لسانیات کے حصار میں شامل نہیں کرتے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ عبارت کو جذباتی اور شاعرانہ بنانے کے لیے کیا کیا طریقے اپنائے جاتے ہیں۔

۳۔ تدوین اللغات (Lexicography)

۴۔ علم الاشتقاق (Ltymology)

۵۔ بولیوں کا جغرافیہ (Dialect Geography)

۶۔ لسانی قدیمیات (Linguistic Palaentology)

۷۔ اطلاع کا ریاضیاتی نظریہ (Mathematical Theory of Information)

لسانیات کے بارے میں اس قدر جان لینے کے بعد ہم غور کر سکتے ہیں کہ یہ سائنس ہے یا آرٹ۔ اس کا مقام کچھ بین بین ہے۔ یہ طبیعی سائنس کے زمرے میں نہیں آ سکتی کیونکہ اس کے اصول گو بڑی حد تک صحیح ہیں لیکن فزکس، کیمسٹری کی طرح ان میں قطعیت نہیں۔ لسانیات میں انسانی عنصر میکانکی صحت اور قطعیت کا متحمل نہیں۔ دوسری طرف اسے آرٹ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ آرٹ افراد کی تخلیق ہوتا ہے۔ وہ جمالیات کی طرف بھی گوشۂ چشم رکھتا ہے۔ زبان افراد کی شعوری تخلیق نہیں۔ معاشیات و سیاسیات کی طرح یہ محض سماجی سائنس بھی نہیں کیونکہ صوتیات کے اصول بڑی حد تک صحیح ہیں۔ اس شاخ کا باقاعدہ مطالعہ لیبارٹری ہی میں ممکن ہے۔ صوتیات اور تجصوتیات علوم طبعی کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں ایک لفظ کو ادا کرنے کے لیے ہم اوّل ذہن میں خیال کی تشکیل کرتے ہیں پھر اسے اعضائے نطق و سماعت کے ذریعے صوتی روپ دیتے ہیں۔ اس طرح لسانیات کے دو عناصر نفسیاتی اور میکانکی ہیں۔

جو اسے سماجی سائنس اور طبعی سائنس کے درمیان کشاکش میں رکھتے ہیں ۔ واضح ہو کہ ہمارے ملک میں سماجی سائنسوں کو آرٹ کی ذیل میں رکھا جاتا ہے ۔

لسانیات کا دوسرے علوم وفنون سے تعلق

لسانیات کا سب سے نزدیکی رشتہ مروجہ قواعد سے ہے لیکن دونوں یکساں نہیں ۔ سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ لسانیات کا دائرہ بہت وسیع ہے ۔ صرف ونحو اس کے محض دو شعبے ہیں ۔ ان شعبوں میں اور مروجہ قواعد میں بھی فرق ہے ۔ قواعد کسی ایک زبان سے متعلق ہوتی ہے لیکن لسانی صرف ونحو کے اصول عام طور سے زبانوں پر چسپاں کیے جا سکتے ہیں ۔ مروجہ قواعد زبان کے فصیح روپ کا مطالعہ کرتی ہے ۔ لسانیات میں نہ کوئی روپ فصیح ہے نہ غیر فصیح ۔ یہ محض مطالعے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ بعض اوقات بعض مستثنیٰ اصیغوں کی قدیم تاریخ معلوم کر کے ان کے بارے میں اصول قائم کرتی ہے ۔ لسانیات میں استثنیٰ کا ذکر نہیں ہوتا ۔ اس کو بھی اصولوں کے تحت لے لیا جاتا ہے ۔

ادب سے لسانیات کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ شرح کرنے کی ضرورت نہیں لسانیات ، سے قدیم دب کو اور دوسری زبانوں سے مستعار لفظوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے ۔ لسانیات کے لیے ادب مسالہ فراہم کرتا ہے ۔ زبان کا تاریخی مطالعہ عہد بہ عہد ادبی نمونوں ہی کے بل پر ہو سکتا ہے ۔

تاریخی لسانیات تاریخ سے فائدہ اٹھاتی ہے ۔ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت ۔ تجارتی تعلقات وغیرہ فریقین کی زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ کبھی کبھی لسانیات بھی تاریخ کو شمع دکھاتی ہے ۔ یورپ اور ویلس کی جپسیوں کی زبان میں ہندوستانی الفاظ کی افراط اس کی شاہد ہے کہ یہ لوگ عہد قدیم میں ہندوستان سے چل کر مغرب میں بود و باش کرنے لگے ۔

آثار قدیمہ قدیم زبانوں کے نمونے محفوظ رکھتی ہے اور ماہر لسانیات ان قدیم کتبوں اور تحریروں کو پڑھ کر آثار قدیمہ کی گتھیاں کھولتا ہے ۔ لسانی قدیمیات اور بشریات Anthrology بھی ایک دوسرے کے لیے مدد معاون ہیں ۔

عمرانیات اور لسانیات بھی ایک دوسرے سے متعلق ہیں ۔ زبان ایک سماجی فعل ہے ۔ عمرانیات ہی سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ مرور ایام کے ساتھ بعض الفاظ کے معنی کیوں پست ہو جاتے ہیں اور بعض کے کیوں بلند ۔ جہاں پناہ کے معنی بادشاہ کیوں ہوتے ہیں ۔ اور مہتر کے معنی خاکروب کیوں ۔ دسترخوان اٹھانے کو دسترخوان بڑھانا کیوں کہا جاتا ہے ۔ زبان نفسیاتی فعل بھی ہے ۔ یہ خیال کو ظاہر کرتی ہے اس لیے اس کا نفسیات سے بھی رشتہ ہے معنیات اور زبان کی ابتدا کی کھوج میں خاص طور سے

نفسیات سے مدد ملتی ہے۔

جغرافیہ سے بھی لسانیات کا ربط ہے۔ ہموار میدان میں آمد و رفت اور مراسلت آسان ہوتی ہے وہاں کی زبانوں کا علاقہ دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ پہاڑوں اور دشوار گزار جنگلوں میں زبانیں اور بولیاں بہت محدود ہوتی ہیں۔ ایک قدرتی حدِ فاصل کے دونوں طرف زبانیں یا کم از کم بولیاں مختلف ہوتی ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں آسمان سے گرنے والے اور کارخانے میں جمائے ہوئے برف کے لیے ایک ہی لفظ ہے۔ انگریزی میں دو۔ اسکیمو زبان میں کھارے پانی کے برف میٹھے پانی کے برف گرنے والے برف بہنے والے برف وغیرہ کے لیے متعدد الفاظ ہیں۔ شہروں اور مقامات کے ناموں سے زبان کی فطرت اور ارتقار پر روشنی پڑتی ہے۔

علم تشریح الاعضا کا صوتیات سے تعلق ہے کیونکہ صوتیات میں اعضائے نطق کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ صوتیات کا تعلق طبیعیات سے بھی گہرا ہے۔ آواز ہوا کی لہروں پر کیسے جاتی ہے مصمتہ اور مصوتہ یا غنائی آوازوں سے ہوا کی کیا کیا لہریں بنتی ہیں یہ سب طبیعیات سے متعلق ہے سمعی صوتیات Acustic Phonetics کا مطالعہ تجربہ گاہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ جس طرح صوتیات بیشتر طبیعیات کا سہارا لیتا ہے۔ اسی طرح لسانیات کی شاخ ریاضیاتی اطلاعی نظریہ Communication Engineering سے متعلق ہے۔

لسانیات کے مطالعے سے متعدد فائدے ہیں جن کی تفصیل درج کرنا ممکن نہیں۔ مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ لسانیات سے انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کی یکسانیت اور ایکتا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں جب سر ولیم جونس نے ثابت کیا کہ سنسکرت یونانی اور لاطینی کے خاندان کی زبان ہے تو گوروں کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اب تک وہ ایشائیوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن اس کے بعد انہیں بھی اپنا بھائی سمجھنا پڑا۔ لسانیات ہی سے کسی قوم کی تاریخ اور تہذیب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مصر و بابل وغیرہ کی تہذیب کے مطالعے میں وہاں کی مردہ زبانوں کی تفہیم سے بڑی مدد ملی۔ قدیم ادب کے مطالعے میں لسانیات سے سہارا ملتا ہے۔

رسم الخط میں اصلاحیں لسانیات ہی کے فیض سے کی جا سکتی ہیں۔ جو زبانیں ابھی تک تحریری نہیں ان کی صوتیات کا تجزیہ کر کے ان کو باقاعدہ رسم الخط دیا جا سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کا مطالعہ کرنے میں صوتیات سے بڑی مدد ملتی ہے۔

اہلِ زبان کا سا صحیح تلفظ صوتیات ہی کی مدد سے سیکھا جا سکتا ہے۔ ماہر لسانیات ان زبانوں

ہے نہ صرف جلدی عبور حاصل کر سکتا ہے بلکہ انہیں اہلِ زبان کی بول بھی سکتا ہے۔ امریکہ میں تجزیاتی لسانیات کے فروغ کی یہی وجہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ زبانوں کو جلدی سے سیکھ کر ان لوگوں میں مذہبی اور سیاسی پروپیگنڈا کرنا مقصود ہے۔ اصطلاحات سازی میں بھی لسانیات کا صرف و نحو بڑا کارگر ہے۔ لسانیات ہی کی تحقیقات سے ترجمہ کرنے والی مشینیں بنائی گئی ہیں اور لسانیات ہی سے ہر ملک اپنی خفیہ کوڈ کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ماہرین صوتیات دوسرے ملکوں کی خفیہ کوڈ کا راز بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ امریکہ کی ہوائی اور بحری افواج متعدد ماہرین صوتیات کو ملازم رکھتی ہیں جن کی مدد سے دوسرے ملکوں کے خفیہ پیغامات کو پڑھا جاتا ہے۔

آغازِ زبان کے نظریے

یونانی مفکرین نے جس طرح دوسرے علوم کے آغاز پر غور و خوض کیا اسی طرح زبان کے آغاز کے مسئلے پر بھی نظریاتی انداز سے سوچا۔ انھوں نے کئی نظریے پیش کیے جو لسانیات کے مطالعے کی تاریخ کا جزو بن چکے ہیں۔ ۱۶۶۸ء میں ہابس (Hobbes) نے اپنی کتاب (Elemento Philosophae) کے دوسرے سیکشن کے دسویں باب میں زبان کے آغاز کی بحث بھی کی ہے۔ اٹھارویں صدی میں جب جدید لسانیات کا مطالعہ شروع ہوا تو فلسفیوں، حکیموں اور ماہرین لسانیات نے پھر اس مسئلے پر غور کیا اور طرح طرح کے نظریے پیش کرنا شروع کیے۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں جب تقابلی طریقہ اور داخلی بازتشکیل کے قاعدے معلوم ہوتے تو بعض خوش فہم خیال پرستوں نے سوچا کہ ہم انھیں قاعدوں کا اطلاق کر کے اس قدر پیچھے تک جا سکیں گے کہ تمام زبانوں کی اصل قدیمی زبان (Proto-language) تک پہنچ سکیں گے اور زبان کے ادارے کے آغاز کو گرفت میں لے آئیں گے۔

یہ خیال خام تھا صرف غیر تربیت یافتہ لسانیات ہی یہ سودا رکھ سکتے ہیں کہ موجودہ زبانوں میں اصل قدیمی زبان کے کچھ الفاظ تلاش کر لیں۔ ہمارے پاس زبانوں کا مواد پانچ چھ ہزار سال پہلے تک ملتا ہے اور بس، لیکن زبانوں کا استعمال لاکھوں، غالباً پندرہ بیس لاکھ، سال سے ہو رہا ہے۔ موجودہ مواد اور لسانیاتی طریقوں سے ابتدا تک پہنچنا ممکن نہیں اس گئے گزرے زمانے کے بارے میں کوئی سائنسی تجربہ گاہ کی سی تحقیق، جو علت و معلول کے اصولوں پر پوری اترے ممکن نہیں، قیاس اور تخیل کو بروئے کار لانا ہی پڑے گا۔ اس وجہ سے جب پیرس میں ۱۸۶۶ء میں لسانیاتی سوسائٹی قائم کی گئی تو اس کے دستور کی دفعہ ۲ میں لکھ دیا گیا۔

"سوسائٹی زبان کے آغاز یا ایک عالم گیر زبان کی تخلیق کے بارے میں

کوئی مراسلہ منظور نہیں کرے گی۔"

اس فرمان کے علی الرغم دونوں ممنوع موضوعات ماہرین لسانیات کے منظور نظر رہے ہیں۔ اسپرنٹواوراڈو (Ido) اور دوسری کئی عالمگیر زبانوں کی تخلیق ۱۸۶۶ء کے بعد ہی ہوئی ہے اور زبان کے آغاز کے نظریے انیسویں صدی یا بیسویں صدی کے اوائل ہی میں نہیں بلکہ بیسویں صدی کے نصف دوم میں بھی پیش کیے گئے ہیں۔ کیا ہم ذیل کے بنیادی مفروضوں سے انکار کی مجال کر سکتے ہیں۔

۱۔ سائنس حیوان سے انسان کا ارتقاء مانتی ہے، لسانیات جدید علم ہے۔ یہ کوئی دینیات کی شاخ نہیں، اس لیے ہمیں ڈارون کے نظریۂ آغاز انواع (Theory of the Origin of species) کو تسلیم کرنا ہوگا۔

۲۔ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ انسان کا ارتقاء حیوان سے ہوا تو یہ ضروری ہے کہ بالکل ابتدا میں وہ حیوانوں کی طرح غوں غاں کرتا ہوگا اور اسی سے رفتہ رفتہ نطق انسانی نے ارتقا پایا ہوگا۔

حیوانی غراہٹیں اور دوسری آوازیں انسانی زبان میں کیوں کر تبدیل ہوتیں اس کے بارے میں متعدد نظریے ہیں کیا ان سے چشم پوشی کر لی جاتے یا کسی علم کے تحت ان کا مطالعہ کیا جاتے۔ ماضی کے افکار سے، وہ آج ہمیں کتنے ہی فرسودہ کیوں نہ معلوم ہوں، واقفیت ضروری ہے کیونکہ ہم ماضی سے رشتہ قطع نہیں کر سکتے۔ آغاز زبان کا موضوع بشریات (Anthropology) کے تحت پڑھا جا سکتا ہے یا لسانیات کے تحت۔ چونکہ اس کا تعلق زیادہ تر زبان سے ہے اس لیے ہم اس شعبے کو بشریاتی لسانیات (Anthropological Linguistics) کہہ سکتے ہیں۔ عام لسانیات کے ذیل میں لسانیات کے تمام شعبوں کا تعارف آجاتا ہے۔ زبان کی مطلق حیثیت کے بارے میں فکر سے زیادہ عمومی موضوع کون سا ہوگا اس لیے اس کا ذکر چھیڑنے میں کسی اعتذار کی ضرورت نہیں۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ہمارے ہم عصر کئی مقتدر علمائے لسانیات مثلاً یسپرسن،[1] استرتے وانت اور ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے زبان کے

---

1. Jesperson : Language, its nature, development and origin, p. 96.

آغاز کے نظریے پیش کیے ہیں اس اعتراف کے ساتھ کہ یہ موضوع، سائنسی نہیں فکری ہے۔ علمائے رفتہ کے نظریات کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

لسانیات اس سوال کا جواب دینے میں معذور رہی ہے کہ آیا دنیا کی تمام زبانوں کا منبع ایک ہے یا آزادانہ طور پر ایک مقامات پر ایک سے زیادہ زبانوں کا آغاز ہوا پہلی کو وحید خلقی (Monogenetic theory) اور دوسرے کو کثر خلقی نظریہ (Polygenetic theory) کہتے ہیں۔ یہ سوال دراصل نسل انسانی کے آغاز کے ساتھ وابستہ ہے کیا حیوان سے انسان کا ارتقا محض ایک جگہ ہوا یا کئی جگہ؟ وحید خلقی نظریہ سب سے پہلے لیب نٹز (Leibuitz) نے پیش کیا جو برلن اکیڈمی کی ۱۷۱۰ء کی روئداد میں شائع ہوا۔ کثر خلقی نظریے کے حامی کہتے ہیں کہ دنیا میں زبانوں کے متعدد خاندان ہیں۔ جن میں سے بعض میں اتنا اختلاف ہے کہ ان کے درمیان کوئی نسلی رشتہ ممکن نہیں دکھائی دیتا۔ وحید خلقی نظریے والے یہ جواب دیتے ہیں کہ اب بھی ایک خاندان کی بعض زبانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور روسی یا اردو اور انگریزی کو دیکھ کر یہ کون سوچ سکتا ہے کہ یہ ایک مورث اعلیٰ کی اولاد ہیں۔ اسی طرح لاکھوں سال میں ایک قدیم زبان کے اخلاف اتنے مختلف ہو گئے ہیں کہ کوتاہی نظر کی وجہ سے ہم انھیں مختلف خاندان قرار دیتے ہیں۔

ذیل میں مختلف نظریوں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ الہامی نظریہ: زبان کے آغاز کے بارے میں قدیم ترین نظریہ مذاہب کا ہے جن میں زبانوں کی اصل الوہی یا الہامی قرار دی گئی ہے۔ بعض مذاہب نے اپنی زبان کو قدیم ترین قرار دیا ہے۔ انجیل کے مطابق ابتداً انسانوں میں محض ایک زبان عبرانی رائج تھی۔ اہل بابل نے ایک مینار بنایا تاکہ آسمان پر چڑھ کر خدا سے معرکہ کر سکیں۔ خدا نے اس امّت کو سزا دینے کے لیے ہر شخص کی زبان مختلف کر دی۔ وہ ایک دوسرے کی بات سمجھنے کے قابل نہیں رہے۔ انگریزی محاورہ (Babel of tongues) اسی مینار کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ روایت کے مطابق لوگوں کی مختلف زبانوں سے دنیا کی مختلف زبانیں پیدا ہوئیں۔ اسلامی عقیدے کے مطابق خدا نے حضرت آدمؑ کو اشیا کے مختلف نام سکھائے۔ قرآن کلام اللہ ہے جس کے نتیجے میں عربی آسمانی زبان قرار

پائی ہے۔

ہندوؤں میں سنسکرت کو دیوبانی یا دیوبھاشا کہا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے مطابق سنسکرت زبان اور سنسکرت قواعد کے وہ بنیادی اصول جو پانی کے چودہ سوتروں میں منظوم ہیں، شیوجی کی ڈگڈگی سے نکلے۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری[1] کے مطابق بودھوں کا عقیدہ ہے کہ پالی دنیا کی قدیم ترین زبان ہے جو ازل سے چلی آرہی ہے تیواری نے جینیوں کا یہ مبینہ عقیدہ بھی پیش کیا ہے کہ اردھ ماگدھی پراکرت نہ صرف انسانوں کی ابتدائی اصلی زبان ہے بلکہ دوسرے حیوانات کی بھی ہے۔ چنانچہ مہابیرسوامی جب اردھ ماگدھی میں وعظ کرتے تھے تو دیوتا، انسان، وحوش طیور سب اس وعظ کو سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر تواری کو زبان کے بارے میں جین دھرم کا نظریہ سمجھنے میں غلط فہمی ہوتی ہے۔ جینیوں میں مہابیرسوامی چوبیسویں تیرتھنکر ہوتے ہیں۔ ان سے پہلے کے ۲۳ تیرتھنکر ملک کے مختلف مقامات کے تھے اور ان کے زبان مختلف رہی ہوگی۔ ان کی زبان کے بارے میں صراحت نہیں لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ اردھ ماگدھی قدیم ترین زبان ہے۔ دراصل جینیوں میں کوئی زبان دوسروں کی نسبت مقدس نہیں۔ جس مذہب کی کوئی ایک مقدس کتاب ہی نہ ہو وہاں ایک زبان کو کیوں کر فضیلت دی جاسکتی ہے۔

۱۷۷۲ء میں برلن اکیڈمی نے[3] زبان کے آغاز پر مقالہ نگاری کا ایک انعامی مقابلہ کیا جس میں ہرڈر (Herder) کا مقالہ بہترین قرار دیا گیا۔ اس نے الوہی نظریہ پر دو وقیع اعتراضات کیے۔

۱۔ اگر زبان خدا کی تخلیق ہوتی تو وہ بہت باقاعدہ ہوتی لیکن تمام زبانوں میں عجب بے اصولی و بے ترتیبی پائی جاتی ہے۔

۲۔ زبان میں بنیادی الفاظ فعل کے مادے ہیں جن سے متعدد اسماء کا اشتقاق ہوتا ہے۔ اگر خدا تخلیق کرتا تو ماجرا برعکس ہوتا۔ وہ انسان کو سب سے پہلے چیزوں کے

---

[1] و [2] بھاشا وگیان (ہندی)، از ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری ص ۲۹

3. Jesperson : Language p. 27

نام سکھاتا۔ فعل بعد میں آتے۔ ۱۸۵۱ء میں گرم نے بھی اپنے مقالہ "آغاز زبان" میں زبان کی بے ترتیبی کو الوہی آغاز کے منافی قرار دیا۔ ان دونوں حضرات نے اپنے طور پر زبان کے آغاز کے بارے میں لکھنا چاہا لیکن وہ کوئی واضح اور معقول نظریہ نہ پیش کر سکے۔

۲۔ قدیم زبان کا نظریہ : اسے الوہی نظریے ہی کا دوسرا رُخ سمجھیے فرق یہ ہے کہ وہاں زبان کی تخلیق میں خدا کا دخل تھا یہاں بعض افراد نے کسی تقدس کی آمیزش کے بغیر زبان کو (جو اکثر انھیں کی ہوتی تھی) ازلی یا قدیم ترین قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر ایک زبان بقیہ سب سے پہلے وجود میں آئی تو وہ باقی زبانوں کا سرچشمہ ہو سکتی ہے۔

کئی بادشاہوں کو انسان کی سب سے پہلی یا فطری زبان جاننے کی کد ہوتی۔ انھوں نے نوزائیدہ بچوں کو جنگل میں اس طرح پرورش کرایا کہ ان کے کانوں میں کسی زبان کا کوئی لفظ نہ پڑ سکے۔ اس قسم کے چار تجربے کیے گئے۔

ا۔ قدیم مصری بادشاہ سام (Psammetichus) نے دو بچوں کو جنگل میں پرورش کرایا کچھ سال بعد دربار میں لاتے گئے تو ان میں سے ایک نے لفظ بیکوس (Bekos) کہا جو فریجین (Phrygian) زبان میں روٹی کو کہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ فریجین ازلی زبان ہے۔ حالانکہ ہوا یہ تھا کہ روٹی دینے والا خادم فریجین تھا۔ کسی دن اس کے منہ سے یہ لفظ نکل گیا تھا۔ ممکن ہے اکثر نکل جاتا ہو۔ اس سے لڑکوں نے اسے دل میں ڈال لیا۔ فریجین غالباً کوئی آرمینی زبان تھی جس پر یونانی اثرات تھے۔ اس کے آٹھویں صدی قبل مسیح کے کتبے ملتے ہیں۔

ب۔ شہنشاہ فریڈک دوم (۱۱۹۴ء تا ۱۲۵۰ء) نے بھی ایسا تجربہ کیا لیکن بچے گویائی سیکھنے سے پہلے ہی مر گئے۔

ج۔ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمس چہارم (۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۳ء) نے بھی بچوں کو تنہائی میں نظربند رکھا اور آخر میں ظل سبحانی نے فیصلہ کیا کہ وہ بہت اچھی عبرانی بولتے تھے۔

د۔ اکبر بادشاہ (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) نے بھی جنگل میں کچھ بچوں کی پرورش کرائی اور جیسا کہ ہونا چاہیئے وہ بچے گونگے ثابت ہوتے۔

ان بادشاہوں کے علاوہ بعض افراد نے بھی اپنی زبان کو ازلی قرار دیا۔ ڈچ عالم

(Becanus) (۱۵۱۸ء تا ۱۵۷۲ء) ڈچ زبان کو قدیم ترین مانتا تھا۔ اس نے اس زبان کو (Cymbrian) نام دیا تھا اس کے مقابلے میں دو علماء (Johannes) (متوفی ۱۵۴۴ء) اور (Magnus) (متوفی ۱۵۶۸ء) گوتھک یعنی قدیم جرمن کو پہلی زبان مانتے تھے۔ سویڈن کا عالم (Kemke) (متوفی ۱۶۸۹ء) سنجیدگی سے دعوا کرتا تھا کہ باغ عدن میں خدا سویڈش زبان میں، آدم ڈینش زبان میں اور سانپ کی شکل میں شیطان فرنچ میں بات کرتا تھا یعنی کیم کے کے مطابق اس کی زبان خدا کی، پڑوسی ملک ڈنمارک کی زبان آدم کی اور معتوب فرانسیسی شیطان کی زبان تھی۔

یہ سب نظریے وہ ہیں جنھیں مذاہب اور ان کے صحیفوں کی پشت پناہی نہیں ورنہ ان کی دلیل بھی کسی حد تک الوہی نظریے جیسی ہے۔

۳۔ فطری نظریہ: یہ نظریہ فیثا غورث (چھٹی صدی ق م) (Herakritos) (۵۷۶ ق م تا ۴۸۰ ق م) اور افلاطون (۴۲۷ تا ۳۴۷) کا ہے۔ افلاطون نے اپنے مجموعۂ مکالمات (Cratylus) میں لفظوں کے آغاز پر بحث کی ہے اور اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ لفظ اور اس کے نام میں کوئی فطری اور لازمی تعلق ہوتا ہے کسی نہ کسی شکل میں مماثلیتے (Analogists) بھی اس نظریے کو مانتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ زبان فطری اور باقاعدہ ہے اور لفظ کے صحیح معنی اس کی ہیئت سے ہویدا ہو جاتے ہیں۔

یہ کہنا کہ اشیا اور ان کے ناموں میں کوئی پراسرار فطری تعلق ہوتا ہے ایسی بے تکی بات ہے جس کی تردید کی ضرورت نہیں۔ اس نظریے کے حامیوں کے سامنے محض یونانی زبان تھی۔ انھیں معلوم نہ تھا کہ ہر چیز کے مختلف زبانوں میں مختلف نام ہوتے ہیں۔

۴۔ معاہدے کا نظریہ: یہ نظریہ زبان کو انسانوں کے باہمی معاہدے کا نتیجہ قرار دیتا ہے یعنی انسانوں نے مختلف اشیاء کے بارے میں اتفاق سے طے کیا کہ اس کا نام یہ رکھیں گے اور اس کا نام وہ۔ پانچویں صدی ق م میں ڈیموکرٹس (Demokrites) اور چوتھی ق م میں ارسطو نے زبان کو باہمی قول و قرار سے مستخرج کیا۔ اسمہ) کورد سو نے ۱۷۵۴ء میں اور واضح کیا۔ اس نے ریاست کی طرح زبان

کو بھی سماجی معاہدے کا نتیجہ قرار دیا۔ اس نظریے پر حسب ذیل اعتراض ہے۔
ہم زبان کے آغاز کا نظریہ دریافت کر رہے ہیں زبان کی نشو و نما نہیں۔ چیزوں کے نام رکھنے کا معاہدہ اسی وقت ہوگا جب تبادلۂ خیالات کے لیے زبان موجود ہو۔ اس طرح یہ نظریہ زبان کی بالیدگی کی تاویل کر سکتا ہے۔ ابتدا کی نہیں۔

۵۔ حیوانی آوازوں کی نقل کا نظریہ (Bow Vow theory) : اس نظریے کے مطابق انسان نے جانوروں کی بولیوں کی نقل میں زبان کے اولین الفاظ اختراع کیے مثلاً میاؤں، بھوں بھوں، میں میں (میں کے گلے پر چھری) ہنہنانا، رینکنا، غرّانا، انگریزی میں (Grunt cock, Cuckoo, purr, Ba,Mew) وغیرہ۔ میکس فلر نے طنزاً اس نظریے کو (Bow-Vow) یعنی کتے کے بھونکنے کا نظریہ کہہ کر پکارا۔ اس کا اعتراض ہے کہ اس قسم کے الفاظ مصنوعی پھولوں کی طرح جامد ہیں جن سے دوسرے الفاظ مشتق نہیں ہو سکتے۔
یہ اعتراض سو فیصدی صحیح نہیں کیونکہ اردو میں بھوں بھوں سے بھونکنا، میں میں سے ممیانا (ہیبت یا احساس کمتری میں بولنے کا نتیجہ) غرّانا سے غرّاہٹ اور انگریزی میں کلو سے (Cuckold) اور کاک سے (Conquet) جیسے باقاعدہ الفاظ بنے۔ رینان کے مطابق یہ تاریخی ترتیب کہ پہلے حیوانات بولے اور پھر اشرف المخلوقات نے ان کی نقل میں زبان ایجاد کی، بالکل لغو ہے۔

اس نظریے میں اس حد تک صداقت ہے کہ اس سے ہر زبان کے دس بیس الفاظ کی اصل معلوم ہو جاتی ہے، اور بس۔ یہ زبان کے بنیادی الفاظ بھی نہیں۔ بقیہ الفاظ کے بارے میں اس نظریے سے کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔

۶۔ اشیا کی جھنکار اور بصری پیکروں کی نقل کا نظریہ : اس نظریے کو بعض حضرات نے غلطی سے ڈنگ ڈانگ (Ding-dong) نظریے کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن جیسا کہ آگے دکھایا جاتے گا، وہ ایک دوسرا نظریہ ہے۔ زیر بحث نظریے کا صحیح نام صوت نما نظریہ (Onomatopoeic) ہونا چاہیئے۔ اس نظریے کے مطابق انسان نے مظاہر قدرت اور انسانی مصنوعات میں متعدد قسم کی گونج اور

لہ بھولا ناتھ تواری : بھاشا وگیان ص، ۳ طبع چہارم

جھنکار سنی اور ان کو الفاظ میں اسیر کر لینا چاہا۔ اس طرح اولین الفاظ وجود میں آئے ان ہی سے دوسرے الفاظ بنتے گئے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی مثالیں گڑ، بڑ، گڑ، گڑاہٹ، گرج، چیرپھار، ٹن ٹن، بھڑ بھڑ، کھٹ پٹ پتا وغیرہ ہیں۔ انگریزی میں ایسے الفاظ بہت ہیں مثلاً۔

(Sizzle, Thunder, Clatter, Thud, Flatter, Bang, Bump,Drzzle, Honk, Ding-dong,

ان کے بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے جو الفاظ آج صوت نما ہیں وہ اصلاً ایسے نہ ہوں مثلاً انگریزی لفظ Thunder. لاطینی لفظ (Tonet) سے مشتق ہے اور (Tonet) کا مادہ (Ten) ہے جس میں بادل کے گرجنے کیفیت مفقود ہے۔

اس نظریے کی دوسری شاخ کے طور پر ہم ایسے الفاظ کو لکھتے ہیں جن میں کچھ اس قسم کا بصری پیکر ہوتا ہے جو معنی کی ایک جھلک پیش کر دیتا ہے مثلاً اردو میں جگ مگ، جھلمل، چکاچوند، زرق برق، گڑبڑ جھالا، ڈگمگانا، اوبڑکھابڑ، انگریزی میں:

Flash, Glow, Glimmer, Zig-zag, Dazzle, Hotch-Potch,

Topsy-turruy, Glare, Hocus-pocus.

دراصل پانچویں اور چھٹی نظریے ایک ہی ہیں۔ ایک میں حیوانات کی آواز کی نقل ہے دوسرے میں بے جان چیزوں کی آواز یا ہیبت کی نقل۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری نے ان تینوں کو ایک ہی نظریہ مان کر اس کے تین پہلو قرار دیے ہیں:

زیر نظر نظریے پر بھی حسب سابق تین اعتراض کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ اس قسم کے الفاظ زبان کے کل ذخیرے کا بہت قلیل حصہ ہیں۔

۲۔ یہ زبان کے آغاز کے دور کے نہیں کیونکہ یہ تو اتنے قدیم بھی نہیں کہ اپنی زبان کی مورث اعلیٰ یا مورث میں بھی ملتے ہوں ہند یورپی خاندان کی مختلف زبانوں میں جب ان کے ہم معنی الفاظ کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ صوتی مطابقت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ قدیم اصلی ہند یورپی

گڑھ لیے گیے ہیں۔ ہماری کھوج مطلق زبان یعنی نطق انسانی کے آغاز کی ہے۔
۳۔ یہ الفاظ زبان کے بنیادی مادّے نہیں۔ ان سے بہت کم الفاظ مشتق ہو سکتے ہیں۔ مادّوں کا نظریہ (Ding-dong or Root theory) اس کے موجد پروفیسر ہیس (Heyse) ہیں۔ ان کے شاگرد ڈاکٹر اسٹاتن تھال نے اسے تحریری شکل میں شائع کیا لیکن اس کی اہمیت میکس ملر کی وجہ سے ہے جس نے اپنے خطبات میں اس کی شرح کی۔ اس نظریے کے مطابق معنی اور صوت میں کوئی پُراسرار ہم آہنگی ہوتی ہے۔ فطرت کا یہ قانون ہے کہ جس شے پر ضرب لگائی جاتی اس سے ایک مخصوص جھنکار پیدا ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کی طفولیت میں بشر میں ایک جبلی صلاحیت تھی کہ ہر خارجی شدید آواز انسان میں ایک صوتی ردعمل پیدا کرتی تھی۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ سکتے ہیں کہ آدمی جوں ہی کسی شے کی جھنکار سنتا تھا اس کی صدا تے بازگشت کے طور پر خود اس کے منہ سے ویسی ہی کوئی آواز نکل جاتی تھی۔ مثلاً دھات پر چوٹ پڑنے کے ساتھ اس کے منہ سے ٹن اور لکڑی پر ضرب پڑنے سے کھٹ نکلا ہوگا۔ یہ آوازیں ہی وہ مادّے ہیں جن سے زبان کا استخراج ہوا۔ اس طرح کی آوازیں ابتداً بہت زیادہ تھیں لیکن ایس نے ان میں سے تقریباً پانچ سو کی بنیادوں پر زبان کی تعمیر کی۔ زبان کی نشوونما کے بعد مادوں کی تخلیق کی ضرورت نہیں رہی اس لیے انسان میں سے یہ صلاحیت جاتی رہی۔

پانِنی نے سنسکرت جیسی بے پایاں زبان کو ۱۷۰۶ مادوں پر مبنی قرار دیا تھا انیسویں صدی میں[2] (Edgean) نے انھیں گھٹا کر ۵۸۷ تک پہنچا دیا۔ انگریزی کا آریائی الفاظ کا ذخیرہ صرف ۴۶۰ مادّوں سے نکلا ہے مثلاً ایک مادّے (Br) یا (Bar) سے

Burden, Bear, Biet, Birth, Born, Fertile, Refrence.

(Conference, Transfer) وغیرہ متعدد الفاظ مشتق ہوتے۔ یہ مادّہ فارسی میں بَر اور سنسکرت میں بھار ہے۔ اس قسم کے جتنے مادے ہیں وہ افعال کو ظاہر کرتے

۱؎ 1. Maxmuller : Lectures on the science of language p. 39 London 1891.

۲؎ 2. Maxmuller : Lectures on the science of language p. 39 London 1891.

ہیں مثلاً بار: لے جانا، مار، رگڑنا، س ٹا (Sta) : رُکنا یا روکنا، تان: پھیلانا۔

یہ مادّے حواس خمسہ سے شناخت کی جانے والی اشیا (Percept) پر دلالت نہیں کرتے بلکہ ایسے بہت سے تجربوں کے غیر مرئی جز و مشترک یعنی تصور (Concept) کو ظاہر کرتے ہیں۔ بعد میں عمومی تصور کو مخصوص تصورات میں تقسیم کر دیا گیا۔ مندرجہ بالا تفصیل سے میکس ملر کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس پر کئی اعتراضات ہو سکتے ہیں۔

۱۔ یہ پورا نظریہ محض قیاس پر مبنی ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں۔

۲۔ اگر ایک زمانے میں انسان میں مادّے تخلیق کرنے کی صلاحیت تھی تو وہ ہمیشہ کے لیے فنا کیوں کر ہو گئی۔

۳۔ دنیا کی بعض زبانوں مثلاً چینی میں سرے سے مادّے اور مشتق کا جھنجھٹ ہی نہیں ان کی توجیہ کیوں کر ہو۔

۴۔ جن فرضی مادّوں سے اتنے سارے الفاظ ماخوذ کیے گئے ہیں صرفی اصول اس اشتقاق کی تائید نہیں کرتے۔

۵۔ بالفرض مادّے چیزوں کی جھنکار کی صدائے بازگشت ہیں تو ان سے مشتق ہونے والے الفاظ کیوں کر پیدا ہو گئے۔

۶۔ زبان اور قواعد کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی تخلیق کے ایک عرصہ دراز کے بعد انسان نے مادّوں کی دریافت کی اور ان پر تصریف کے عمل سے دوسرے الفاظ کا اشتقاق کیا۔ ابتدائی جنگلی انسان کہاں سے صرف (Morphology) کا اتنا ماہر ہو سکتا تھا کہ مادّوں سے نئے نئے الفاظ بناتے۔

۷۔ راقم الحروف کو اس نظریے پر اعتراض یہ ہے کہ وحشی انسان کے لیے مادی ادراک (Percept) پہلے آنا چاہیئے، غیر مرئی تصور (Concept) بعد میں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ شمالی امریکہ کی چیروکی زبان میں ہاتھ دھونے، کپڑا دھونے وغیرہ کے لیے مخصوص الفاظ ہیں لیکن محض دھونے کے لیے کوئی نہیں، بلادو زبان میں سفید گائے، سیاہ گائے، لال گائے کے لیے الگ الگ الفاظ ہیں لیکن محض گائے کے لیے نہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مادّی تجربے

کے لیے لفظ پہلے وضع کیا گیا عام تصوّر کے لیے بعد میں۔

اس نظریے کے سب سے بڑے وکیل میکس فلر کو بھی بعد میں اس کی خامیاں نظر آگئیں۔ اور اس نے اس سے انحراف کر لیا۔

۸۔ فجائی نظریہ (Pooh Pooh theory) اسے میکس فلر نے تضحیک کے طور پر پوہ پوہ نظریہ کہا اس کے مطابق ابتدائی انسان عقل کے بجائے جذبے کے زیر اثر تھا۔ ہر جذبے کی شدّت میں اس کے منہ سے کوئی اضطراری آواز نکل جاتی تھی۔ ان فجائیہ نعروں کی صفائی سے زبان میں آوازیں (مصوتے اور مصمتے) پیدا ہوئیں۔ اور انھیں سے دوسرے الفاظ بنے۔ ڈارون نے شدت جذبات میں فجائیہ کلمات کی ادائیگی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

اردو میں اس قسم کے الفاظ ہائے ہائے، آہ آہ، اُف وغیرہ ہیں۔ انگریزی میں (Fie, Ho, Pooh Pooh) وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ اس قسم کے الفاظ کی صحیح تشریح کرتا ہے لیکن ہر زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد کتنی ہوتی ہے محض دس بیس بقیہ بے نہایت الفاظ کی کیا تاویل ہو۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ الفاظ واقعی فجائی آوازوں کی نہایت ناقص لسانی تشکیل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زبانوں میں ایک ہی جذبے کا ردّعمل مختلف الفاظ سے دکھایا جاتا ہے حالانکہ واقعی کراہنے یا قہقہہ لگانے میں ایک ہی قسم کی غیر ابجدی آواز ہوتی ہے۔ تیسرا اعتراض یہ ہے کہ فجائی آواز میں زبان کا تخم تو درکنار زبان کا جزو بھی نہیں۔ یہ زبان سے ہی بردتے کار آتے ہیں۔ کہا گیا ہے:

(Language begins where interjections end)

آخری و قبیح اعتراض یہ ہے کہ فجائی کلمات اشتقاق کے نقطۂ نظر سے بالکل جامد ہوتے ہیں۔ ان پر تصریف کا عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ الفاظ زبان کو کیوں کر جنم دے سکتے ہیں۔

۹۔ اجتماعی محنت کی ہانک کا نظریہ (Yo-He-Yo theory) اس نظریے کا بانی نواتر (Noire) ہے۔ جب انسان سخت محنت کرتے ہیں تو ہانپتے یعنی تیز تیز

سانس لینے سے کچھ مدد ملتی ہے۔ تیز سانس کی آمد و رفت سے صوتی تاروں میں ارتعاش ہوتا ہے۔ غیر متمدن انسان جب اجتماعی طور پر کوئی کام کرتے تھے تو سہارے کی خاطر کوئی ہانک لگاتے تھے۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے۔ یورپی ملاح کشتی کھیتے وقت یو ہی وا اور ہندوستانی مزدور ہیا ہیا کہتے ہیں۔ دھوبی اپنے پٹڑے پر کپڑے پٹکتے وقت چھو رام چھو رام بولتے ہیں۔ واضح رہے کہ اس نظریے کے مطابق ابتدائی آوازیں اجتماعی مشقت کی پیداوار ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بالکل لغو ہے۔ کسی زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ ہوگی۔ ایک مصنف ڈائمنڈ کو اس نظریے پر ایک اور اعتراض ہے۔ اس نظریے کے مطابق سب سے پہلے الفاظ کسی بھاری چیز کو گھسیٹنا (Haul) اور کسی لکڑی یا پتھر کو کاٹنا (Heave) کے ہم معنی رہے ہوں گے۔ ڈائمنڈ کہتا ہے کہ قدیم ترین زبانوں میں کھینچنا یا کھینچنا کے مفہوم کا مادّہ نہیں ملتا۔

اس نظریے کو نکھار کر دوسرے کئی علما نے ایسے نظریے پیش کیے جن میں زبان کو جسمانی محنت کی ضمنی پیداوار قرار دیا۔ یہ نظریے آپس میں ملتے جلتے ہیں۔ ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ ٹاٹا نظریہ : اس کے مطابق انسان جب کوئی محنت کرتا تھا تو نادانستہ طور پر اس کے اعضائے نطق محنت کرنے والے اعضائے جسم کی نقل کرتے تھے جس سے کچھ آوازیں بلکہ آوازوں کے مجموعے پیدا ہو جاتے تھے۔ آوازوں کے انھیں مجموعوں یعنی بے معنی الفاظ سے زبان کا ارتقا ہوا۔

اس نظریے پر دو اعتراضات ہیں۔ اوّل کہ اب انسان محنت مشقت کرتے وقت "ہوں" جیسی آواز کے علاوہ آوازوں کے مفصل یا متنوع خوشے ادا نہیں کرتا۔ کیوں کر کہا جاتے کہ وحشی انسان جو زبان سے ناآشنا تھا اور جانور کی طرح تھا۔ ایسی آوازیں منہ سے نکالتا تھا جو "لفظ" کی طرح ہوں۔ دوسرے یہ صاف نہیں کہ ان بے معنی آوازوں سے مصوتوں اور مصمتوں والے بامعنی الفاظ کیوں کر بنے۔ یہی تو اصل مسئلہ ہے جس کی حقیقت نہیں جانتی ہے۔

۱۹۲۳ء میں ایک شخص مرے[1] (Murray) نے بھی زبان کو ابتدائی انسان کی حرکت بازو کی نقل قرار دیا۔ اس کے نزدیک ہر مشقت کے عمل کے ساتھ ایک مخصوص بے معنی لفظ زبان سے ادا ہوتا تھا۔ یہ الفاظ زبان کے جنم داتا تھے مرے کے نزدیک ایسے ابتدائی مادّے محض تو ہیں مثلاً : (Ag. Wag, Hwag, Hrag,)
ان کے معنی ضرب پہنچانا، ہلانا وغیرہ ہیں۔ معلوم نہیں مرے کے یہ تمام مادے آگ (Ag) ہی پر کیوں ختم ہوتے ہیں۔

مرے کے نظریے کو ڈائمنڈ نے اور ترقی دی۔ آغاز زبان پر اس کی کتاب ۱۹۵۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کے نظریے کا نچوڑ اسی کے الفاظ میں ہے۔

(Speech Originated in voc.. sounds automatically accompanying effort of the arm.)

زبان کے الفاظ کھینچنا، کاٹنا، پھاڑنا وغیرہ کے مفہوم کو ظاہر کرتے تھے۔ اس نظریے اور یوہیو نظریے میں یہ دو فرق ہیں۔

الف۔ یوہیو کے مطابق زبان کی ابتدا اجتماعی محنت سے ہوتی ہے جب کہ ٹاٹا میں یہ انفرادی محنت کی دین ہے۔

ب یوہیو میں محنت کے ساتھ منہ سے آوازیں نکالنے کا مقصد تھکن کم کرنا تھا۔ مرے اور ڈائمنڈ کے یہاں یہ عمل کسی مقصد کے بغیر ہوتا تھا۔ ان کے یہاں آلات نطق لازماً حرکت بازو کے متوازن نہیں چلتے۔

اس نظریے میں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے کہ محنت کے ساتھ ساتھ زبان سے آواز نکلتی ہے لیکن وہ آوازیں اس قسم کی نہیں ہوتیں جنہیں زبان کے قدیم ترین مادّے کہا جا سکے۔

اشارات و حرکات کا نظریہ: یہ نظریہ مندرجہ بالا نظریے سے اس بات میں مختلف ہے کہ اوّل الذکر میں زبان کو محنت مشقت کے عمل کی ضمنی پیداوار قرار دیا تھا۔

---

1. Murry : History of European languages, Edinburgh, 1923 as refferred by. Dimond : The History and origin of Languages, p 274 Ist ed. 1959.

۲۔ ڈائمنڈ کی محولہ بالا کتاب

زیرنظرنظریے میں محنت کا ذکر نہیں بلکہ گفتگو کے ساتھ کی حرکات (Gestures) کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس کے وکلا میں چار اشخاص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے اسے پولی نیشیائی زبانوں کے عالم ڈاکٹر راتے نے پیش کیا۔

۲۔ اس کے بعد ڈارون نے چھ غیر متعلق زبانوں کے تقابلی مطالعے کی بنا پر اس کی حمایت کی۔

۳۔ ۱۹۳۰ء میں سر رچرڈ پیجز[1] (Richard Pages) نے حرکات دہنی کا نظریہ (Mouth gesture theory) پیش کیا جو اس طرح ہے:

کھانا کھاتے وقت زبان اور ہونٹوں کی حرکت سے کچھ آوازیں پیدا ہوتی ہیں اس سے وحشی انسان کو دریافت ہوگیا کہ حلق سے باہر ہوا نکالنے سے آواز پیدا کی جاسکتی ہے اور وحشی انسان جو کچھ حرکات اور اشارے کرتا تھا غیر شعوری طور پر زبان اور ہونٹ بھی اسی سے متوازی حرکتیں (Gestures) کرتے تھے۔ ان حرکات دہنی سے مختلف آوازیں پیدا ہوتیں۔

۴۔ آئس لینڈ کی زبان کے عالم الگزنڈر جوہانسن نے ہند یورپی، عبرانی، قدیم چینی، ترکی اور چند اور زبانوں کے مطالعے کے بعد اس نظریے کو تفصیل سے پیش کیا۔ ان کے مطابق نطق کے ارتقا میں چار منزلیں ہیں۔

پہلی منزل ان حیوان نما آوازوں کی ہے جن میں انسان اپنے بنیادی جذبات مثلاً خوف، غصہ، غم، جنسی خواہش وغیرہ کا اظہار کرتا تھا۔ اس منزل کی آوازیں غوغاں قسم کی رہی ہوں گی۔

دوسری منزل میں اس نے مختلف جانوروں کی آوازوں اور بے جان اشیا کی جھنکار کی نقل کی اور انھیں صوت نما الفاظ میں ظاہر کیا۔

تیسری منزل میں انسان نے ایک طرف تو اپنے جذبات کو حرکات (Gestures) کی مدد سے ادا کیا دوسری طرف غیر شعوری نقل کے طور پر اعضائے نطق (زبان اور ہونٹوں) نے اس کی ان حرکتوں بالخصوص ہاتھوں کی حرکتوں کی نقل کی۔

---

1. Sir Richard pages : Human Speech, 1930.

گانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ موسیقار آواز کی ادائیگی کے لیے مسلسل ہاتھوں کی حرکت سے مدد لیتا ہے جو ہانسن نے اس کے برعکس ہاتھوں کی حرکت کو اوّلیت دی جس کی نقل آلات نطق نے کی۔ اعضائے نطق کی جنبش سے الفاظ متشکل ہوتے لیکن یہ الفاظ مادّی اشیا کے لیے رہے ہوں گے اس منزل کو جو ہانسن نے اہم ترین قرار دیا ہے۔

چوتھی منزل میں تخلیق الفاظ کا کام اور ترقی کر گیا اور اس منزل میں لطیف تصورات کے لیے الفاظ وضع کیے گئے۔

انھوں نے نطق کی واحد آوازوں یعنی مصوتوں اور مصمتوں کا معنی کے ساتھ تعلق بھی قائم کیا جو بڑا عجیب ہے اس کی دو مثالیں یہ ہیں :

چونکہ مصمتہ (ر) ادا کرنے میں زبان کو آگے بڑھنا ہوتا ہے۔ اس لیے قدیم زبانوں میں (ر) سے شروع ہونے والے مادّے کے معنی رفتار یا دوڑنے (Run) کے ہیں۔ انھوں نے عبرانی زبان کے مادّوں رب ک (ملانا) اور رک ب (چڑھنا، سوار ہونا) کو مثال میں پیش کیا۔ لیکن دوسری کلاسیکی زبانوں میں ایسے بہت سے مادّے ملتے ہیں جن کے معنی میں "حرکت" شامل ہے۔ لیکن وہ (ر) سے شروع نہیں ہوتے۔

(م) کو ادا کرنے میں چونکہ ہونٹ بند ہو جاتے ہیں اس لیے (م) سے شروع ہونے والے مادّوں کے معنی خاموش (Mum) یا بند کرنے کے ہوتے ہیں۔

جب ہم اپنی موجودہ زبانوں کو دیکھتے ہیں تو "ر" اور "م" کی اس تاویل کی تصدیق نہیں ہوتی۔ انگریزی الفاظ (Rust, Rest, Remain) اور اردو لفظ رہنا میں حرکت کا شائبہ نہیں اس کے برعکس انگریزی الفاظ (Mash, move) کے معنی میں سکون کے بجائے حرکت پائی جاتی ہے۔

جو ہانسن کا نظریہ ایک فلسفیانہ خوش فکری ہے۔ یہ قائل نہیں کرتا۔ اعضائے نطق کا اپنے جسم کی حرکات کی نقل میں آوازوں کو جنم دینا سمجھ میں نہیں آتا۔ بالفرض اسی طرح کچھ آوازیں پیدا بھی ہوں تو وہ غیر لسانی آوازیں ہوں گی۔ ان سے لسانی آوازیں اور الفاظ کیونکر بنے ہوں گے اس کی کوئی تاویل نہیں۔ جو ہانسن نے مفرد آوازوں کے جو معنی متعین کیے ہیں وہ بہت تھوڑے مواد کو دیکھ کر طے کر دیے گئے ہیں۔

اب مختلف علما کے پیش کردہ چھ مفصل نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔ جو ہانسن کے نظریے کی طرح ان سب میں کئی منزلوں کا تصور کیا گیا ہے۔

۱۲۔ ہنری سویٹ کا نظریہ: یہ انیسویں صدی کے ماہر لسانیات تھے۔ انھوں نے کئی نظریوں کی مدد سے اپنا نظریہ قائم کیا۔ ان کے مطابق ابتدا میں زبان اشاروں (Gestures) اور مجموعۂ اصوات (لفظوں) دونوں پر مشتمل تھی۔ مجموعۂ اصوات کی بنا پر لفظوں کا ارتقا ہوا۔ ابتدائی الفاظ تین قسم کے تھے:

ا۔ صوت نقل الفاظ مثلاً سنسکرت کاک (کوا)۔ انگریزی کوکو (کوئل)، قدیم مصری ماؤ (میاں، بلی)، بعض اوقات ایسے الفاظ صوت کی صحیح نقل نہیں ہوتے تھے۔

مجائی الفاظ جو شدت جذبات کی پیداوار ہوتے ہیں مثلاً ہائے، آہ، واہ، شاذونادر ایسے الفاظ مادّے بن کر دوسرے الفاظ کو جنم بھی دیتے ہیں۔ مثلاً انگریزی میں پوہ، پوہ سے (Pooh-poohed) ہندی میں دھکار سے دھکارنا۔

ج رمزی (Symbolic) الفاظ۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن میں اتفاق یا کسی نحیف مماثلت یا رشتے کی وجہ سے کوئی مخصوص معنی فرض کر لیے جاتے ہیں۔ ان کی ہیت اور معنی میں دور کا تعلق ہوتا ہے مثلاً بچہ دودھ پینے میں ہونٹوں کا استعمال کرتا ہے۔ اس سے اسے ہونٹوں کی جنبش کی مشق ہو جاتی ہے۔ ہونٹوں کو ہلانے سے دولبی آوازیں پ، ب، م، پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس نے شروع میں پاپا، بابا، ماما، جیسے الفاظ ادا کیے ماں باپ نے انھیں خود سے موسوم کر دیا۔ پنگوڑے کے یہ الفاظ (Nursery words) مختلف زبانوں میں اسی طرح کے رمزیاتی معنی میں لے لیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو: عبرانی اور عربی ام، اب، یونانی (Phrater, Pater, Mater) (بھائی) لیٹن (Frater, Pater, Mater) جرمن: (Muhme Bruder, Vater) انگریزی ماما، پاپا، ہندی اردو ماں، اماں، بابا، ابا، بھائی وغیرہ۔

اسموں کے علاوہ کچھ ضمیر اور فعل بھی اسی قسم کے ہیں۔ ضمائر میں سنسکرت توم، یونانی To لیٹن Tu انگریزی (You, Thau, اور ہندی تو، میں سامنے کے آدمی کے لیے منھ سے اشارہ مضمر ہے۔ اسی طرح اشاری ضمائر یہ، وہ، (That, This) اور جرمن (Das, Dies) وغیرہ میں آواز کے ساتھ اشارہ شامل

ہے اور اس اشارے کی وجہ سے ان الفاظ کو ان کے معنی دیے گئے۔
افعال میں لیٹن (Bibere) انگریزی (Blow) ہندی پی وغیرہ میں ہونٹوں کی ایسی حرکت شامل ہے جیسی پھونک مارنے یا پانی پینے میں ہوتی ہے۔
کچھ ایسے بھی الفاظ ہوں گے جو صوت نما بھی ہوں اور رمزی بھی مثلاً (Rush) وغیرہ۔ ابتدا میں رمزی الفاظ کی تعداد بہت رہی ہوگی۔ بعد میں ایسے الفاظ باقی رہ گئے جو بقائے انسب میں پورے اترے یعنی جو سننے، بولنے اور مفہوم کی ادائیگی میں بہتر تھے۔ ابتدا میں زیادہ تر الفاظ اشیا کے نام رہے ہوں گے انھیں سے لطیف تصورات اخذ کیے گئے مثلاً جنوبی افریقہ کی سا سوتو زبان میں مکھی کو اس کی آواز کی بنا پر "ن ت، سی" (Ntse) کہتے ہیں۔ مکھی کی طرح چکر لگانا خوشامدیوں کا بھی شعار ہوتا ہے اس لیے "ن، ت، سی" کے معنی چاپلوسی کرنا بھی ہو گئے۔ اس طرح استعارہ، مماثلت وغیرہ کی بنا پر مختلف غیر مرئی تصورات کو نام دیے گئے۔
سویٹ نے جن الفاظ کو رمزی کہا ہے ان میں سے ماں باپ، بھائی کے معنی کے الفاظ اس قسم کی علامتیں ہو سکتی ہیں لیکن زبان کے بیشتر الفاظ میں ہیت اور مفہوم میں دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔
۱۳۔ نغاتی نظریہ: (Sing-song theory) گو اسے ڈاروِن اور اسپنسر نے بھی کسی حد تک مانا ہے لیکن شرح وبسط کے ساتھ اسے ڈنمارک کے مشہور ماہر لسانیات یسپرسن (Jesperson) نے اپنی کتاب (Language) میں پیش کیا۔ یسپرسن کی تفصیلات کے پیش نظر اسی کو اس نظریے کا موجد مانا جا سکتا۔
اس کے نزدیک زبان کی ایجاد خیالات کی ترسیل کے لیے نہیں ہوتی بلکہ یہ لہو ولعب کے جذبۂ نشاط کا ابال ہے۔ وحشی انسان کی ضرورتیں کم تھیں وہ بآسانی فطرت سے اپنی بنیادی ضرورتیں مثلاً خوراک حاصل کر لیتا تھا۔ اس لیے نوجوان اپنا بیشتر وقت ناچ گانے اور پیار محبت میں صرف کرتے تھے۔ ان مشاغل میں ان کے منھ سے کچھ بے معنی فقرے نکلے ہوں گے مثلاً ایک نوجوان نے موسم بہار میں اپنی محبوبہ کو دیکھ کر ایک طویل بے معنی فقرہ، نعرے کے انداز میں ہانک دیا ہوگا۔

(Hey-and-a-ho-and-a-hey-nomino)

اس کے دوستوں نے اس نوجوان کو اسی فقرے سے موسوم کر دیا ہوگا۔ یا ایک گروہ نے اپنے جانی دشمن کو شکست دے کر مار دیا ہو اور سب اس کی لاش کے گرد ایک بے معنی فقرہ (Tarra ra - boom-de-ay) کہہ کر ناچنے لگے ہوں تو بعد میں اس فقرے کو کچھ بھی معنی پہنا دیے گیے ہوں، مثلاً ہم نے خطرناک آدمی کو مار ڈالا۔ بعد میں ان فقروں کو لفظوں میں توڑ لیا ہوگا اور ہر لفظ کے کوئی معنی متعین کر لیے گئے ہوں گے۔ اس طرح زبان میں پہلے طویل فقرے یا جملے آئے، بعد میں الفاظ۔

حیرت ہے کہ یسپرسن جیسا بالغ نظر عالم اس قسم کا بے بنیاد نظریہ پیش کرے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ حیوانی غوں غاں کے بعد اگلی منزل یک رکنی مجموعۂ اصوات مثلاً آ، با، پا سے ما، مے وغیرہ کی ہوگی۔ یہ ممکن نہیں کہ نطق کی ابتدا کئی کئی لفظوں پر مشتمل فقرے، کئی کئی صوت رکنوں پر مشتمل الفاظ اور طرح طرح کے مضمونوں پر مشتمل رکنوں سے ہو۔

پھر یہ صحیح نہیں کہ ابتدائی انسان کی زندگی اتنی سہل بلکہ عیاشانہ تھی۔ وہ مہیب مظاہر فطرت کے درمیان گھبرایا رہتا ہوگا۔ اسے ہر دم رقص و نغمہ اور رومان کی مہلت نہ ہوگی۔

۱۴۔ ارتباطی نظریہ: (Contact theory) ۔ اسے ماہر نفسیات ریویز (Reversz) نے پیش کیا۔ انھوں نے حیوانات، بچوں اور غیر مہذب انسانوں کی نفسیات کا مطالعہ کر کے یہ نظریہ قائم کیا جو حسب ذیل ہے:

انسان مدنی الطبع ہے۔ ابتدائی انسانوں میں چھوٹے چھوٹے گروہ رہے ہوں گے اور ہر گروہ کے بیچ ابتدائی جذبہ مثلاً بھوک، پیاس، جنسی خواہش وغیرہ کی ترسیل کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ اس سماجی ربط کے لیے وہ لمس اور آوازوں دونوں کا سہارا لیتا ہوگا جیسے جیسے سماجی ارتباط بڑھتا گیا۔ ترسیل کرنے والی آوازوں کا ارتقا بھی ہوتا گیا۔ ابتدا میں یہ ارتباط جذباتی سطح پر رہا ہوگا لیکن بعد میں ذہنی سطح تک آگیا ہوگا۔ اس منزل میں آکر زبان کے ارتقا کی رفتار بڑھ گئی ہوگی۔ ابتدائی آوازیں سادہ رہی ہوں گی بعد میں پیچیدہ ہوگئی ہوں گی۔

ریویز فجائی کلمات مثلاً آہ، واہ، وغیرہ میں ترسیل کا عنصر مضمر نہیں مانتا لیکن ان کا اور ترسیلی آوازوں کا تعلق ضرور رہا ہے۔ ترسیلی آوازوں میں سب سے پہلے اطلاعی الفاظ مثلاً چلاّنا، پکارنا کے مفہوم والے ظہور پذیر ہوتے ہوں گے۔ ابتدائی الفاظ کو معینہ موقعوں پر استعمال کرنے کی وجہ سے ان میں کوئی مفہوم مخصوص ہوگیا ہوگا۔

الفاظ کی تخلیق میں انھیں سے ایسی آوازیں بنیں جنھیں وہ (Contact sound) کہتا ہے۔ ارتباط کی ان آوازوں سے اطلاعی آوازیں ارتقا پذیر ہوتیں۔ اطلاعی آوازیں چلاّنے اور پکارنے جیسے مفہوم ادا کرتی ہوں گی۔ اس کے بعد زبان کے ابتدائی لفظ بنے۔ ایک لفظ کو مخصوص موقعوں پر استعمال کرنے سے اس میں کچھ مخصوص معنی معین ہوگئے ہوں گے۔ ابتدائی الفاظ رشتہ داروں اور اشیا کے ناموں سے متعلق ہوں گے لیکن یہ اصلاً اسم نہ ہوکر فعل رہے ہوں گے۔ ایک لفظ سے پورے جملے کا مفہوم لیا جاتا ہوگا مثلاً "ماں" کے معنی "ماں دودھ دو"۔ جیسے رہے ہوں گے۔ اس طرح پہلے لفظ جملوی مفہوم والے فعل رہے ہوں گے جن سے بعد میں اسم ماخوذ ہوتے۔

مزید ارتقا ہونے پر لفظوں کو ملاکر چھوٹے چھوٹے جملے بناتے گئے ہوں گے لیکن بولنے والوں کو جملے کے اجزا کا شعور نہ ہوگا بلکہ پورے جملے کا ایک مفہوم سمجھتے ہونگے۔ آہستہ آہستہ خیالات کی زیادہ ترسیل کے ساتھ زبان کا ارتقا ہوتا گیا۔ راقم الحروف کو اس نظریے میں دو کمزوریوں کا احساس ہوتا ہے۔

(الف) آغاز زبان کے بارے میں قیاس کیا جاتے تو یہ سوجھتا ہے کہ وحشی انسان نے پہلے مادّی اشیار کے نام (Percepts). رکھے ہوں گے اور بعد میں غیر مرئی تصورات (Concepts) تک پہنچا ہوگا۔ لیکن زبانوں کو دیکھا جاتے تو یہ اعجوبہ دکھائی دیتا ہے کہ زبان کے مادے فعل سے بنے ہیں جو ایک تصور رہے۔ اس تضاد اور دُبدھا کی تاویل مشکل ہے۔ ریویز نے اسے سُلجھانے کے بجاتے قابل رحم طریقے سے الجھایا ہے۔ وہ ایک طرف کہتا ہے کہ ابتدائی الفاظ رشتہ داروں اور اشیا کے نام رہے ہوں گے اور اسی کے ساتھ کہہ دیتا ہے کہ لفظ فعل رہے ہونگے

اسم نہیں ۔ دونوں باتیں کیوں کر ممکن ہیں ۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ رشتہ داروں کے ناموں کے مفرد الفاظ میں جملے کا مفہوم رہا ہوگا ۔

(ب) وہ زبان کی ابتدا مفرد لفظ سے کرتا ہے لیکن زبانوں کی نوعیاتی تقسیم میں اس نے دیکھا کہ شمولی نوعیت (Incorporating) کی زبانیں بہت پچھڑے ہوتے قبیلوں میں مستعمل ہیں ۔ اس لیے اس نے یہ کہہ دیا کہ ابتدا میں جب انسان نے لفظوں کو ملا کر جملے بنائے تو وہ جملے کے اجزا یعنی الفاظ کا الگ الگ مفہوم نہ لیتا ہوگا ۔ یہ کیونکر ؟ اگر اس نے ابتداً مفرد الفاظ کی تخلیق سے کی اور انھیں جوڑ کر جملہ بنایا تو وہ لفظوں کا شعور کیونکر کھو دے گا ۔ یہاں ریویز شمولی زبانوں کے طلسم میں اسیر دکھائی دیتا ہے ۔

لسانیات کے بہت سے علما ۔ ریویز کے نظریے کو آغاز زبان کی گتھیاں حل کرنے میں ناکافی سمجھتے ہیں ۔

۱۵ ۔ تاراپور والے کا نظریہ : ہندوستان کے تاریخی لسانیات کے عالم تاراپور والے نے بھی زبان کے آغاز کا نظریہ پیش کیا ہے ۔ وہ بچوں کے اکتساب زبان کو بہت اہمیت دیتے ہیں ۔ ان کے نزدیک بچے کے زبان سیکھنے میں کئی منزلیں ہیں ۔

۱ ۔ شروع میں بچہ جبلی خواہشوں کی آسودگی کے لیے محض غوں غاں کرتا ہے یہ جبلی خواہشیں بھوک، پیاس، خوف خوشی اور جھنجھلاہٹ وغیرہ ہیں جو طرح طرح سے رو کر یا ہنس کر ادا کی جاتی ہیں ۔

اس سے اگلی منزل میں وہ آوازوں کی گڈ مڈ سے الفاظ بنا لیتا ہے ۔ عام سامع کے لیے وہ بے معنی ہوتے ہیں لیکن والدین تجربے سے ان کے معنی کی قدر سمجھنے لگتے ہیں ۔

۳ ۔ تیسری منزل باقاعدہ زبان کی ہے ۔

ایسا ہی ابتدائی وحشی انسان کے ساتھ ہوا ہوگا ۔ جب وہ حیوان سے انسان کی منزل میں داخل ہوا یعنی پوری طرح سیدھا کھڑے ہو کر چلنے لگا تو اس کا مغز کافی

---

1. E J Taraporewala : Principles of the Science of language : p. 46.

بالیدہ ہو چکا ہوگا۔ اس وقت وہ جانوروں... جیسی... آوازوں میں اپنی جبلی خواہشوں اور جذبوں کا اظہار کرتا ہوگا۔

دوسری منزل میں بنیادی تصورات مثلاً بھوک، نیند، ڈر، جنسی خواہش وغیرہ کو قابل تجزیہ آوازوں (مصمتے اور مصوتے) کے مجموعے سے ظاہر کرتا ہوگا۔ یہ گڈمڈ آوازیں نہ جملہ کہی جا سکتی ہیں نہ لفظ۔ ایک پورے خیال کے لیے ایک صوتی خوشہ ہوگا۔ اس قسم کی مثالیں ایک بہت پچھڑی ہوئی امریکی زبان (Tierra de Fuego) میں ملتی ہیں۔ وہاں ہر تجربے کے اظہار کے لیے اصوات کے گروہ ہیں اور یہ گروہ کیسے پیچیدہ ہیں مثلاً (Mamilhapina to pai) کے معنی ہیں۔

"دو آدمی ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں اس امید میں کہ دوسرا اس کام کو کردے گا جو دونوں چاہتے ہیں۔ لیکن خود نہیں کرنا چاہتے۔"

اس طویل لفظ یا جملے کو مختلف معنی دار اجزا میں نہیں بانٹا جا سکتا۔ ایک اور شمولی زبان (Old Huron iroquois) میں ذیل کے جلوی لفظ ملاحظہ ہوں:

میں پانی تک گیا ہوں (Eschoirhon)
پانی تک جاؤ (Setsonha)
بالٹی میں پانی ہے (On de quoha)
برتن میں پانی ہے (Danstant ewa charte)

ان فقروں میں پانی کے لیے کوئی جزو دکھائی نہیں دیتا یعنی بظاہر ایک مشترک تصور کی کمی ہے۔ حد تو یہ ہے "کہ بالٹی میں پانی ہے" اور "برتن میں پانی ہے" جیسے مماثل مفاہیم کو ادا کرنے والے فقرے بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان زبانوں میں جلوی مفہوم کے لیے ایک فقرہ یا لفظ ہے جس کا تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ تاراپور والے کے نزدیک وحشی انسان نے دوسری منزل میں اس قسم کے صوتی گچھوں سے بنیادی تصورات کی ترسیل ہوگی۔

تیسری منزل میں ان جلوں فقروں کو مفرد تصورات یعنی لفظوں میں تقسیم کیا ہوگا شروع میں مادّی اشیا اور ابتدائی تصوّرات کے لیے الفاظ کی تشکیل ہوتی ہوگی۔

چوتھی منزل میں قواعد زبان کی ارتقا پا گئی ہو گی۔

تاراپوروالے نے بچوں کی زبان سے اپنے نظریے کا استنباط کیا ہے لیکن بچوں کی زبان اور ابتدائی وحشی انسان کی زبان میں دو بڑے فرق ہیں (۱) بچے کوئی نئی زبان تخلیق نہیں کرتی بلکہ وہ اپنے ماحول میں پہلے سے موجود زبان کا اکتساب یا نقل کرنے کا معرکہ ہی سر کرتا ہے یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ بچہ خود باقاعدہ بولنے سے کئی ماہ قبل والدین کے احکامات اور بنیادی جملوں کو سمجھنے لگتا ہے۔ گویا بچہ زبان کے نفسیاتی پہلو پر پہلے ہی غور کر لیتا ہے اور میکانیکی پہلوں میں بھی سمعی حصے پر حاوی ہو جاتا ہے صرف ملفوظی میکانکی حصے کی مہارت کے لیے اسے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ اس کے برعکس ابتدائی وحشی انسان کو زبان کی تخلیق کا مسئلہ درپیش تھا۔ دوسرے یہ کہ بچے کا ذہن اور مغز بہت کم بالیدہ ہوتا ہے جب کہ بالغ وحشی انسان کا شعور، ذہن اور مغز کہیں زیادہ بالیدہ رہا ہوگا۔ تاراپوروالے کے ذہن پر تاریخی لسانیات کا یہ قدیم مفروضہ سوار ہے کہ زبانوں کا ارتقا شمولی سے امتزاجی اور امتزاجی سے تصریفی میں ہوا۔ اسی لیے صوتیاتی زبان کی پہلی اکائیاں فقروی الفاظ کو قرار دیتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ حیوانی غوں غاں کے فوراً بعد انسان اتنے طویل اور پیچیدہ فقرے یا الفاظ ادا نہیں کر سکتا۔ ابتدا میں وہ ایک دو صوت رکنوں پر مشتمل الفاظ ہی کہہ سکا ہو گا۔

یہ ماننے کے لیے بھی شافی دلائل نہیں کہ ابتدا پورے خیالات کو ظاہر کرنے والے فقروں یا طویل الفاظ سے ہوئی اور انھیں بعد میں لفظوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۶۔ ہمارے زمانے کے امریکی ماہر لسانیات ایڈگر اسٹرتیے وانت نے اپنی کتاب " این انٹروڈکشن ٹو لنگوئسٹ سائنس" میں ایک نظریہ پیش کیا جو مندرجہ بالا بعض نظریوں سے جزوی طور پر مماثل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

شدت جذبات میں انسان منہ سے اضطراری طور پر کچھ آوازیں نکالتا تھا۔ بعد میں ان آوازوں میں اس مخصوص جذبے کا مفہوم رچ بس گیا۔ مثلاً کراہنا درد یا چوٹ کو ظاہر کرتا تھا چنانچہ کسی کو یہ بتانا ہو کہ اس کے ہاتھ میں چوٹ لگ گئی ہے تو وہ کراہ کر دکھاتا ہے یعنی فجائی آوازیں اضطراریت کے ساتھ

بالقصد ادا کی جانے لگیں۔ فجائی آوازوں کے علاوہ انسان حرکات واشارات سے بھی کام لیتا تھا اور حیوانات کی آواز کی بھی نقل کرنے لگا۔ کوئی انسان شیر کو دیکھ کر جھپٹ کر پیڑ پر چڑھ گیا لیکن شیر نے گھٹنے کا کچھ گوشت اڑا دیا۔ اپنے ساتھیوں سے اس کا بیان کرنے کے لیے وحشی انسان کراہ کر پاؤں کا زخم دکھاتے گا اور اس کے بعد شیر کی غراہٹ کی نقل کر کے بتاتے گا۔ یہ شیر کی حرکت ہے۔ اگر اسے یہ کہنا ہوگا کہ "بھیڑیا دوڑا" تو وہ بھیڑیے کی سی آواز نکال کر چوپاؤں کی طرح دوڑ کر دکھائے گا۔ آہستہ آہستہ غیر صوتی حرکات واشارات مفصل ہوتے گئے مثلاً کھلا ہاتھ آگے بڑھانے کے معنی مانگنا۔ مٹھی بند کر کے پیچھے کھینچنے کے معنی رکھنا یا جمع کرنا۔

آہستہ آہستہ صوتی اشاروں کو غیر صوتی اشاروں پر ترجیح دی جانے لگی کیونکہ یہ اندھیرے میں بھی کارآمد ہیں اور اس وقت بھی جب کہ فریق ثانی ہماری سمت نہ دیکھ رہا ہو۔ ترسیل جوں جوں صوتی ہوتی گئی مختلف صوتی خوشوں میں من مانے مفاہیم رچتے گئے اور یہی زبان کی ابتدا تھی۔

اس نظریے کا مرکزی حصہ محض وہ ہے جو آج بھی ہم ایک گونگے انسان کو کرتے دیکھتے ہیں۔ وہی صوتی اور حرکتی اشاروں سے ملا جلا کر کام لینا، اصل مسئلہ اس نظریے میں گول کر دیا گیا ہے کہ فجائی آوازیں یا حیوانات کی آوازوں کی نقلیں صوتیاتی الفاظ میں کیوں کر بدلیں۔

۱۷۔ ڈاکٹر سنتی کمار چیٹر جی کا نظریہ: ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر سنتی کمار چیٹر جی نے اورینٹل کانفرنس کی صدارت کی ورا اس کے خطبۂ صدارت میں آغاز بیان کا ایک نظریہ پیش کیا۔ موصوف نے ساگر یونیورسٹی میں موسم گرما کی لسانیاتی اسکول میں کچھ درس دیا چنانچہ ۲۰ مئی ۶۱ء کے کلاس لکچر میں اپنے نظریے کی تفصیلات بتائیں جو اس طرح ہیں:

سب سے پہلے انھوں نے اپنے نظریے کا جوہر ذیل کے الفاظ میں سمو دیا

(Language is vocal reaction to natural and physical conditions)

زبان طبعی حالات کا صوتی ردعمل ہے۔ مختلف جذبات مثلاً پیار، خوف، غصے

وغیرہ کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص قسم کی شعور نما آوازیں تھیں ۔ یہ ایک گروہ یا قبیلے کے بیچ ایک قسم کی کوڈ تھیں ۔ جس وقت انسان کا ارتقا ہو رہا تھا اس وقت اس کی بولی بیشتر حلقی غراہٹوں وغیرہ پر مشتمل تھی ۔ اس وقت نطق انسانی جذباتی کیفیت کی سطح سے بالاتر ہوا اور مختلف کیفیات کے لیے لفظوں کے اختراع کی کوشش کی گئی ۔ قدیم ترین انسانی آوازیں حنجرہ (Larynx) میں پیدا شدہ چٹکار (Chicks) اور دوسری حلقی آوازوں نیز دوہری مخلوط آوازوں پر مشتمل رہی ہوں گی ۔

بصری تجربوں کی توسیع کے ساتھ آوازوں کی باریکیوں میں اضافہ ہوتا گیا ۔ ابتدائی دور سے زبان کی تشکیل میں کوئی ایک لاکھ سال لگے ہوں گے ۔ اسی دوران میں انسان معاشرے میں منظم ہوگیا ۔

تاریخی عصر سے اب تک جب ہم زبانوں کا ارتقا دیکھتے ہیں تو مختلف زبانوں میں ایک ہی تصور یا کیفیت کو ظاہر کرنے کے بالکل مختلف طریقے دکھائی دیتے ہیں ۔ اسی لیے زبان کے ارتقا کے مطالعے میں ہمارے سامنے ایک بنیادی سوال اُبھرتا ہے کہ تمام زبانیں ایک ابتدائی بولی سے نکلیں یا مختلف علاقوں میں چند زبانیں آزادانہ طور پر ظہور پذیر ہوتیں ۔ اس سے انسانی نسل کے بارے میں بھی یہ سوال سامنے آتا ہے کہ تمام نوع انسان ایک اصول سے پیدا ہوئی یا آزادانہ دو چار جگہوں پر؟ آج تمام انسان ایک نوع کے فرد ہیں ۔ ان سب کے بیچ جفت ہونے اور تخلیق کا عمل ممکن ہے ۔ لیکن انسانوں میں تین بڑی اور واضح نسلیں دیکھنے میں آتی ہیں : آریہ، منگول اور حبشی ۔ انھیں دیکھ کر ایک نظریہ یہ بھی قائم کیا گیا کہ حیوان سے انسان کا ارتقا تین جگہ ہوا جس سے تین بڑی نسلیں ظاہر ہوئیں اور تین جگہ انسانی زبان وجود میں آئیں ۔

ڈاکٹر چٹرجی نے یہ واضح نہیں کیا کہ حیوان نما آوازیں صوتیاتی آوازوں اور لفظوں میں کیونکر تبدیل ہوتیں ۔

ہم مندرجہ بالا نظریات میں سے کسی ایک سے مطمئن نہیں لیکن ان کے سوا زبان کے آغاز کی کوئی اور صورت سمجھ میں نہیں آتی ۔ حیوانوں کی آواز، اشیا کی

جھنکار اور فضائیہ آوازوں کی نقل کے نظریے اس حد تک درست ہیں کہ وہ موجودہ یا قدیم زبانوں کے چند الفاظ کی تشکیل کی توجیہہ کر دیتے ہیں لیکن یہ مجموعی طور پر زبان کے آغاز کی توجیہہ نہیں کرتے۔ اسس نقطۂ نظر سے ذیل کے پانچ نظریے زیادہ فکر انگریز ہیں۔

۱۔ ہندی سویٹ کا نظریہ ۲۔ ریویز کا نظریہ ۳۔ تارا پوروالے کا نظریہ۔
۴۔ استرتے وانت کا نظریہ ۵ ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی کا نظریہ

حقیقت انھیں میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔ میں اس کی نشاندہی کرنے کی جرات نہیں کرتا کیونکہ ایسا کرنے سے ایک اور مخلوط نظریہ وجود میں آئے گا اور میرے پاس ایک نیا نظریہ پیش کرنے کی دلیلیں ہیں نہ متاع علم۔

یسپرسن نے اس مسئلے کی کھوج کے لیے تین موضوعات کا مطالعہ تجویز کیا۔
۱۔ بچوں کی زبان کا مطالعہ ۲۔ غیر متمدن قبائل کی زبانیں ۳۔ موجودہ زبانوں کی قدیم ترین تاریخ۔

مندرجہ بالا نظریوں کے بانیوں میں سے اکثر نے ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن ان میں بھی قباحتیں ہیں۔ بچے وہ زبان سیکھتے ہیں جو ان کے چاروں طرف مکمل حالت میں موجود ہوتی ہے۔ وحشی انسان کا تخلیق زبان کا عمل اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ آج کے غیر متمدن قبیلوں کی زبانیں بھی ابتدائی زبان کی آئینہ دار نہیں کیونکہ ان قبائل کی زبانیں ہزاروں بلکہ لاکھوں سال کے ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ ارتقا کی رفتار سست سہی لیکن پھر بھی موجودہ روپ سے ایک لاکھ سال پرانے روپ کے بارے میں نتیجہ نکالنا احتیاط چاہتا ہے۔ ہاں زبانوں کی گزشتہ تاریخ نسبتاً مفید ہے۔

قبائلی زبانوں اور موجودہ مہذب زبانوں کی قدیم تاریخ سے زبان کا آغاز تو معلوم نہیں ہو پاتا۔ ہاں ابتدائی زبانوں کی خصوصیات کے بارے میں کچھ اندازہ ضرور کیا جا سکتا ہے جو کچھ اسس قسم کا ہے۔

۱۔ قدیم زبانوں کی آوازیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ نہیں۔ افریقی زبانوں میں کتنی مشکل اور غیر معمولی آوازیں ہیں وہاں لفظ کی ابتدا میں کئی مصمتوں کا

اجتماع معمولی بات ہے۔ افریقہ کی بعض زبانوں میں ایسے الفاظ بھی ہیں جن میں کوئی معنویت ہی نہیں ہوتا معلوم نہیں وہ کیوں کرادا کیے جاتے ہیں۔ سنسکرت میں ऋ اور ऌ جیسی مشکل آوازیں تھیں جو ہندی میں آکر بالکل سادہ ہو گئی ہیں۔ واضح ہو کہ یہ آوازیں ہمیں کو زیادہ مشکل معلوم ہوتی ہیں ورنہ ان زبانوں کے بولنے والوں کے لیے یہ اتنی ہی فطری اور سہل رہی ہوں گی۔

۲۔ بالکل ابتدا کے بعد کی زبان میں الفاظ زیادہ طویل تھے۔ اب استعمال کی خراد پر چڑھ کر مختصر اور آسان ہو گئے ہیں۔ سنسکرت میں الفاظ کتنے لمبے ہوتے ہیں۔ انگریزی اور فرنچ وغیرہ میں جو غیر ملفوظی حروف بھرے پڑے ہیں ظاہر ہے کہ کسی زمانے میں وہ بولے جاتے ہوں گے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے الفاظ مختصر ہوتے جا رہے ہیں۔

۳۔ قدیم زمانوں میں ترنم کا لہجہ غالب تھا۔ یعنی وہ سُر دار زبانیں (Tone languages) تھیں۔ قدیم انسان جذباتی تھا۔ وہ سپاٹ لہجے میں کم بولتا تھا۔ ویدک بھاشا اور سنسکرت اشلوکوں کو مخصوص نغماتی لہجے میں پڑھنے کا رواج تھا۔ یگ اور ہون میں اگر انھیں غلط لہجے میں پڑھ دیا جاتا تو اثر ہی زائل ہو جاتا۔

۴۔ ذخیرہ الفاظ یقیناً کم تھا اس میں بھی محسوسات اور مادّی اشیا کے الفاظ زیادہ تھے۔ لطیف اور مجرد خیالات کے اظہار کے الفاظ نا پید تھے۔ مثلاً تسمانیہ کی معدوم زبان میں سخت، نرم، سرد، گرم کے لیے الفاظ نہ تھے۔

۵۔ قواعد کے اصول کم اور غیر واضح تھے۔ جامد الفاظ کی تعداد زیادہ تھی۔ تصریف اور اشتقاق بہت کم ہوتا تھا۔ فعل میں زمانہ اور اسم میں جنس اور عدد نہ ہوگا۔ سابقے، لاحقے، حروف جار وغیرہ نہ ہوں گے

۶۔ جملے میں اکثر الفاظ کو ملا دیا جاتا ہوگا۔

اُردو کا نام اور آغاز کے نظریے

ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی لکھتے ہیں:

'اُردو الطائی لفظ ہے اور اُرْدُوْ (الف مضموم، واو معروف ساکن، ر۔ ۔ کن، د پر مختصر ضمہ یعنی چھوٹے اد کی ماترا' اور یرٹ کی شکل میں ملتا ہے۔ اُردو اس لفظ کی فارسی شکل ہے۔ ترکی لفظ کے معنی ہیں تمبو، خیمہ، قیام گاہ، پڑاؤ، بستی یا سردار کا پڑاؤ۔ ترکی اور منگول بادشاہوں کے کیمپ یا خیمے ہی ان کے دربار ہوتے تھے۔[1]

الطائی منگولی زبانوں کا ایک خاندان ہے جس کی سب سے اہم زبان ترکی ہے۔ چیٹرجی آگے چل کر لکھتے ہیں:

'فارسی اور ہندوستانی کلامی عادتوں میں اختتامی طویل مصوتے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ان کے مناسب حال اس میں ترمیم ہوکر یہ لفظ اُردو ہوگیا۔ ترکی میں یہ لفظ لشکر، گھر، وطن کے مفہوم میں باقی ہے۔ جدید ترکی (عثمان لی) میں ترکوں کا وطن کے لیے ترک اُردو، رائج ہے۔[2]

یعنی ترکی میں اسی لفظ کے تلفظ کے شروع میں طویل مصوتہ اور آخر میں مختصر مصوتہ ہے۔ محمد حسین آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں:

'ترکی میں اُردو بازار لشکر کو کہتے ہیں'[3]

لیکن اگر اُردو میں بازار کا مفہوم پوشیدہ ہوتا تو 'اُردو بازار' کی ترکیب کی

---

[1] ڈاکٹر عتیق صدیقی (مترجم)، ہند آریائی اور ہندی ص ۱۷۰

[2] ایضاً ص ۱۷۱

[3] شیخ مبارک علی لاہور بار دوازدہم صفحہ ۲۰

کیا ضرورت تھی۔ صحیح وہی ہے جو ڈاکٹر چٹرجی نے لکھا ہے۔ محمود شیرانی کے مطابق سب سے پہلے یہ لفظ جہاں کشائے جوینی میں ملتا ہے[1] ہندوستان میں یہ لفظ تزک بابری میں ملتا ہے[2] دونوں جگہ اس کے معنی شہزادوں یا سرداروں کے خیمے یا قیام گاہ کے معنی میں آیا ہے۔ شاہ جہاں نے جب دلی میں لال قلعہ تعمیر کیا اسے قلعہ معلیٰ کہنے لگے اور بازار کو اُردوئے معلیٰ۔

میر امن باغ و بہار میں لکھتے ہیں:

"جب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافت بنایا۔ تب سے شاہ جہاں آباد مشہور ہوا (اگرچہ دلی جدی ہے، وہ پرانا شہر اور یہ نیا شہر کہلاتا ہے) اور وہاں کے بازار کو اُردوئے معلیٰ خطاب دیا۔[3]"

بعد میں اس بازار کو اُردوئے معلیٰ کے بجائے اُردو بازار کہا جانے لگا۔

فرہنگ آصفیہ میں اُردو بازار کے سلسلے میں لکھا ہے۔

چونکہ اوّل اوّل اس کی شاہجہانی لشکر سے ابتدا ہوئی لہٰذا اس کا نام بھی اُردو پڑ گیا۔ قلعہ معلیٰ کے لاہوری دروازے کے سامنے اُردو بازار کے نام سے ایک بازار بھی آباد ہو گیا جو بلاقی بیگم کے کوچہ اور چاندنی چوک کی سڑک کے جنوبی پہلو پر واقع ہے۔[4]

سرسید آثار الصنادید میں لکھتے ہیں۔

"اور اس کے آگے بڑا بازار جس میں چاندنی چوک وغیرہ سب بازار شامل ہیں مگر اگلے زمانے میں یہ بازار لاہوری بازار کہلاتا تھا۔ یہ بازار قلعہ کے لاہوری دروازے سے فتح پوری تک ہے۔ اس بازار کے پہلے حصے کو تو اُردو بازار کہتے ہیں اور اس کے آگے جہاں ترپولیہ اور کوتوالی ہے وہ اسی نام سے مشہور ہے اور اس کے

---

[1] ص ۱۴۰ جلد اول بحوالہ پنجاب میں اردو ص ۲۹ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۷۵ء

[2] ایضاً۔

[3] باغ و بہار ص ۱۴۔ مکتبہ جامعہ ۱۹۷۰ء

[4] جلد اول ص ۲۱ "

کے آگے چاندنی چوک کہلاتا ہے، اور اس کے آگے فتحپوری کا بازار ہے۔[1]
اس طرح اگلے زمانے کا اُردو بازار لال قلعہ کے مرکزی دروازے سے گرد دوارہ سیس گنج اور کوتوالی تک کا حصہ ہے۔ موجودہ اُردو بازار اس سے مختلف ہے۔ یہ جامع مسجد کے پیچھے ہے۔ اور اسے اُردو بازار اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اُردو کی کتابوں کی دوکانیں ہیں۔
پہلے پہلے اُردوئے معلیٰ کی زبان کو زبانِ اُردوئے معلیٰ کہا گیا۔ پھر زبان اُردو یا اُردو کی زبان اور آخر میں محض اُردو۔ ان کے استعمال کی قدیم ترین مثالیں درج کی جاتی ہیں۔
ا۔ طبقات الشعرا (۱۱۸۸ھ) میں قدرت اللہ شوق نے ولی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے اسے مشورہ دیا۔
'ایں زبان دکنی را گزاشتہ ریختہ را موافقِ اُردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد موزوں بکنید'، معلوم نہیں شوق کا ماخذ کیا ہے۔ اگر شاہ گلشن نے ولی کو مشورہ دیتے وقت واقعی 'اُردوئے معلیٰ شاہ جہاں آباد' کہا تو یہ اس فقرے کے استعمال کی قدیم ترین مثال ہے۔
۲۔ میر نے نکات الشعرا ۱۱۶۵ھ میں لکھا ہے۔
در فنِ ریختہ کہ شعرے است بطورِ شعرِ فارسی بہ زبانِ اُردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد دہلی کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ۔
۳۔ قائم نے ۱۱۶۸ھ میں لکھا۔
اکثرے از ترکیبات فریین کہ موافقِ محاورۂ اُردوئے معلی مانوس گوش می ید ..
مین جملہ جواز الابیان می دانند[2]
۴۔ نوطرز مرصع کی تکمیل ۱۱۸۹ھ ۱۷۷۵ء میں ہوئی۔ تحسین لکھتا ہے۔
جو کوئی حوصلہ سیکھنے زبان اُردوئے معلّی رکھتا ہو[3]

---

[1] مخزن نکات ص ۳۲ طبع اول ۱۹۲۹ھ اورنگ آباد
[2] نوطرز مرصع مرتبہ نورالحسن ہاشمی پہلا ایڈیشن ۱۹۵۰ء الہ آباد ص ۵۴

۵۔ علی ابراہیم خاں خلیل نے گلزار ابراہیم (۱۱۹۸ھ) میں اصالت خاں ثابت کے احوال میں معلی کا لفظ حذف کر کے محض 'زبان اُردو' کا ذکر کیا۔

'تتبع زبان اُردو نمودہ۔ عمرے در ریختہ گوئی بسر بردہ'، [1]

۶۔ میرامن نے باغ و بہار ۱۸۰۱ء میں لکھا۔

حقیقت اُردو زبان کی بزرگوں کے منہ سے یوں سنی ہے۔

پہلے اُردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد یا محاورۂ اُردوئے معلیٰ یا زبان اُردوئے معلیٰ کہا گیا بعد میں معلیٰ حذف ہو کر زبانِ اُردو اور پھر اُردو کی زبان کہا گیا۔ نام کے ارتقا میں آخری منزل حرفِ اضافت کا حذف ہے۔ کسی سابقے لاحقے کے بغیر محض 'اُردو' کا استعمال پُرانا ہے۔ اس سلسلے میں محمد اکرام چغتائی نے اپنے ایک مضمون [2] میں قدیم ترین استعمال کی کھوج کی جس کے نتائج یہ ہیں۔

۱ میر محمدی مائل دہلوی قائم کے شاگرد تھے۔ ان کا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب ہوا۔ تاریخ ترتیب کا قطعہ یہ ہے

ہوا دیواں مرا جب صاف اللہ کی عنایت سوں شگفتہ دل ہوا، پڑھ ریختہ ۱۰ ارباب محفل کا
میں سر نیوڑاتے بیٹھا تھا..... زانو پر کہا تاریخ ہاتف نے کھلا ہے باغ مائل کا

تیسرے مصرع میں محذوف الفاظ 'پئے تاریخ' ہو سکتے ہیں۔ فقرۂ تاریخ میں مائل میں ہمزہ کو 'ی' مان کر ۱۰ عدد لیے جائیں تو ۱۱۷۶ھ برآمد ہوتا ہے جو ترتیب دیوان کی تاریخ ہے۔ اس دیوان میں ایک قطعہ ہے جس میں کوئی شخص مائل سے پوچھتا ہے۔

ع بتلا کہ شعر ہندوی کس عہد سے چلا

سائل اور مائل کے جستہ جستہ شعر یہ ہیں

بولا وہ شخص، یہ تو کہانی میں سب سنی اُردو کا ... بتا دے مسلسل کھلا کھلا
مشہور خلق اُردو کا تھا ہندوی لقب اگلے سفینوں بیچ یہ لکھ گئے ہیں سب للاُ

---

[1] گلزار ابراہیم مع گلشن ہند مرتبہ ڈاکٹر زور ص ۸۸۔ ۱۹۳۴ء علی گڑھ

[2] اُردو زبان کے متعلق نئی تحقیق، مشمولہ رسالہ اُردو نامہ۔ شمارہ ۲۶ بابت دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۳۲

شاہ جہاں کے عہد سے خلقت کے بیچ میں ہندوی تو نام مٹ گیا اُردو لقب چلا

۲ اس کے بعد مصحفی کا یہ شعر ملتا ہے۔

خدا رکھے، زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اُردو ہماری ہے

ڈاکٹر گراہم بیلی نے اپنے ایک مضمون[1] میں یہ شعر لکھ کر کہا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ مصحفی نے یہ شعر کب کہا تھا لیکن "۱۷۷۶ء میں ایک مسلّم شاعر تھا۔

("He was a recognised poet in 1976")

غلط نقل کرنے کی مثال ڈاکٹر شوکت سبزواری کا یہ بیان ہے۔

ڈاکٹر بیلی کا قیاس ہے کہ یہ ۱۷۷۶ء کے قریب کہا ہوگا[2]

بعد میں لکھنے والوں نے اس شعر کو قطعیت کے ساتھ ۱۷۷۶ء سے منسوب کر دیا

'خدا رکھے، کس کے لیے آیا ہے؟ اپنے لیے یا میر و مرزا کے لیے۔ غالباً میر و مرزا کے لیے جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں اس وقت تک زندہ تھے سوداؔ ۱۱۹۵ھ میں اور میرؔ ۱۲۲۵ھ میں مرے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ یہ شعر ۱۱۹۵ھ سے پہلے کا ہو۔

۳ مرزا جان طپش نے اپنا دیوان ۱۱۹۵ھ/۸۵-۱۷۸۴ء میں مرتب کیا۔ اس کے آغاز میں ایک فارسی دیباچہ ہے جس میں اُردو زبان کے آغاز اور اُردو شاعری کے ارتقا پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ میں نے اس دیباچے کا اُردو ترجمہ دیکھا ہے۔ پہلے جملے ہی میں کہتے ہیں' زبان اُردو کے معنی ہیں دہلی کا روزمرّہ[3]

اُردو کی تسمیہ بیان کرتے ہوتے لکھتے ہیں۔

'اسی طرح لفظ اُردو اس زبان کے لیے مخصوص ہوگیا[4]

---

[1] ڈاکٹر گراہم بیلی (The Journal of Royal Asiatic Society - April 1930, p. 343)

بحوالہ محولہ بالا مضمون ص ۲۹

[2] داستانِ زبان اُردو ص ۷

[3] اُردو زبان کی ابتدا۔ کلیات طپش کا دیباچہ۔ مترجمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی رسالہ اُردو اکتوبر ۱۹۴۹ء۔ ص ۱۲۱۔ [4] ایضاً ص ۱۲۴۔

۴ شیرانی نے پنجاب میں اُردو میں حضرت مراد شاہ کا ذکر کیا ہے۔ انھوں نے عزیزان وطن کے نام ایک خط منظوم 'نامۂ مراد' کے نام سے لکھا۔ اس کی تاریخ ۱۲۰۳ھ ہے اسں میں ذکرِ قبولیتِ اُردو کے تحت یہ شعر لکھا۔[1]

وہ اُردو کیا ہے ؟ یہ ہندی زباں ہے　　　کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے
پسندِ طبع وزراء و شہاں ہے　　　غرض جو کچھ بھی ہے اب اُردو زباں ہے

۵ محمد باقر آگاہ ویلوری نے 'ہشت بہشت' کے نام سے آٹھ رسالے لکھے۔ ان میں ساتویں کا نام 'من درپن' عرف معجزات نبی کریم ہے۔ یہ ۱۲۰۶ھ میں لکھا گیا۔

تھے بارا سو کے اوپر چھے برس جب　　ہوا یہ نسخۂ دلکش مرتب

اسی میں کہتے ہیں۔

اگر بھاکے میں اُردو کے میں کہتا[2]　　　کوئی اس کو بھاں کے لوگوں سے نہ چہتا

'کوئی اس' ملاکر بروزنِ فعل پڑھے، تبھی مصرع موزوں ہوگا۔ اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دکنی شالی ہند کی اُردو سے مختلف گردانتے ہیں۔ بھاکے سے مراد بھاشا یعنی زبان ہے۔

۶ گلکرسٹ نے ۱۷۹۶ء / ۱۲۰۸ھ میں لکھا۔[3]

In the mixed dialect also called OORDOO or the polished language of the Court, and which even at this day per vades the vast provinces of a once powerful empire.

۷ باقر آگاہ نے مثنوی گلزارِ عشق ۱۲۱۱ھ کے دیباچے میں لکھا۔

---

۱ محمد اکرم چغتائی: اُردو بمعنی زبان کے متعلق نئی تحقیق، اُردو نامہ کراچی شمارہ ۲۶ بابت دسمبر ۱۹۶۶ء۔ ص ۳۰

۲ فہرست مخطوطات انجمن ترقی اُردو جلد اوّل مرتبہ افسر صدیقی امروہوی وسید سرفراز علی رضوی کراچی ۱۹۶۵ء ص ۸۶

3. **Gilchrist : A Grammer of the Hindostani Language, 1796, p. 261**
with reference from De Graham Baiby.
"Urdu the name and the Language"
include in The Journal of the Royal Asiatic Society, April 1930 p. 393

بحوالہ مضمون اکرم چغتائی اُردو نامہ ص ۳۰

جب زبانِ قدیم دکنی اس سب سے کہ آگے مرقوم ہوا، اس عصر میں رائج نہیں ہے اسے چھوڑ دیا اور محاورہ صاف و شستہ کو، کہ قریب روزمرہ اُردو کے ہے، اختیار کیا۔[1]

۸ نامۂ مراد کے مصنف مراد شاہ نے ۱۲۱۲ھ چار درویش کا قصّہ مثنوی مراد المحبین میں لکھا۔ اس میں کہتے ہیں۔

یہ قصہ جو ہے چار درویش کا اگر نظم ہو تو بہت ہے بجا
ولیکن ہو اُردو زباں میں بیاں کہ بھاتی ہے ہر ایک کو یہ زباں[2]

یہ سب مثالیں اٹھارویں صدی کے آخر کے ہیں۔ انیسویں صدی میں اس زبان کو عام طور سے اُردو کہا جانے لگا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ کچھ لوگ ہندی یا ریختہ بھی کہتے رہے۔ غالب تک نے کہا۔

جو یہ کہا کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی گفتۂ غالب' ایک بار جا کے' اسے سنا کہ یوں

آغاز کے نظریے

۱۔ سب سے مقبول نظریہ یہ ہے کہ اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے بنی اس نظریے کا ذکر سب سے پہلے میر محمدی مائل دہلوی نے مذکورہ بالا قطعے (قبل ۱۱۷۶ھ) میں کیا۔ اکرم چغتائی نے یہ پورا قطعہ[3] چھاپ دیا ہے۔ اس کے یہ شعر ملاحظہ ہوں۔[4]

گیارہ صدی شروع ہوئی جب کہ جگ منے باہم ہوتے یہ ہندو مسلماں خلا ملا
دربار اکبری میں وہ۔۔۔ بھتے رات دن ہر ہر گلی میں تھا اسی خدمت کا پر تلا

محذوف لفظ 'ملتے' یا 'باہم' ہوسکتا ہے۔ اس کے آگے مائل شہر دلّی کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور اس کے بعد کہتے ہیں

شاہ جہاں کے عہد سے خلقت کے بیچ میں ہندی تو نام مٹ گیا اُردو لقب چلا

---

[1] بحوالہ جمیل جالبی، تاریخ ادب اُردو جلد اول ص ۵۲۴

[2] پنجاب میں اُردو ص ۳۲۷۔ لکھنؤ ۱۹۸۱ء۔ نیز محمد اکرم چغتائی کا محولہ بالا مضمون ص ۳۲

[3] محمد اکرم چغتائی۔ مائل دہلوی کا ایک اہم تاریخی حصہ۔ رسالہ فنون لاہور۔ اکتوبر ۱۹۶۶ء

[4] اکرم چغتائی کا مضمون اردو نام دسمبر ۱۹۶۶ء میں

اس قطعے میں کام کی کتی باتیں کہی گتی ہیں ۔

ا اردو شاعری کی ابتدا گیارہویں صدی ہجری میں ہوئی جب کہ ہند و مسلمان باہم ہو گئے تھے ۔ یہ میل جول دربار اکبری میں خصوصیت سے تھا ۔

دقت یہ ہے کہ شہنشاہ اکبر گیارہویں صدی ہجری سے بہت پہلے ہوا ہے ۔

۲ شاہجہاں کے وقت سے اس زبان کا نام اُردو پڑ گیا ۔

مآئل کے بعد مرزا طپش اس نظریے کو پیش کرتے ہیں ۔ ان کا دیوان "گلزار مضامین" ۱۱۹۹ھ میں مرتب ہوا ۔ اور ہنوز غیر مطبوعہ ہے ۔ اس کی ابتدا میں فارسی میں اُردو زبان کی ابتدا اور ابتدائی اُردو شاعروں کے بارے میں ایک تحریر ہے جس کا اُردو ترجمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے رسالہ اُردو کراچی بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء میں شائع کر دیا ۔ اُردو کی ابتدا سے متعلق طپش کے بیان کا خلاصہ یہ ہے ۔

دہلی میں مسلمانوں کی فتح سے قبل جو زبان بولی جاتی تھی ۔ وہ ہندی الاصل تھی ۔ جب معز الدین سام (شہاب الدین غوری) نے راتے پتھورا کا کام تمام کیا تو اس زبان میں اہل اسلام کے عربی و فارسی الفاظ گھُل مِل گئے ۔ جب محمد شاہ تغلق اہل دہلی کو دولت آباد لے گیا اور واپس لایا تو دکھنی الفاظ بھی دہلی والوں کی زبان میں مِل گئے ۔ شاہجہاں کے شاہ جہاں آباد بنانے کے بعد دہلی کی زبان میں نمایاں فرق ہو گیا ۔ پُرانی ہندی متروک ہو گتی لیکن دکھنی الفاظ جوں کے توں رہے ۔[1]

جیسا کہ نیچے بیان کیا جاتا ہے میر امّن نے بھی اُردو کے آغاز کے سلسلے میں اکبر اور شاہ جہاں کا نام لیا ہے ۔ باغ و بہار کی ابتدا میں انھوں نے اُردو کی جو حقیقت لکھی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے ۔

'جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم حضور میں آکر جمع ہوتے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدا جدا تھی ۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال و جواب کرتے، ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی ۔ جب حضرت شاہجہاں نے شاہجہاں آباد بسایا، وہاں کے بازار کو اُردوئے معلیٰ

---

[1] رسالہ اردو، اکتوبر ۱۹۴۹ء ص ۱۲۱ ۔ ۱۲۲

خطاب دیا، برآن زبان اُردو کی منجتے منجتے ایسی منجی کہ کسی شہر کی بولی اس سے ٹکر نہیں کھاتی ۔

اکبر کا دارالخلافہ آگرہ تھا جو برج بھاشا کا مقام ہے۔ شاہ جہاں دارالسلطنت کو دلّی لے آیا اس لیے دلّی کو اُردو کا آمیزہ تیار ہونے کا مقام قرار دینا بہتر ہے۔ میر امن کے نظریے کو ہو بہو نقل کیا سرسید نے آثار الصنا دید میں، فارسی ظہیرالانشاء کے مصنف نے، امام بخش صہبائی نے رسالہ قواعد اُردو میں اور محمد حسین آزاد نے آب حیات میں[1]۔ ان میں سے کسی نے اکبر کا نام نہیں لیا۔ سب نے شاہجہاں کے عہد میں اُردو کی داغ بیل ڈالی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اُردو کو عربی فارسی اور ہندی کے اختلاط کا نتیجہ قرار دینے کا نظریہ آغاز اُردو کے نظریوں میں سب سے اہم ہے۔ میر محمدی مائل دہلوی، باقر آگاہ (دیباچۂ مثنوی گلزار عشق ۱۲۱۱ھ) اور میر امن سے لے کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں تک کتنے حضرات اس کے شکار ہوتے۔ اس کی بہترین تردید ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کی۔ وہ لکھتے ہیں۔

" ایک نظریہ جسے میں غیر سنجیدہ سمجھتا ہوں کہ اُردو کھچڑی ہے۔ چڑیا لائی چانول کا دانہ، چڑالا یا مونگ کا دانہ، دونوں نے ملکر کھچڑی پکائی۔ عربی فارسی الفاظ مسلمان اپنے ساتھ لاتے۔ ہندوؤں نے ہندی افعال و حروف فراہم کیے۔ ہندو مسلمان کے میل ملاپ سے اُردو نے مغلوں کے زمانے میں یا اس سے کچھ پہلے جنم لیا۔"[2]

سبزواری نے یہ نتیجہ ٹکر اور میکس مولر کے ان اصولوں سے اخذ کیا۔

' زبان دوسری زبان کے الفاظ جتنے چاہے مستعار لے کر اپنا لے' ایک زندہ اور بولی جانے والی زبان غیر زبان کے صرفی نحوی قاعدے اور تعمیری اصول کبھی نہیں اپناتی۔ یہ زبان کی فطرت اور اس کے مزاج کے خلاف ہے۔ زبان کی تاریخ

---

[1] پنجاب میں اردو ص ۵۲ ۔ ۵۳

[2] شوکت سبزواری، 'داستانِ زبان اردو' ص ۴۴ ۔ چمن بکڈپو۔ اردو بازار ۔ دہلی

اسے جھٹلاتی ہے۔ ملکر[1]

زبانوں کی تقسیم اور ان کے رشتوں اور قرابتوں کی تعین، ان کی صرفی و نحوی ساخت کے مطابق کی جاتی ہے۔ فرہنگ الفاظ کی اس سلسلے میں کوئی اہمیت نہیں۔

میکس مولر[2]

یہ تسلیم کہ صرفی نحوی ساخت نہایت اہم ہے لیکن لغظیات میں بنیادی الفاظ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے بنیادی الفاظ یہ ہیں۔

۱ بنیادی الفاظ مثلاً آنا، جانا، کھانا، پینا، چلنا، بیٹھنا، سونا وغیرہ
۲ بنیادی اعداد مثلاً ایک، دو، تین، دس، بیس، سو وغیرہ
۳ بنیادی رشتے، ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی وغیرہ
۴ اہم اعضائے جسم مثلاً آنکھ، ناک، کان، منھ، ہاتھ، پاؤں وغیرہ
۵ بنیادی ضمیر مثلاً میں، ہم، تو، تم، وہ وغیرہ
۶ بنیادی حروف مثلاً کو، سے، تک، پر، میں وغیرہ

ایک خاندان کی زبانوں میں ان الفاظ میں ضرور مماثلت ہوگی۔ شوکت سبزواری نے میکس مولر کے اصول کو ذہن میں رکھ کر دو قابل قدر اصول پیش کیے۔

۱ " ایک غلط فہمی جسے میں سب سے زیادہ خطرناک اور لسانی بحثوں میں حقیقت سے بھٹکانے والی سمجھتا ہوں۔ یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ دو یا دو سے زیادہ زبانوں کو جوڑ کر کوئی تیسری زبان وضع کی جا سکتی ہے جو پہلی دو زبانوں سے جدا اور آزاد ہو۔ دو یا دو سے زیادہ رنگوں کی آمیزش سے ایک نیا اور دونوں سے مختلف رنگ ضرور تیار کیا جا سکتا ہے لیکن دو زبانوں کی ترکیب سے کسی تیسری نئی زبان کی تعمیر ناممکن ہے۔ زبان نامی اور ذی حیات چیز ہے جو دوسری نامی چیزوں

---

1. T.G. Tuckee : Natural History of Language p. 102

بحوالہ داستان زبان اردو ص ۶۰

2. Max Muller : Science of Language, 2nd lecture, p. 86-90
Smith Edition

داستان زبان اردو ۳۰

کی طرح مسلسل تغیر و ارتقا کے زیر اثر وجود میں آتی۔ پاس پڑوس کی زبانوں سے
غذا حاصل کر کے ان کی فضا میں سانس لے کر وہ فربہ اور قوی تو ہو سکتی ہے لیکن
اس کے ساتھ مل کر کسی تیسری زبان کو جنم دینا اس کے بس کی بات نہیں"۔[1]

۲۔ زبان یک بیک وجود میں نہیں آتی۔ اس میں ارتقا ہوتا ہے۔ زبان زمان
کی کوکھ سے پیدا ہوتی ہے، لوگوں کا یہ سمجھنا غلط ہے کہ زبان آپ ہی آپ پیدا ہوتی
کسی ایک زبان کے موجودہ روپ کو لے کر یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ یہ قدیم ترین زبان
ہے۔ زبان کا آغاز جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس کے موجودہ خدوخال کا ابھرنا اور
نمایاں ہونا ہے کہ وہ اپنی اصل سے ممتاز ہو جاتے۔ اور اس میں اور اس کی ہمسر
بولیوں میں فرق کیا جا سکے۔ اگرچہ اس ابھار اور نکھار کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں
کی جا سکتی لیکن ہر زبان کی زندگی میں ایک ایسا دور آتا ہے جب اس کے خدوخال
اور اس کی امتیازی خصوصیات اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہیں . . . . .
. . . . کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا آغاز اس دور کے لگ بھگ ہوا۔ زبان کے آغاز
کے اس کے سوا کوئی معنی نہیں لیکن اگر غور سے دیکھا جاتے تو یہ آغاز نہیں ارتقا ہے۔[2]

تاریخی و تقابلی لسانیات کے یہ ایسے مسلمات ہیں جن کے لیے کسی ثبوت کی
ضرورت نہیں۔ ان کی روشنی میں اُردو کے آغاز کے وہ تمام نظریے باطل ہو جاتے
ہیں جن میں اُردو کے کئی زبانوں یا بولیوں کے اختلاط سے ماخوذ کیا گیا ہے۔ ان
میں سے کوئی ایک اُردو کی اصل ہوگی جس سے اُردو کا ارتقا ہوا۔ بقیہ سب کا ذکر
یا انھیں کوئی اہمیت دینا بے سود ہے۔

میر امن اور ان کے مقلدین سر سیّد، صہبائی وغیرہ یہ واضح نہیں کرتے کہ
شاہجہاں کے دور میں بازار میں اُردو کن کن زبانوں کے میل سے بنی ان کا زور
بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کے اختلاط پر ہے، ان کی جو بھی زبانیں رہی
ہوں گی۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو مرکب تیار کرنے والی زبانوں میں سے ایک کسی

---

[1] داستان زبان اُردو ۔ ۳۶-۳۷
[2] ایضاً

زبان پر (مثلاً پنجابی، ہریانی، برج) پر زور دیتے ہیں۔ تیسرے وہ ہیں جو اختلاط کے مقام سے زیادہ انس رکھتے ہیں۔ ان میں لسانیات سے ناواقفین کے علاوہ چند ماہرین لسانیات بھی ہیں۔

گزشتہ اوراق میں کھڑی بولی اور ہندی کے سلسلے میں کچھ ایسے اقوال درج کیے جا چکے ہیں جن میں انھیں برج سے ماخوذ یا اس پر مبنی کہا گیا ہے۔ اُردو کے سلسلے میں بھی بعض کی یہی رائے تھی۔ چند اقوال

۱ ہندوستان میں زبان ہندی کہ اسے برج بھاکا کہتے ہیں رواج رکھتی تھی۔ اگرچہ لغت سنسکرت ان کی اصل اصول اور مخزن فنون فروغ و اصول ہے، پیچھے محاورۃ برج میں الفاظ عربی و فارسی بتدریج داخل ہونے لگے۔ اور اسلوب خالص کو اس کو کھونے لگے جب سے اس آمیزش کے یہ زبان ریختہ مسمیٰ ہوتی۔ (باقر آگاہ: دیباچہ مثنوی گلزار عشق ۱۲۱۱ھ[۱])

۲ انیسویں صدی کے نصف دوم میں ہورنلے (Hoernle) نے گوڑی (Godian) زبانوں کی گرامر لکھی۔ اس میں لکھتے ہیں۔

" اُردو مقابلۃً حال کی پیداوار ہے۔ دہلی کے نواح میں مسلم اقتدار کا مرکز تھا اُردو بارہویں صدی عیسوی میں پیدا ہوئی۔ یہ علاقہ برج مارواڑی، پنجابی کے لیے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقامی باشندوں اور مسلمان سپاہیوں کے اختلاط و ارتباط سے ایک ملی جلی زبان وجود میں آئی جو صرفی نحوی اصول کی حد تک برج ہے اگرچہ اس میں پنجابی اور مارواڑی کی آمیزش بھی ہے۔ اس کے کچھ الفاظ دیسی ہندی ہیں اور کچھ الفاظ بدیسی یعنی فارسی و عربی[۲]"

انھوں نے اُردو کو خاص طور سے برج پر مبنی بتایا ہے۔ ان کا یہ مشاہدہ صحیح نہیں کہ اُردو یا کھڑی بولی صرفی و نحوی کی اصول کی حد تک برج ہے۔ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ ہورنلے ہی سے متاثر ہو کر آزاد نے آب حیات کی بسم اللہ ان

---

[۱] بحوالہ تاریخ ادب اردو جلد اول از جمیل جالبی ص ۵۲۳

[۲] گرام آف دی گوڈین لنگویج۔ مقدمہ ص ۷۔۶۔ بحوالہ داستان زبان اردو ص ۵۴

الفاظ سے کی۔

" اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے"۔[1]

آزاد کے دوسرے مقلد شمس اللہ قادری ہیں۔ ان کی اُردوئے قدیم کا ایڈیشن ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں۔

" مسلمانوں کے اثر سے برج بھاشا میں عربی فارسی الفاظ داخل ہونے لگے جس کے باعث اس میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد اردو زبان کی صورت کرلی"[2]

مخلوط زبان کے نظریے ڈاکٹر شوکت سبزواری واضح کرچکے ہیں کہ اُردو یا کھڑی بولی برج بھاشا سے اس لیے نہیں نکلی کہ اس میں اور برج بھاشا میں متعدد اختلافات ہیں جن میں سے اہم ترین یہ ہے کہ اُردو میں آ کا لہجہ غالب ہے برج میں اُو کا۔ اُردو کو تشدید سے عار نہیں جب کہ برج میں یہ شاذ ہے۔ دونوں کے صرفی اصول، ضمائر وغیرہ میں کافی فرق ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے پنجاب میں اُردو میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمہ تاریخ زبان اُردو میں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے داستان زبان اُردو میں تفصیل سے دکھایا ہے۔ ان کی شرح تحصیل حاصل ہوگی۔ ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی نے کھڑی بولی اور برج کے دو خاص فرق بتاتے ہیں[2]

۱ برج میں اُو کا لہجہ اور کھڑی بولی میں آ کا لہجہ۔

۲ اتصالی ضمیروں کا فرق۔ کھڑی میں اِس، جس، کِس، اُس۔ برج میں یا، جا، کا، وا۔

ہورنلے کے بعد گریرسن نے ۱۸۸۰ء کے ایک مضمون میں اُردو کو مخلوط زبان قرار دیا۔

" اُردو قواعد اور فرہنگ الفاظ کے لحاظ سے مخلوط عام اور مشترک زبان ہے

---

[1] اُردوئے قدیم ص ۶، طبع ۱۹۶۷ء لکھنؤ بار سوم

[2] اُردو ترجمہ از عتیق صدیقی۔ ہند آریائی اور ہندی ص ۱۰۳

اس میں شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے علاوہ فارسی، ترکی، تیلگو زبان کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کے صرفی نحوی قواعد نے شمالی ہند کی عام بولیوں سے خوشہ چینی کی ہے اس لیے یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کسی ایک مخصوص اور معین زبان سے ترقی پاکر بنی ہے [1]"

لیکن بعد میں لسانیاتی جائزۂ ہند میں انھوں نے اپنے فیصلے میں ترمیم کی اور راہ راست پر آگئے۔ لکھتے ہیں۔

ہندوستان کے آغاز کے بارے میں آج تک اہل علم نے (جن میں میں خود بھی شامل ہوں) جو کچھ لکھا ہے میرامن کے دیباچہ باغ و بہار سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔ میرامن کے بیان کے مطابق اُردو ان مختلف لوگوں کی بولیوں کی معجون مرکب ہے جو دہلی کے بازاروں میں جمع ہوگئے تھے۔ اس غلط فہمی کو اوّل اوّل سر چارسن رایل نے ۱۸۸۰ء میں دور کیا۔ ہندوستانی زبانوں کے تفصیلی جائزے نے اب اس کو ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستانی (یعنی اُردو) بالائی دوآبے اور مغربی روہیلکھنڈ کی (بول چال کی) زبان ہے۔ اُن گھڑ اور گنوارو الفاظ و محاورات نکال کر جسے ادبی نکھار و سنگھار دے دیا گیا ہے [2]

گریرسن کا یہ فیصلہ سائنٹیفک مطالعے کا نتیجہ ہے اور صحیح ہے۔ پہلا فیصلہ تاثراتی تھا اور غلط تھا۔

بہرحال میرامن کا اختلاط کا نظریہ مقبول و جاری رہا۔ مختلف زبانوں اور علاقوں سے اُنس رکھنے والے اُردو علما نے سوچا کہ اگر اُردو بیرونی مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبان کے میل سے بنی ہے تو اس کی تخصیص دلی اور عہد شاہجہانی ہی سے کیوں کی جاتے۔ اس منتر کا اطلاق دوسرے مقامات اور دوسری زبانوں پر کیوں نہ کیا جاتے۔

۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب 'پنجاب میں اُردو' شائع ہوئی۔

---

[1] کلکتہ ریویو جلد ۱، بابت ۱۸۸۰ء ص ۱۵۶۔ بحوالہ داستان زبان اردو ص ۵۵

[2] لسانی جائزۂ ہند جلد ۹ حصہ اوّل ص ۴۴ حاشیہ۔ بحوالہ داستان زبان اردو ص ۵۶

اس کی اہمیت ادبی تاریخ و تحقیق کے لحاظ سے بہت کم اور لسانی تحقیق کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔ عرض حال میں وہ لکھتے ہیں۔

اُردو زبان کے آغاز کا سرزمین پنجاب سے منسوب کرنا کوئی نیا نظریہ یا عقیدہ نہیں ہے۔ اس سے پیشتر . . . . . شیر علی خانصاحب اپنے پُر لطف تذکرہ اعجاز سخن میں اس قسم کے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔

شیرانی کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے

مسلمانوں نے سب سے پہلے سندھ میں حکومت قائم کی۔ یہ ممکن ہے کہ وہاں انھوں نے کوئی ہندوستانی زبان اختیار نہ کی ہو لیکن پنجاب میں جہاں ان کی حکومت کم و بیش ۱۷۰ سال تک رہی وہاں انھوں نے سرکاری، تجارتی و معاشی اغراض سے کوئی نہ کوئی ہندوستانی زبان اختیار کی ہو گی۔ اسی زبان کو وہ دلّی لے آتے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان کے آنے سے پہلے دلّی میں کون سی زبان بولی جاتی تھی ؟ وہ راجستھانی ہو گی یا برج۔ غالبًا برج تھی۔ لاہور سے جو زبان آئی وہ پنجابی سما اُردو یا اُردو سما پنجابی رہی ہو گی۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہی اور رفتہ رفتہ اُردو کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

شیرانی نے اپنا نظریہ 'پنجاب میں اُردو' کے مقدمے میں بیان کر دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ انھیں اُردو سے قبل کی لسانی صورت حال کی کوئی واقفیت نہ تھی۔ لکھتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مغربی ہندی جس کی برج بھاشا، ہریانی، راجستھانی، پنجابی اور اُردو شاخیں ہیں۔ قدیم پراکرت شورسینی کی یادگار ہے۔

لیکن جس زبان سے اُردو ارتقا پائی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔[۱]

وہ تاریخی لسانیات کی مبادیات تک سے اتنے بے خبر ہیں کہ مغربی ہندی

---

[۱] پنجاب میں اُردو۔ نسیم بک ڈپو ستمبر ۱۹۸۱ ص ۱۸

میں راجستھانی اور پنجابی کو بھی شامل کر بیٹھے۔ کاش اس کی شاخوں میں وہ اُردو کی جگہ کھڑی بولی لکھ دیتے تو صحیح خطوط پر چلتے۔ انھوں نے قنوجی کا بھی نام لیا ہے لیکن محض اٹکل پچو۔ انھیں ماقبل اُردو کی زبانوں اور اس کے علاقوں کا کوئی تصور نہیں وہ دیکھتے ہیں کہ سہارنپور اور میرٹھ میں سولہویں سترہویں صدی عیسوی کے شعرا عبدالقدوس گنگوہی اور مخدوم بہاء الدین برناوی نے برج میں شاعری کی ہے اور اس کی بنا پر یہ نتیجہ نکال لیا کہ "اب سے تین صدی پیشتر اس علاقے کی یہ زبان نہ تھی بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔"[1]

مسلمانوں کی آمدِ دہلی یعنی بارہویں صدی عیسوی کی زبان وہ سولہویں سترہویں صدی کے نمونوں کی بنا پر طے کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی نہیں جانتے کہ برج میں ملک بھر میں شاعری ہوتی ہے۔ بالخصوص کرشن بھگتی کی شاعری۔ اس کی بنا پر برج کو ان علاقوں کی زبان قرار نہیں دے سکتے، بالکل اسی طرح جیسے بنگال کے شعرا تورودت، اروندو گھوش اور ٹیگور کی انگریزی شاعری کے پیش نظر بنگال کی زبان انگریزی نہیں طے کی جاسکتی یا انیسویں صدی میں غالب کی فارسی شاعری اور بیسویں صدی میں اقبال کی فارسی شاعری کو دیکھ کر دلی یا پنجاب کی زبان فارسی نہیں مانی جاسکتی۔

شیرانی کا یہ خلفشار تو دیکھیے کہ ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں۔

"لیکن جس زبان سے اُردو ارتقا پائی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی اور نہ قنوجی ہے۔ وہ زبان ہے جو صرف دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔"[2]

دوسری طرف وہ یہ لکھتے ہیں

"اُردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے۔"[3]

اور پھر کہتے ہیں

---

[1] 'پنجاب میں اردو' نسیم بک ڈپو ستمبر ۱۹۰۱ء ص ۱۹

[2] ایضاً ص ۱۸۔

[3] ایضاً ص ۱۶

دہلی میں یہ زبان (مسلمانوں کے ساتھ پنجاب سے آئی ہوئی زبان) برج اور دوسری زبانوں کے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اُردو کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے [1]

اگر اُردو اس زبان سے بنی ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی تو وہ پنجاب سے مسلمانوں کے ساتھ دہلی کیونکر آئی۔ ایک طرف وہ برج کو اُردو کی ساخت سے بالکل بے دخل کر دیتے ہیں دوسری طرف اُردو کو پنجاب سے آئی ہوئی زبان اور برج کے آمیزے سے تیار کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اُردو کی بنیادی زبان دہلی اور میرٹھ کی بولی کو نہیں مانتے۔ انھیں اس کے خدوخال کے بارے میں اندازہ ہی نہیں۔ وہ صرف یہ مانتے ہیں کہ اُردو قدیم پنجابی سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ وہ اپنا پورا زور قدیم اُردو اور پنجابی کی مماثلت دکھانے میں صرف کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر گراہم بیلی بھی شیرانی سے متفق ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"۱۰۲۷ء کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئی۔ قدیم پنجابی اس کی ماں ہے اور قدیم کھڑی بولی مادر (سوتیلی ماں) برج سے براہ راست اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ مسلمان سپاہیوں نے پنجابی کے اس روپ کو جو ان دنوں دہلی کی قدیم کھڑی بولی سے زیادہ مختلف نہ تھا اختیار کیا اس میں فارسی الفاظ اور فقرے شامل کر دیے"[2]

گراہم بیلی صاحب شیرانی سے بھی تیز ہیں۔ انھوں نے صریحاً اُردو کو قدیم پنجابی سے پیدا کیا لیکن جب کہ شیرانی نے اس میں برج کی آمیزش کی تھی بیلی نے کھڑی بولی کو شامل کیا۔ یہ بھی شیرانی کے تضاد کا شکار ہیں کہ ان کی طرح اُردو کو اول لاہور میں پیدا کرتے ہیں بعدہٗ دلی میں۔ انھوں نے اُردو کے آغاز کا سنہ ۱۰۲۷ء طے کیا جب کہ کسی اور نے اُردو کو مسلمانوں کی فتح دلی سے پہلے قیاس نہیں کیا۔

---

[1] 'پنجاب میں اُردو' نسیم بک ڈپو ستمبر ۱۹۸۱ ص ۲۲

[2] جرنل رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۳۰ء ص ۳۹۱ بحوالہ داستانِ زبانِ اُردو ص ۵۷

اُردو یا کھڑی بولی کے آغاز میں پنجابی کا کوئی حصہ رہا ہے۔اس کی تردید ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے مقدمۂ تاریخ زبان اُردو میں اور ڈاکٹر سبزواری نے داستان زبان اُردو میں کی ہے۔ دونوں نے پنجابی اور اُردو کے صرفی و نحوی اختلافات اجاگر کیے ہیں۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کے دلائل زیادہ مضبوط ہیں جن میں سے کچھ یہ ہیں۔

ا۔ پنجابی اور اُردو میں اہم صوتی و صرفی اختلافات ہیں مثلاً پنجابی میں ݨ اور اُردو میں ن ہے۔ پنجابی میں دو حرکات کا اجتماع ہوتا ہے مثلاً گھوڑی آں، اُردو میں نہیں ہوتا، پنجابی میں ہائے مخلوط کو حذف کرنے کا رجحان ہے۔ پنجابی کا میلان تشدید کی طرف ہے جب کہ اُردو اس معاملے میں اعتدال پسند ہے۔ پنجابی میں دو حرفی لفظوں میں تشدید آتی ہے اور یہ لفظ مشدّد الآخر ہوتے ہیں جب کہ اُردو میں عربی کے چند الفاظ (مثلاً ردّ) کو چھوڑ کر ایسا نہیں ہوتا۔

ب۔ پنجابی اور اردو کے مختلف فیہ سرمایہ میں اُردو کی بعض چیزیں قدیم تر ہیں مثلاً اُردو کے س کو پنجابی میں ہ (ہائے ہوّز) میں بدل دیا جاتا ہے جیسے سسرا سے سوہرا، بیس سے بیہ یا محض بی۔ س سنسکرت اور پراکرت وغیرہ میں بھی ہے، پنجابی میں ترمیم ہوتی ہے۔ اُردو کرتا اور پنجابی کردا میں ت قدیم تر ہے کہ یہ سنسکرت میں بھی تھا مثلاً بٹھتِ (بڑھتا ہے)

تفصیل کے لیے مسعود حسین خاں اور شوکت سبزواری کی کتابیں دیکھیے جس کے بعد شک نہیں رہتا کہ اُردو یا کھڑی بولی پنجابی سے مختلف ہے۔ بیلی نے یہ بھی کہا کہ اس عہد میں پنجابی اُردو سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ ایسا ہی ڈاکٹر زور کا عقیدہ ہے۔

شیرانی کے بعد ڈاکٹر زور نے اپنا نظریہ پہلے اپنی انگریزی (Hindustani Phonetics) میں اور پھر اردو کتاب ہندوستانی لسانیات میں پیش کیا۔ انگریزی کتاب پر تاریخ طباعت درج نہیں لیکن ڈاکٹر زور کا مقدمہ ۱۹۳۰ء کا ہے جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کتابچے کی اشاعت ۱۹۳۰ء ہی میں ہوگئی ہوگی۔ اس کے صفحہ ۱۹ تا ۲۱ پر دیے ہوئے ان کے نظریے کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

اُردو کی بنیاد مسلمانوں کی فتح دہلی سے پہلے ہی پڑ گئی تھی لیکن اس فتح سے قبل

اُردو کو زبان کی حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس زبان سے ماخوذ ہے جو ہند آریائی عہد کی ابتدا میں صوبۂ سرحد اور الہ آباد کے بیچ بولی جاتی تھی۔ یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ پنجاب کی بارہویں صدی کی زبان پر مبنی ہے لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ اس زبان پر مبنی نہیں جو دلی اور گنگا جمنا کے دوآبے میں بولی جاتی تھی کیونکہ جدید ہند آریائی عہد کی ابتدا میں پنجاب اور دلی کے قریبی اضلاع کی زبان میں بہت کم فرق رہا ہوگا۔ . . . بارہویں صدی کے بعد ہی جدید زبانوں میں امتیازی اختلافات پیدا ہوئے۔ پنجاب اور دلی کی زبانوں میں یہ فرق اتنا نمایاں ہوگیا کہ ایک جگہ یہ پنجابی بن گئی، دوسری جگہ کھڑی بولی۔ اُردو نہ پنجابی سے نکلی ہے نہ کھڑی بولی سے۔ بلکہ ان دونوں کے مشترک ماخذ سے۔ اس لیے بعض خصوصیات میں یہ پنجابی سے مماثل ہے اور بعض میں کھڑی بولی سے۔

ڈاکٹر زور نے یہی بات انھیں الفاظ میں ہندوستانی لسانیات میں ص ۱۱۵۔ ۱۱۴ پر دہرائی ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر زور اُردو کو کھڑی بولی سے الگ کر کے اس کی اصل تلاش کر رہے ہیں۔

عجیب تر یہ ہے کہ ڈاکٹر سنتی کمار چیٹرجی ڈاکٹر زور کی جزوی تائید کرتے ہیں ہند آریائی اور ہندی میں لکھتے ہیں۔

" وہ زبان جو انھوں (مسلمانوں) نے سب سے پہلے اختیار کی قدرتی طور پر پنجاب کی مروج زبان تھی۔ آج پنجاب کی بولیوں میں خاص طور پر مشرقی پنجاب اور اترپردیش کے انتہائی مغربی علاقوں کی بولیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ آٹھ نو سال پہلے یہ فرق اور بھی کم ہوگا۔ امکان ہے کہ وسطی اور مشرقی پنجاب (اگر مغربی پنجاب اور ہندو افغانستان کو الگ کر دیا جائے) نیز مغربی اترپردیش میں تقریباً یکساں بولی رائج ہوتی۔"[1]

مشرقی پنجاب سے ڈاکٹر چیٹرجی کی مراد ہریانے کا علاقہ ہے، اور وسطی پنجاب

---

[1] ہند آریائی اور ہندی، اُردو ترجمہ ص ۱۶۰

سے جالندھر، امرتسر اور لاہور کا۔ ہند وافغانستان سے مراد ہے غیر منقسم ہندوستان کا پٹھانوں والا حصہ یعنی صوبۂ سرحد۔ چٹرجی نے لاہور سے مغربی یوپی تک کی زبان کی یکسانی قیاس کی ہے لیکن ڈاکٹر زور نے دونوں انتہاؤں کو بڑھا کر پیشاور (پشتو یعنی ایرانی خاندان کی زبان) اور الہ آباد (اودھی) تک پہنچا دیا ہے۔ یہ ماضی کے لسانی نقشے سے چشم پوشی ہے۔ سنسکرت عہد ہی میں مغرب اور وسطی ہند میں مختلف بولیاں تھیں جنھیں اویچیہ اور مدھیہ دیشیہ کہا جاتا ہے۔ اشوکی پراکرتوں سے بھی بولیوں کے تنوع کا پتہ چلتا ہے۔ اس وسیع علاقے کی پراکرتیں اور اپ بھرنشیں بھی مختلف تھیں۔ صوبہ سرحد کا علاقہ ہند آریائی ہے ہی نہیں۔ یہ ایرانی ہے۔ اس کے مشرق میں کیکیہ اپ بھرنش (مغربی پنجاب)، ٹکی اپ بھرنش (مشرقی پنجاب)، شورسینی اپ بھرنش (ہریانہ اور مغربی یوپی) اور اردھ ماگدھی اپ بھرنش (مشرقی پنجاب)، کا بنور الہ آباد وغیرہ) رائج تھیں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ ان سب اپ بھرنشوں پر بُل ڈوزر (Bull dozer) چل کر گیا رہویں، بارہویں صدی عیسوی میں یہ ایک ہی زبان بن گئی ہوں۔ اب بھرنشوں کے پیش نظر کہا جاتے کہ جدید ہند آریائی دور میں ان علاقوں کی زبانوں کا فرق نمایاں ہو گیا ہو گا۔

سید سلیمان ندوی کے خطبات کا مجموعہ نقوش سلیمانی کے نام سے شائع ہوا۔ انھوں نے سوچا کہ جب اُردو نو وارد مسلمانوں اور مقامی ہندوؤں کی زبانوں کے میل کا نتیجہ ہے تو یہ اعزاز دہلی اور لاہور کو کیوں دیں ان سے بھی پہلے چل کر سندھ کو کیوں نہ دیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں۔

"مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں۔ اس لیے قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اُردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہو گا"۔[1]

ہندو مسلمان کے میل کا نسخہ ایسا ہے کہ یہ کہیں بھی، کسی بھی زمانے میں ہوا ہو اس ملاوٹ کا نتیجہ اُردو ہی رہا ہو گا۔ سید صاحب کو اس سے غرض نہیں کہ سندھ میں آنے والے مسلمانوں کی زبان عربی تھی اور سندھ کے ہندوؤں کی زبان براچڑا اپ بھرنش

---

[1] نقوش سلیمانی ص ۳۰

ان کے میل سے سندھی زبان بن سکتی تھی اُردو نہیں۔

نصیر الدین ہاشمی کی کتاب دکن میں اُردو کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا۔ میرے سامنے اس کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۳۶ء کا ہے۔ اس میں انھوں نے محمود شیرانی، ڈاکٹر چٹرجی اور ڈاکٹر زور وغیرہ کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا۔ لکھتے ہیں کہ اُردو کی ابتدا چار مقامات سے منسوب کی جاتی ہے۔

۱۔ پنجاب، ۲۔ سندھ، دکن، ۴۔ دوآبہ گنگا جمنا۔

چونکہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی۔ اس لیے جن اصحاب کا یہ دعوا ہے کہ اس کی ابتدا سندھ اور دکن سے ہوئی وہ ایک حد تک غلط نہیں ہوسکتا (طبع سوم ص ۱۶) پھر وہ سندھ کو اس لیے رد کرتے ہیں کہ وہاں کے عربی فاتحوں کی زبان عربی تھی، فارسی نہیں۔ وہاں عربی اور شورسینی کے میل سے کوئی زبان بن سکتی تھی جو اُردو نہ ہوتی۔ یہی دقت انھیں دکن کے دیسی باشندوں کی زبان کے پیش نظر محسوس ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

" جو امور سندھ سے اُردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع نظر آتے ہیں اس لیے ہم دکن کو بھی اُردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔"

لیکن یہ تضاد بیانی دیکھیے کہ آگے چل کر وہ اُردو کے آغاز کا سرا دکن کے سر باندھتے ہیں۔ دکنی نثر کی ابتدا کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں۔

" اس امر کا ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اُردو احاطہ تحریر میں کب آئی مگر بلا خوف تردید یہ دعوا کیا جاسکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گزر کر تحریری صورت میں بھی آئی۔ ص ۲۶۔

شاید وہ یہاں اُردو کے تحریری روپ ہی کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ بیان ان کے پہلے عقیدے کو پیش کرنا ہو اور ص ۱۹ کا بیان ترمیم شدہ فیصلے کو جو دوسروں کی تحقیقات کے مطالعے کے بعد طے ہوا۔

اب تین ماہرین لسانیات کے نظریات پر غور کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے لیجیے ڈاکٹر مسعود حسین کے نظریے کو جو انھوں نے اپنی کتاب

مقدمہ تاریخ زبان اُردو میں پیش کیا۔ یہ ان کے پی ایچ ڈی کے مقالے کے ابتدائی ابواب ہیں۔ یہ کام انھوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل کیا تھا۔ جب لسانیات پر ان کی نظر زیادہ گہری نہ ہوگی۔ ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو میواتی، کامبرج، ہریانوی اور کھڑی بولیوں سے مل کر بنی ہے۔ اب تک انھوں نے اپنے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ چونکہ وہ اُردو نیز لسانیات کے پروفیسر رہ چکے ہیں اس لیے ان کے نظریے کی بڑی دھاک ہے اور اسے بغیر چوں چرا کے قبول کرلیا جاتا ہے لیکن میری راتے میں اس نظریے کے کئی حصے محل نظر ہیں اور اس سے غلط فہمی کی ہوا پھیل گئی ہے۔ مجھے ان سے ذیل کے اختلافات ہیں۔

۱۔ وہ زبان اور بولی کے تعلق کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ شوکت سبزواری لکھتے ہیں۔

زبان کی متعدد نئی شاخوں اور کونپلیں پھوٹتی ہیں جو اس زبان کی بولیاں کہلاتی ہیں۔ زبان اصل ہوتی ہے اور بولیاں اس کی شاخیں۔ زبان سرچشمے کی حیثیت رکھتی ہے اور بولیاں چھوٹی چھوٹی نالیوں یا جدولوں کی طرح اِدھر اُدھر پھیلتی جاتی ہیں۔[۷]

بولی یا بولیوں کا تصوّر زبان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ وسیع زبانوں کے تحت کئی بولیاں ہوتی ہیں جن میں سے کوئی ایک بولی بعض وجوہ سے اہم ترین ہوجاتی ہے اور اسے معیاری زبان کہا جاتا ہے۔ مناسب یہ ہوتا کہ اسے معیاری بولی کہا جاتا۔

دوسرا پہلو ہے کسی زبان کے تقریری اور تحریری روپ کا فرق۔ لسانیات میں محض تقریری روپ معتبر ہے۔ بولیوں کا اٹلس بنانا ہو یا لسانیاتی جائزہ لینا ہو اس میں یہی دیکھا جاتا ہے کہ اس علاقے میں کیا بولا جاتا ہے۔ وہاں کے اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں کون سی زبان اور اس کے کس معیار کا استعمال ہوتا ہے غیر متعلق ہے۔ تحریری روپ تقریری روپ سے زیادہ باقاعدہ، شستہ، پابند اور مصنوعی

---

۷ داستان زبان اُردو ص ۳۶۔۳۵

ہوتا ہے لیکن ہیں دونوں ایک ہی زبان کی دو سطحیں، دو الگ زبانیں نہیں۔ بولنے میں عجلت کے یا خاندانی عادت کے سبب ہم بعض لفظوں کے تلفظ میں تبدیلی کر لیتے ہیں (میں مسخ کرنا نہیں کہوں گا) تحریر میں لفظوں کو سالم اور لغت کے مطابق لکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوا، زبان تو وہی ہے۔ ہندوستانی ہو کہ انگریزی، پنجابی ہو کہ بنگالی، بول چال کی زبان اور سادہ سے سادہ تحریری زبان میں کچھ نہ کچھ فرق ہوتا ہے

۱۹۶۷ء میں سری نگر میں انجمن اساتذۂ اُردو، جامعات ہند کی کانفرنس ہوئی۔ وہاں دوران گفتگو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کہا کہ جس زبان میں تحریری سوا د بالخصوص نثری ادب نہ ہو وہ زبان نہیں بولی ہے۔ اور اس کے بعد انھوں نے شدت سے کہا "کشمیری زبان نہیں بولی ہے بولی"۔ اور یہ کہہ کر کشمیریوں کو ناراض کر دیا۔ میری رائے میں یہ سخت غلط فہمی اور غلطی ہے۔ منگولوں، ریڈ انڈینوں غیر متمدن قبیلوں کی زبانوں کو ہر لسانی جائزے میں 'زبان' شمار کیا جاتا ہے۔ بولی (dialect) نہیں۔ بولی زبان کے تابع ہوتی ہے۔ بعض زبانیں اتنی مختصر ہوتی ہیں کہ وہ ایک ہی بولی پر مشتمل ہوتی ہیں۔

اُردو اور کھڑی بولی میں بھی تحریر و تقریر کا فرق ہے۔ کھڑی بولی کے دو تحریری روپ ہیں اُردو اور ہندی لیکن اس سے یہ لسانیاتی اعتبار سے مختلف زبانیں نہیں ہو جاتیں۔

کچھوے نے خرگوش سے کہا
میں گھر جا رہا ہوں
آج بہت ہوا چل رہی ہے
جیسا راجا ویسی پرجا

یہ سب جملے کھڑی بولی بھی ہیں، اُردو بھی، ہندی بھی، ڈاکٹر صاحب سمجھتے ہیں کہ کھڑی بولی صرف اسے کہتے ہیں جو دلی، گنگا جمنا کے دوآبے اور شمالی روہیلکھنڈ میں مسخ تلفظ کے ساتھ بولی جاتی لیکن تلفظ مسخ ہو کہ مطابق لغت، زبان تو ایک ہی رہتی ہے۔

	کالم ا	کالم ب
۱	تسے ئی تو کے ریا ہوں اس وک مفتوح)	بھ سے ہی تو کہہ رہا ہوں
۲	ابھی دیکھتیں	ابھی دیکھتے ہیں
۳	مُرغیں (دوسری یا مجہول) کاں گئیں	مُرغیاں کہاں گئیں

ان میں صرف کالم 'ا' کے جملے ہی کھڑی بولی نہیں 'ب' کے جملے بھی سو فیصدی کھڑی بولی ہیں۔ یہ دو زبانیں نہیں ایک زبان کی مختلف سطحیں ہیں۔ کھڑی بولی اور اُردو کا یہی رشتہ ہے۔ کھڑی بولی بنیاد ہے۔ اُردو اس روپ سے جدا کوئی چیز نہیں۔ مہاتما گاندھی نے ایک بار بقول مولوی عبدالحق ہندی اور ہندوستانی کا یہ فرق بتایا تھا کہ ہندی لکھی جاتی ہے بولی نہیں جاتی۔ ہندوستانی بولی جاتی ہے لکھی نہیں جاتی۔ مولوی عبدالحق نے اس پر طنز کرتے ہوتے کہا تھا کہ اُردو وہ زبان ہے جو لکھی بھی جاتی ہے بولی بھی جاتی ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ کھڑی بولی محض بولی جاتی ہے لکھی نہیں جاتی جب کہ معیاری اُردو لکھی جاتی ہے بولی نہیں جاتی۔ وہ کھڑی بولی کے لیے ہندوستانی اور دہلوی کے لفظ استعمال کرتے ہیں۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی۔ (ص ۸۹)

کھڑی بولی (ہندوستانی یا دہلوی) (ص ۱۲۶)

لیکن اُردو کو اس سے الگ سمجھتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

قدیم اُردو کی تشکیل براہ راست ہریانی کے زیرِ اثر ہوتی۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں۔[1]

'زبان دہلوی کھڑی بولی کا ارتقا اگر ایک طرف اُردو کی شکل میں خسرو اور دیگر صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔۔۔'[2]

میری راتے میں اُردو کا آغاز کھڑی بولی کے آغاز کے سوا کچھ نہیں۔ وہ کبھی

---

[1] مقدمہ تاریخ زبان اُردو ص ۲۶۵۔ طبع ششم ۱۹۷۸ء

[2] ایضاً ص ۱۵۰

کبھی معیاری اردو کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ۔ اگر اس سے مراد تحریری اُردو، شستہ اُردو، فصیح اُردو ہے تو وہ اس کی اصل تلاش کر رہے ہیں تو صرف یہی کہا جاتے گا کہ کھڑی بولی میں عربی فارسی الفاظ کافی ہوں اور سنسکرت تت سم الفاظ نہ ہونے کے برابر ہوں تو اسے کھڑی بولی کا اُردو روپ کہیں گے ۔

انھوں نے شیرانی کے نظریہ پنجابی کی تردید کی ۔ اپنے تحقیقی مقالے میں انھوں نے چاہا ہوگا کہ وہ بھی اُردو کے آغاز کا کوئی نیا نظریہ دینے کا اعزاز حاصل کریں ۔ پانچویں باب کا بڑے طمطراق سے عنوان ہے ۔

'تشکیل ایک نئے لسانی نظریے کی'

اگر وہ دکنی ادب کے بعض الفاظ کے بارے میں یہ کہنے پر اکتفا کرتے کہ یہ ہریانی، میواتی یا کھڑی بولی کی بول چال سے لیے گئے ہیں تو ان کے بیان پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا لیکن وہ تو اُردو کو نواحِ دہلی کی کئی بولیوں ہریانی، کھڑی بولی اور میواتی کا ملغوبہ قرار دیتے ہیں ۔ کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں ۔

"اُردو کی ابتدا پر مزید کام کرنے کے لیے نواحِ دہلی ہی کی بولیوں کی جدید و قدیم شکلوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے ۔" ص ۲۹۲

'اُردو کی ابتدا کے سلسلے میں تحقیق کی جو سمت اس تصنیف میں مقرر کی گئی ہے تمام تر نئے مواد سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے ' ص ۲۹۳

میرامّن اور ان کے مقلدوں نے اُردو کو کھچڑی قرار دیا تھا ۔ فاضل محقق بھی زیادہ شستہ و مہذب پیرائے میں اُردو کو کھچڑی قرار دیتے ہیں ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کھچڑی پکانے والوں سے کہتے ہیں ۔

'اُردو اگر پنجابی، برج اور مارواڑی کے اختلاط سے بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اُردو تیرا (ضمیر حاضر اضافی) کا 'تے' برج سے آیا 'ر' مارواڑی سے لی گئی اور 'ا' پنجابی سے ۔ یا 'تو کرتا ہے' کا 'تو' ت اور ر ہے' برج کے ہیں اور 'ا' پنجابی کا ر ہلے

اگر مندرجہ بالا قول میں پنجابی کی جگہ ہریانی اور مارواڑی کی جگہ میواتی لکھ دیں۔ تو یہی طنزیہ اعتراض ڈاکٹر مسعود حسین خاں پر صادق ہوگا۔ دیکھنا یہ ہے کہ کسی زبان کا بنیادی ڈھانچا کس قدیم زبان کا ارتقا یافتہ روپ ہے۔ اس میں متفرق الفاظ دوسری زبانوں یا بولیوں سے لیے گئے تو ان کی اہمیت نہیں۔ انگریزی جرمن الاصل زبان ہے لیکن اس میں لاطینی خاندان کے الفاظ بکثرت، شاید نصف سے زیادہ ہیں۔ کیا انگریزی کو جرمن اور فرنچ (لاطینی خاندان کی زبان) کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ ملیالم میں ساٹھ ستر فی صدی الفاظ سنسکرت کے ہیں۔ کیا اسے سنسکرت کی ایسی اولاد کہا جاسکتا ہے جس میں کچھ الفاظ دراوڑی ہیں۔ فارسی میں عربی کے الفاظ بھر گئے ہیں کیا اسے اوستائی یا قدیم فارسی اور عربی کے اختلاط کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ ملاتے یا بھاشا انڈونیشیا میں اصل پولی نیشن خاندان کے الفاظ کے ساتھ ساتھ عربی، سنسکرت اور ڈچ زبانوں کے الفاظ ملے ہیں۔ کیا بھاشا انڈونیشیا کو ان چار زبانوں سے پیدا کیا جاتے گا۔ ٹکر کا قول پیچھے لکھا جاچکا ہے۔

'زبان دوسری زبان کے الفاظ جتنے چاہے مستعار لے کر اپنا لے۔ ایک زندہ بول جانے والی زبان غیر زبان کے صرفی نحوی قاعدے اور تعمیری اصول کبھی نہیں اپناتی'

اگر دو زبانوں یا بولیوں میں کچھ سرمایہ لفظیات مشترک ہے تو اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جاتے کہ ان میں سے ایک نے دوسرے سے لیا ہے۔ ہوسکتا ہے دوسری نے پہلی سے لیا ہو۔ کھوج کرنی ہوگی کہ مشترک سرمایہ کس کے یہاں بیشتر سے ملتا ہے۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ دو بولیوں یا زبانوں نے یہ مشترک سرمایہ اپنی مشترک اصل (اب، جد) سے لیا ہو۔ دکنی یا اردو کے جن روپوں کو ڈاکٹر مسعود حسین خاں ہریانی اور میواتی سے ماخوذ مانتے ہیں۔ پہلے یہ طے کریں کہ ہریانی اور میواتی کھڑی بولی سے قدیم تر ہیں۔ یہ دونوں یقیناً کم ترقی یافتہ ہیں۔ ہریانی کی تشکیل کھڑی بولی سے پہلے کی نہیں معلوم ہوتی۔

حافظ محمود شیرانی کی طرح ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو بھی ہریانی یعنی بانگرو بولی

کی نوعیت کا کوئی اندازہ نہیں۔شیرانی لکھتے ہیں۔
'راقم کی رائے میں ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے بلکہ وہ پرانی اُردو ہے یعنی وہی اُردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری (سترہویں صدی عیسوی) میں خود دہلی میں بھی بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اُردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر ہم اس کو اُردو نہ مانیں تو اُردو کی شاخ ماننے میں تو ہمیں عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور میں دہلی کے اثرات میں بنی ہے'[1]
اُردو والے شہر کی زبان پر توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ شیرانی کی نظر میں وہ ہریانی نہیں جو علاقۂ ہریانہ میں واقعی بولی جاتی ہے' وہ تو اس علاقے کے اُردو مصنفوں کی زبان کو ہریانی سمجھتے ہیں۔ انھوں نے اورینٹل کالج میگزین کے دو شماروں بابت نومبر ۱۹۳۱ء و فروری ۱۹۳۲ء میں ایک مضمون لکھا۔
'اُردو کی شاخ ہریانی زبان میں تالیف'
اور اس مضمون میں مولانا عبدی، شیخ محبوب عالم، اکرم رہتکی وغیرہ کی تصانیف کا ذکر کیا۔شیرانی ماہرِ لسانیات نہیں تھے۔ افسوس یہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی ان شعرا کی مثنویوں کی زبان کو ہریانی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سب محض اُردو میں ہیں۔ جس طرح پنجاب میں لکھنے والے اُردو مصنّف شاہ مراد کا نامۂ مراد پنجابی تصنیف نہیں، وجہی کی قطب مشتری تیلگو نہیں بلکہ اُردو ہے۔ اسی طرح محبوب عالم کی مثنوی محشر نامہ، اکرم قطبی کی تیرہ ماسہ دور دور تک ہریانی کی تصانیف نہیں۔ محشر نامے کی زبان یہ ہے

ہوئے پھر مقابل قریشوں کے تب　　نبیؐ اور اصحابہ اک بار سب
عکاسہ طرف داہنی کو کھڑا　　ابوسلمہ بائیں طرف پر پڑا

شیرانی اور مسعود حسین خاں نے ہریانے کی بول چال کی زبان نہیں سنی ہوگی جو اس شستہ اُردو کو ہریانی سمجھتے ہیں۔ راقم الحروف ادھر سال میں دو ایک بار

جاکر فرید آباد میں رہتا ہے ۔ وہاں کے جاٹوں کی ہریانی ساٹھ ستر فی صدی ہی سمجھ میں آتی ہے ۔ ڈاکٹر ہردیو باہری[1] کی ہندی کتاب "گرامین ہندی بولیاں" سے ہریانی کے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو گا کہ ہریانی دراصل کیا ہے ۔ اسے اردو رسم الخط میں صحیح لکھنا مشکل ہے لیکن اعراب کی مدد سے کوشش کرتا ہوں ۔

مینے کہا، (میں نے کہا)، کون جاوے سے (کون جاتا ہے)، بیٹھانی جاندا (بیٹھا نہیں جاتا)

ہوُر کے چاوے سو ایپ تھارے تے اُنتے بھٹا دوں گا۔ (اور کیا چاہتے ہو اب تم سے اسے ملوا دوں گا)

ہتھیلی میں تے پسنا لکون لاگ رہیا (ہتھیلی میں سے پسینہ نکلنے لگا)

کیا اُردو اس بانگرو سے نکلی ہے ؟

مسعود حسین خاں لکھتے ہیں ۔

"گریرسن موجودہ ہریانی کو کھڑی بولی (ہندوستانی) ہی کی ایک شکل مانتا ہے جس میں راجستھانی اور پنجابی بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے"[2]

گویا گریرسن ہریانی کو کھڑی بولی سے بعد کی مانتا ہے ۔ مسعود حسین خاں اس کی ایک اور رائے درج کرتے ہیں ۔

"گریرسن کھڑی بولی کو برج بھاشا کا ایسا روپ مانتا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتا چلا گیا ہے"[3]

دراصل کسی زبان یا بولی کو دوسری زبانوں یا بولیوں کا مجموعہ قرار دینا ہی غلط ہے ۔ گریرسن پنجابی کو ہندی اور لہندہ کا آمیزہ مانتا ہے ۔ اس طرح ہر زبان یا بولی کو مختلط قرار دیا جا سکتا ہے" اودھی کو کھڑی بولی اور بہاری کا ۔

---

[1] گرامین ہندی بولیاں ص ۶۵ کتاب محل الہ آباد طبع اول ۱۹۶۶ء

[2] لسانیاتی جائزہ ہند حصہ اول ص ۳۰۲ بحوالہ تاریخ زبان اُردو ص ۸۵

[3] ایضاً بحوالہ مسعود حسین خاں ص ۸۹

بہاری کو اودھی اور بنگالی کا، راجستھانی کو ہندی اور گجراتی کا، گجراتی کو ہندی اور راجستھانی کا، ملیالم کو سنسکرت اور تامل کا ملغوبہ یا کھچڑی گردانا جاسکتا ہے۔ یہ غلط طریق کار ہے۔ کوئی زبان اپنے سے قدیم تر زبان کا ارتقا یافتہ روپ ہوتی ہے اور بس۔ دوسری زبانوں یا بولیوں سے کچھ الفاظ یا بہت سے الفاظ اور شاذ کچھ قواعدی روپ مستعار لے لیے جاتیں تو بھی یہ عناصر زبان کے آغاز یا شجرۂ نسب میں دخل کا دعویٰ نہیں کرسکتے۔ اُردو کھڑی بولی کا روپ ہے۔ اس کے شجرۂ نسب میں ہریانی، برج یا میواتی کا کوئی مقام نہیں۔ یہ اُردو کی پاس یا دور کی رشتے دار ہیں آبا واجداد نہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنا نظریہ مختصراً اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے 'اُردو زبان کا ارتقا' میں پیش کیا۔ یہ مقالہ ۱۹۵۲ء میں یونیورسٹی میں داخل کیا گیا اور ۱۹۵۶ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اپنے نظریے کو اور زیادہ تفصیل سے انھوں نے 'داستانِ زبانِ اُردو' کے نام سے رسالہ اُردو میں ۱۹۵۸ء میں شائع کیا۔ بعد میں ۱۹۶۱ء میں کتابی صورت میں آیا۔ ان کے نظریے کا خلاصہ یہ ہے۔

مغربی ہندی اہلِ لسانیات کا ایک مفروضہ ہے جس کا کبھی وجود نہ تھا۔ برج بھاشا یقیناً شورسینی اَپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے نکلی ہے لیکن اُردو یا ہندوستانی ان سے نہیں پیدا ہوئی۔ شورسینی میں اودکا لہجہ ہے ہندوستانی آکا۔ انھوں نے اُردو کے شورسینی اَپ بھرنش اور شورسینی پراکرت سے اختلافات دکھا کر طے کیا کہ یہ دونوں اُردو کے راست سلسلہ نسب میں نہیں آتیں۔ ہندوستانی اس بول چال کی اپ بھرنش سے ماخوذ ہے جو میرٹھ اور دلّی میں رائج تھی۔ ادبی نمونوں سے ماضی کی بول چال کی زبان کی آئینہ داری نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر شوکت لکھتے ہیں

"اُردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کرتے کرتے یا یوں کہیے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے اس حالت کو پہنچی جس میں آج ہم اسے دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور اس کے نواح میں بولی جاتی تھی۔ پالی اس کی

ترقی یافتہ ادبی اور معیاری شکل ہے۔" اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی، ادب، فن اور فلسفے کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال، لین دین اور کاروبار کی۔ پالی ادبی درجہ پا کر ٹھہر گئی لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے جانے کے باعث برابر ترشتی ترشاتی اور چھلتی چھلاتی رہی۔[1]

اس کے بعد وہ اُردو اور پالی کی مشابہتوں کو دکھاتے ہیں۔ داستان زبان اُردو کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر اختر اورینوی اور پروفیسر احتشام حسین فرماتے ہیں کہ میں پالی کو اُردو زبان کی اصل قرار دیتا ہوں۔ یہ درست نہیں۔ . . . اُردو نے جس زبان سے ارتقا پائی ہے وہ کبھی بالائی دوآبے میں بولی جاتی تھی۔ سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت، مغربی اپ بھرنش بالائی دوآبے کی اس بول چال کی زبان کے مختلف العہد ادبی روپ ہیں۔ کھڑی یا ہندوستانی (اُردو) اس کا فطری ترقی یافتہ (یا بدلی ہوئی) صورت ہے۔ یہ زبانیں اُردو کے راست سلسلہ نسب میں نہیں آتیں۔"[2]

ڈاکٹر اختر اورینوی اور احتشام حسین کے اعتراض سے متنبہ ہو کر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے داستانِ زبانِ اُردو میں پالی پر زور نہیں دیا۔ بارھویں تیرھویں صدی عیسوی کے عہد کی کھڑی بولی اور قبل مسیح کی پالی کو ایک دوسرے کے برابر رکھنا نامناسب تھا۔ ان کے اس نظریے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ کھڑی بولی اس اپ بھرنش سے ماخوذ ہے جو دلی اور میرٹھ میں بولی جاتی تھی لیکن ان کے دو فیصلوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔

۱ اس علاقے کی زبانوں کے عہد بہ عہد (سنسکرت سے شورسینی اپ بھرنش تک) جو تحریری نمونے ملتے ہیں۔ وہ مصنوعی زبانوں کو پیش کرتے ہیں۔ بول چال کی زبان مختلف تھی۔

---

[1] اُردو زبان کا ارتقا۔ ص ۱۰۵۔ چمن بک ڈپو دلّی۔

[2] پیش لفظ داستان زبان اُردو ص ۵

یہ مسلّم کہ تحریری اور تقریری زبان میں سطح کا فرق ہوتا ہے لیکن اس سے زبان کی نوعیت نہیں بدل جاتی۔ عام تحریر میں تقریر کی زبان ہی کو صحت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے پالی، شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش اپنے اپنے علاقے کی بول چال کی زبان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ناٹکوں کے کرداروں میں پراکرت اور اپ بھرنش کا استعمال کسی پراسرار مصنوعی زبان میں نہیں ہوتا بلکہ اس عہد اور علاقے کی واقعی زبان ہیں۔

۲ دلی، میرٹھ کے علاقے کی ہندوستانی ویدوں کے زمانے سے موجود تھی۔ اس میں زمانے کے ساتھ بہت اختلافات ہوتے جب کہ تحریری ادبی زبان میں زیادہ ہوتے اور وہ ویدک بھاشا، سنسکرت، پالی، شورسینی پراکرت اور مغربی اپ بھرنش کی منزلوں میں ظاہر ہوئی۔

بات الٹی ہے۔ ادبی زبان میں تبدیلی کی رفتار سست ہوتی ہے، بول چال کی زبان میں کہیں زیادہ۔ اگر ادبی روپ ہر پانسو سال کے بعد بدلتے رہے ہیں تو تقریری روپ بھی اس قدر بدلا ہوگا کہ اسے ایک نئی زبان کہا جاتے گا۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری کو یہ کہاں سے الہام ہوا کہ "اردو، ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے"، بغیر کسی ثبوت یا مثالوں کے کچھ بھی آئیں بائیں شائیں دعوا کر دینا غیر علمی طریق کار ہے۔

پاکستان کے دوسرے ماہر لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری ہیں جو شوکت سبزواری کی طرح سنسکرت جاننے کے مدعی ہیں۔ ان کے بہت سے مفروضات ایجاد بندہ قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً

۱ "اس برصغیر کی تمام زبانیں دراوڑی یعنی ہندوستانی ہیں۔ ان کا اپنا ایک خاندان ہے ..... جن میں مجھے تین اہم گروہ نظر آتے ہیں۔ مشرقی یا ماگدھی، مغربی یا شورسینی، جنوبی یا مہاراشٹری"۔[1]

۲ "اردو اور دکنی دونوں دراوڑی ہونے کے علاوہ مہاراشٹری گروہ

---

[1] سہیل بخاری قدیم دکنی اور اردو زبان کا تقابلی جائزہ اردو نامہ کراچی ص ۵، ش ۱۸ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۶۴ء

سے بھی تعلق رکھتی ہیں۔[1]

وہ دکنی کو بیجاپوری کہتے ہیں۔ ان کی اصطلاحی بوالعجبیوں کو نظر انداز کر کے ان کے نظریے کے مغز کو دیکھیے۔

'پاک و بھارت کی زبانوں میں سے کوئی زبان ایسی نہیں ہے جو دو زبانوں کے میل جول سے وجود میں آئی بلکہ دو زبانوں کے میل سے تو اس برصغیر کیا' دنیا میں کوئی زبان آج تک پیدا نہیں ہوئی۔[2]

انھوں نے اس بات کو لکھنے پر توجہ کی شمالی ہند میں خسرو کے بعد اُردو ادبیات کے نمونوں میں کئی سو سال کا وقفہ ہے جسے دکنی سے پُر کیا جاتا ہے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اہل اُردو صرف اسے اُردو سمجھتے ہیں جو ایرانی خط میں لکھی گئی ہو حالانکہ رسم الخط بالکل خارجی شے ہے۔ اُردو کے ساتھ دیوناگری رسم خط کے نمونوں کو بھی لیجیے تو کھڑی بولی ایک مسلسل روایت بن جاتی ہے گی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دکنی قدیم اُردو نہیں بلکہ یہ ایک علیحدہ زبان ہے۔ اُردو اور ہندی کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں۔

" دراصل اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرین علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کے موجودہ روپوں میں دو فرق واضح ہے۔ ایک لپی اور دوسرا دخیل لفظ۔ ہندی دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔ اس لیے اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہوگئی ہے اور اُردو نے ایرانی لپی میں تحریر ہونے کی باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لے لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابل التفات نہیں کیوں کہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطہ نظر سے ہندی اور اُردو کی تاریخ ایک ہی ہے خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اُردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے جیسا ہندی زبان کا' اور اس کے قدیم ادب میں سنسکرت یا دوسری معاصر بولیوں کے مستعار الفاظ کی موجودگی کے باوجود اسے اُردو قدیم

---

[1] ایضاً ص ۵۹

[2] ایضاً ص ۵۰

مانے بغیر چارہ نہیں "۔[1]

اور اس کے بعد انھوں نے ہندی شعرا کے یہاں سے نمونے تلاش کر کے خسرو کے بعد شمالی ہند میں واقعی کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت دریافت کر لی اور یہی اصل حقیقت ہے ۔ جو کچھ کسر رہی ہو گی ان سے تحریک پاکر ڈاکٹر پر کاش مونس نے پوری کر دی ۔ انھوں نے ہندی سے نظم کے علاوہ قدیم کھڑی بولی نثر کے نمونے بھی پیش کیے[2] اس طرح کھڑی کی روایت اور استوار ہو گئی ۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اوپر بڑی پتے کی بات کہی تھی ۔ اُردو کا آغاز کب ہوا اس معاملے کو لے کر وہ پھر بہک گئے ۔ کہتے ہیں ۔

" عوام الناس کا یہ خیال کہ زبان (اُردو) یوں ہی خود بخود پیدا ہو گئی ہے محض ناواقفیت پر مبنی ہے کیونکہ مجھے اپنی زبان کی بناوٹ کے بارے میں کچھ ایسے اصول نظر آتے ہیں جن سے کبھی انحراف نہیں کیا جاتا ۔ اس لیے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہماری زبان انسانی ایجاد ضرور ہے لیکن یہ ایجاد اتنے پرانے زمانے میں ہوئی ہے کہ اس کے متعلق ہم تک کوئی معلومات نہیں پہنچ سکیں . . . .

اردو زبان کی عمر کچھ نہیں تو کم از کم چند ہزار سال تو ضرور ہی مانی جا سکتی ہے کیونکہ اس کے الفاظ برصغیر کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں آج بھی ملتے ہیں لیکن اُردو والوں سے میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ سنسکرت یا پراکرت سے اُردو کا جوڑ ملانے کے بجائے خود اس کے الفاظ کا مطالعہ کیجیے کیوں کہ ان میں ایک ایسا جہاں آباد ہے جس کا کاروبار مسلمہ اصولوں کے تحت چل رہا ہے[3]

افسوس یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار نے رگ وید میں اُردو کے ایک لفظ کی مثال بھی درج نہیں کی ۔ زبان متفرق الفاظ کا نام نہیں بلکہ صرفی و نحوی اصولوں

---

[1] ڈاکٹر سہیل بخاری : اُردو کا قدیم ترین ادب ۔ نقوش ص ۸۴-۸۳ شمارہ ۱۰۲ ۔ مئی ۱۹۶۵ء

[2] اُردو ادب پر ہندی ادب کا اثر ص ۳۱ تا ۳۵

[3] ڈاکٹر سہیل بخاری : کوڑی نقوش ص ۱۳۸ شمارہ ۱۰۶ جنوری تا دسمبر ۱۹۶۶ء

کے مطابق فقروں اور جملوں کی ساخت کا ہے۔ کیا رِگ وید یا سنسکرت، پالی، پراکرت، اپ بھرنش میں اُردو یا کھڑی بولی کا ایک بھی جملہ ملتا ہے۔ کھو کھلے بلند بانگ دعووں سے اُردو کے ناواقف قارئین کو مرعوب کرنا مقصد ہو تو دوسری بات ہے۔ انھیں ڈاکٹر صاحب نے ایک کتاب 'اُردو کی کہانی' تصنیف کی جو ۱۹۷۵ء میں لاہور سے شائع ہوئی اور جسے انھوں نے ہندی آمیز زبان میں لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"رِگ وید میں دیسی بولیوں کی بہت بھاری گنتی دیکھ کر یہ پورے بھروسے سے کہی جا سکتی ہے کہ جب آریا آج کل کے روسی ترکستان سے چل کر ہندوستان پہنچے تھے اس گھڑی بھی یہاں یہی سب بولیاں بولی جاتی تھی جو آج ہم اپنے کانوں سے سن رہے ہیں اور انھیں میں اُردو بھی تھی۔ رِگ وید میں جن شاعروں کے بھجن ملتے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے شاعر بھی تھے جو اُردو کے دیس میں بستے تھے یا اُردو بول سکتے تھے کیونکہ انھوں نے اپنے بھجنوں میں آریائی بولیوں کے ساتھ ساتھ اُردو کے بول بھی باندھ دیے ہیں۔ یہ رگ وید میں ابھی تک کوئی ایسی بات نہیں مل پائی ہے جس سے یہ کھلتا کہ اُردو ان دنوں ہندوستان کے کس حصے میں بولی جا رہی تھی،،[1]

رِگ وید میں ایسے شاعر بھی ہیں جو اُردو بول سکتے تھے، قارئین سے معذرت خواہ ہوں کہ ایسے لسانی مالیخولیا سے ان کی طبیعت منغص کی۔

اُردو کے مولد کے بارے میں ڈاکٹر بخاری کا انوکھا نظریہ درج کر کے ان کے انکشافات تمام کرتا ہوں۔ معلوم نہیں انھوں نے کہاں سے کھوج لگائی کہ مشرقی سی پی کو کھڑ دیس کہتے ہیں۔ اس علاقے کے مشرق اڑیسہ، شمال میں چھتیس گڑھ، اور دکن میں تلنگانہ ہے۔ گویا یہ موجودہ مدھیہ پردیش کا قبائلی ضلع بستر ہوا۔ لکھتے ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ اسی حصے کی بولیوں میں ایک بولی گھڑیا نام کی بولی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی اُردو ہو۔ یہ تینوں باتیں مل کر میرے اس سوچ کو پکا کرتی ہیں اُردو جسے کھڑی بولی کہتے ہیں، کھڑ دیس میں سدا سے بولی جا رہی ہے، جہاں سے نکل

---

[1] اُردو کی کہانی ص ۱۵۶ - ۱۵۵ - مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۷۵ء

کر یہ پہلے اتری ہندوستان پہنچی اور پھر وہاں سے پورے ہندوستان کی ملباتی چوڑائی میں پھیل گئی۔" [1]

واللہ اعلم انھیں کھڑدیں اور کھڑیابولی کی بھنک کہاں سے پڑگئی .... ہوتے بس است۔ انھوں نے کھڑی بولی اور اُردو کو وہاں سے برآمد کر دیا۔

اس تمام لسانی مجذوبیت کے بیچ کام کی بات صرف ایک کہی گئی ہے کہ کھڑی بولی کا ارتقا اُردو اور ہندی دونوں لکھاوٹوں میں تلاش کیا جائے تو شمالی ہند میں اس کی مسلسل روایت مل جاتی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ کھڑی بولی؛ اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے نام ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے لسانیات پڑھ کر کج فہمی کے سبب عجیب عجیب مفروضات قائم کیے۔ انھیں کے ہم صفیروں میں بنگلور یونیورسٹی کی ڈاکٹر آمنہ خاتون ہیں جنھوں نے لسانیات کو جانے بغیر یہ دعوا کیا کہ دکنی نہ صرف شمالی اُردو سے الگ زبان ہے بلکہ اس سے پہلے اور آزادانہ طور پر تشکیل پذیر ہوئی۔ ان کا کتابچہ ' دکن کی ابتدا ۱۹۷۰ء میں بنگلور سے شائع ہوا۔ مجھے کہیں سے نہ مل سکا اس لیے اس کا ماحصل ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ کی کتاب "اُردو کی لسانی تشکیل [2] کے ایک طویل اقتباس کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے۔

انھوں نے دکنی کو اُردو سے ایک علیحدہ زبان قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں دکنی نہ تو دہلی میں بولی جانے والی زبان سے ماخوذ ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسری جگہ سے چل کر دکن پہنچی ہے بلکہ اس کی ابتدا سرزمین دکن سے ہوتی ہے اور وہ یہیں نشوونما پاکر پروان چڑھی ہے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون کے خیال کے مطابق مسلمانوں کے دہلی پہنچنے سے کم از کم ساڑھے پانچ سو سال پہلے سے دکن میں مرہٹی زبان میں عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے دکن کی داغ بیل پڑنا شروع ہو گئی تھی۔ دکنی کی ابتدا سے متعلق ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے۔

---

[1] ایضاً ص ۱۶۵

[2] ڈاکٹر مرزا خلیل بیگ: اُردو کی لسانی تشکیل ص ۲۴۔ علی گڑھ۔ ۱۹۸۵ء

تاریخ شاہد ہے کہ بندرگاہ تھانہ پر قبضے (سنہ ۶۳۶ء) کے زمانے سے دولت آباد کے پایۂ تخت قرار پانے (۱۳۲۷ء) کے زمانے تک مہاراشٹر کے مسلمانوں کی زبان پہلے بلاشبہ شورسینی اپ بھرنش اور بلاشبہ اس کی مقامی پیداوار مراٹھی تھی اور اس کے شواہد موجود ہیں کہ شورسینی اپ بھرنش اور مرہٹی میں عربی اور فارسی کی سات سوسال کے عرصے میں بتدریج آمیزش اور پڑوس کی جدید آریائی زبانوں سے لین دین اور راہ رسم کی وجہ سے مرہٹی کے دوش بدوش دکن کی نشو و نما ہوئی۔ ص ۴۴

اُردو کے آغاز وارتقا کے بارے میں سنتی کمار چٹرجی، محمود شیرانی، ڈاکٹر زور، پروفیسر مسعود حسین خاں اور دیگر عالموں کے تحقیقی نظریات کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتے ہوتے وہ ' دکن کی ابتدا ' میں ' ایک جگہ یہ عبارت لکھتے ہیں۔

" یہ فرض کرنا کہ وہ دکن میں ان پورے پونے سات سوسال کے عرصے میں مرہٹی میں عربی اور فارسی کے سمٹول اور راجستھانی، گجراتی اور برج بھاکا کے ماحول کے اثر سے دکنی وجود میں نہیں آئی بلکہ دفعتاً ۱۳۲۷ء میں دلّی کی آبادی کے دولت آباد میں منتقل ہونے سے موجود ہوگئی، کسی زبان کے وجود میں آنے اور اس کے نشو و نما پانے کے کل مسلّمہ لسانیاتی اصولوں کے سراسر خلاف ہے۔ اور اس حقیقت سے چشم پوشی ہے کہ دولت آباد، گلبرگہ اور بیدر جو سلطنت کے مرکز حکومت تھے اکثر مرہٹواڑی میں واقع تھے اور یہاں کے باشندوں کی زبان مرہٹی تھی۔" ص ۱۵۔

خلیل بیگ کی کتاب سے اقتباس ختم ہوا۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر آمنہ خاتون کو وسطی ہند آریائی اور جدید ہند آریائی سے کوئی واقفیت نہیں۔ مراٹھی کو شورسینی اپ بھرنش کے بجائے مہاراشٹری اپ بھرنش سے ماخوذ کرنا صحیح تر ہے۔ انھیں یہ اندازہ نہیں کہ جدید ہند آریائی زبانیں بارہویں تیرہویں اور بعض صورتوں میں چودھویں صدی عیسوی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ساتویں صدی سے بارہویں صدی تک راجستھانی، گجراتی، مرہٹی اور برج بھاشا دکن کی تعمیر کے لیے کہاں سے آجاتیں گے۔ ڈاکٹر آمنہ خاتون گلبرگہ اور بیدر جیسے کنڑ علاقوں کی زبان مرہٹی قرار

دیتی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ دکنی کا بنیادی ڈھانچہ مغربی ہندی کی کھڑی بولی پر قائم کیا گیا ہے، گجراتی، مراٹھی وغیرہ سے دخیل الفاظ لے۔

اُردو کے آغاز کے بارے میں ان تمام سنجیدہ اور غیر سنجیدہ نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں ذیل کے نتائج پر پہنچا ہوں۔

۱ اردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو اور ہندی میں کئی مصنفین اور کتابیں مشترک ہیں۔ اُردو والے کبیر اور نانک کے کلام کو اپناتے ہیں۔ ہندی والے انشا کی داستان کو فورٹ ولیم کالج کی بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی دونوں زبانوں کا مال ہیں۔

۲۔ اُردو کے آغاز کو دو منزلوں میں تلاش کرنا چاہیے۔ ۱۔ کھڑی بولی کا آغاز ۲۔ کھڑی بولی کے اُردو روپ دھارنے کا زمانہ۔ ڈاکٹر زور ڈاکٹر شوکت سبزواری اور ڈاکٹر سہیل بخاری نے بنیادی زبان کھڑی بولی کے آغاز کی جستجو کی ہے جب کہ میر امن، سر سید، محمد حسین آزاد، محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کھڑی بولی کے اُردو روپ کی تشکیل پر توجہ مرکوز کی ہے۔

۳ اُردو کا آغاز کھڑی بولی کا آغاز ہے۔ کھڑی بولی گیارہویں بارہویں صدی میں اس اپ بھرنش سے ابھری جو دلی، میرٹھ اور مرادآباد وغیرہ کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ نہیں کہہ سکتے کہ اس کا نام کیا تھا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ شورسینی اپ بھرنش سے مختلف ہو۔

۴ کھڑی بولی میں عربی، فارسی الفاظ کے شامل ہونے سے اُردو روپ متشکل ہوا۔ یہ عمل اوّل اوّل مدھیہ پردیش یعنی دلی اور مغربی یوپی میں ہوا ہوگا لیکن اُردو رسم الخط میں اس کے نمونے محفوظ نہیں۔ دیوناگری کھڑی بولی سے اس کا پتہ چلتا ہے لیکن شمال میں یہ روایت ضعیف رہتی ہے۔ جب شاہجہاں اپنا پایۂ تخت آگرے سے دلی لے آیا۔ تو کھڑی بولی برج پر غالب آگئی اور اُردو روپ شمال میں بالیدہ ہونے لگا۔

۵ اُردو ادب پہلے دکن میں ظاہر ہوتا ہے۔ شمال کے ابتدائی نمونے مشکوک ہیں۔

زبان اور بولی

علم زبان کا موضوع زبان ہے لیکن زبان سے کئی معنی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً
انسان کے لیے زبان خدا کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔
بے زبان جانوروں پر ظلم نہ کرو۔
ب مصر کی زبان عربی ہے۔

پہلے دو جملوں میں زبان سے مراد بنی نوع انسان کی صلاحیتِ نطق ہے اور آخری جملے میں زبان سے مراد صوتی علامات کا ایک مخصوص نظام ہے۔ فرانسیسی زبان میں ان دونوں کے لیے مختلف الفاظ ہیں اول الذکر کو لاں گاژ (Larg'iage.) اور موخرالذکر کو لانگ (Langue.) کہتے ہیں۔ جب ہم زبان کے آغاز کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد "لاں گاژ" ہوتی ہے جب کہ انگریزی اردو وغیرہ لانگ ہیں۔

اکثر اُردو، ہندی، انگریزی، فرنچ وغیرہ مختلف زبانوں کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن ایک لسانی جماعت یعنی ایک زبان کے بولنے والوں کی حد بندی بڑی مشکل ہے۔ ہم برعظیم ہند و پاک میں پیشاور سے مشرق یا جنوب کی طرف سفر کریں تو ہمیں کہیں پر یکایک زبان کے بدلنے کا احساس نہ ہوگا یعنی ہر گاؤں یا شہر والے اگلے گاؤں یا شہر کی زبان کو بآسانی سمجھ سکیں گے۔ فرانس سے اٹلی کی طرف سفر کرتے جائیے زبان میں یوں نامحسوس تبدیلی ہوگی کہ فرنچ اور اطالوی ایک ہی سلسلۂ زبان معلوم ہوگا۔ جرمن اور ڈچ یا ناروے اور سویڈن کی زبانوں میں بھی اسی طرح کوئی حد فاصل نہیں، لیکن ایک سرے والے دوسرے سرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک زبان کے علاقے سے گزر کر دوسری زبان کے علاقے میں داخل ہو گئے ہیں۔ یہ کیوں کر طے ہو کہ فرنچ اور اطالوی یا پنجابی اور مغربی ہندی کے درمیان خطِ تقسیم کہاں ہے۔ یہ الگ الگ زبانیں ہیں یا ایک ہی زبان کی بولیاں ہیں

ایک عام اصول یہ بنا لیا گیا ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں وہ ایک زبان کے بولنے والے ہیں۔ اب سمجھنا ایک اضافی امر ہے۔ گاؤں والوں کی نسبت شہر والے بے پڑھوں کی

کی نسبت پڑھے لکھے اور ایک خطے میں عمر گزار دینے والوں کی نسبت سیاح اور جہاں دیدہ قسم کے لوگ دور دور تک کی زبانیں سمجھ لیتے ہیں.

ذیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

اک روز جہان تو جانا ہے — جا قبرے وچ سمانا ہے (بلھے شاہ پنجابی)

بشیرینیِ خواب آلودہ مژگاں نشتر زنبور — خود آرائی سے آئینہ طلسم موم جادو تھا

(غالب)

ان میں پہلا شعر جو پنجابی کا ہے غالب کے اُردو شعر کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہم دسیوں سال انگریزی پڑھنے کے باوجود انگریزی فلموں کے مکالمے نہیں سمجھ پاتے. میسور کے مسلمان جب آپس میں روانی سے اُردو میں بات چیت کرتے ہیں تو ایسا گمان ہوتا ہے جیسے کنڑی میں بول رہے ہوں، ہمارے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اس طرح دو شخصوں کے درمیان باہم سمجھنے کی مقدار صفر سے لے کر سو فی صدی تک کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ کس حد تک قابلِ فہم ہونا ایک زبان کی علامت ہے اور کس نقطے کے آگے دو تقریریں یا عبارتیں دو زبانیں ہو جاتی ہیں ؟

لسانیات کا طالب علم کنڑی بولی کا مطالعہ کرنا چاہے تو کہاں کی اور کس کی بولی کو لے جس کے بعد وہ دعویٰ کر سکے کہ کنڑی بولی میں فلاں آوازیں پائی جاتی ہیں اور اس کے فلاں قواعد ہیں۔ لسانیات نے اس وادیِ سنگلاخ میں اپنی بے دست و پائی کا اعتراف کر کے یہ اصول بنایا ہے کہ صحت اور قطعیت کے ساتھ صرف ایک فردِ واحد کی زبان ہی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

انفرادی بولی کو انگریزی میں (Idiolect) کہتے ہیں۔ ہر شخص کے بولنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ یہ اس سے ظاہر ہے کہ ہم کسی کو دیکھے بغیر اس کی آواز سے پہچان لیتے ہیں ٹیلی فون تک کی آواز سے شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ ایک فرد کی زبان میں تلفظ، لہجے اور ذخیرۂ الفاظ میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ آلات تو یہاں تک ثابت کرتے ہیں کہ ایک شخص ایک لفظ کو ایک بار جس طرح بولتا ہے آئندہ کبھی اس طرح نہیں بول سکتا۔ اس انتہائی صورت کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم ایک شخص کی عمر کی ایک منزل کی زبان کو انفرادی بولی مان کر آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب جغرافیائی اعتبار سے ذیل کا سلسلہ ملاحظہ ہو:-

ا ——— ب ——— ج ——— د

مندرجہ بالا شکل میں چار نقطے انفرادی بولیوں کے مجموعے ہیں جو مختلف مقامات میں واقع

ہیں۔ ب کے افراد ا اور ج دونوں کی بولیاں سمجھتے ہیں۔ ج والے ب اور د دونوں کو سمجھ لیتے ہیں لیکن ا اور د والے ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ا اور د دو مختلف زبانیں ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان کے درمیان حدِ فاصل کہاں قائم کی جائے؟

ہم ا یا د کی ایسی خصوصیات لیں گے جو ایک کو دوسرے سے مختلف روپ دیتی ہیں مثلاً قواعد کے بعض اصول، بعض آوازیں اور بعض بنیادی الفاظ۔ ان کے استعمال کے علاقے کا تعین ہو جائے تو ہم موٹے طور پر ایک لسانی سرحد قائم کر سکیں گے۔ لسانی سرحد پر دراصل ایسی زبان بولی جاتی ہے جو دو زبانوں کے بین بین ہوتی ہے جس میں کچھ خصوصیات اس زبان کی اور کچھ دوسری زبان کی ہوتی ہیں۔ یہ سرحد جامیٹری کا سیدھا باریک خط نہیں ہوتا بلکہ ایک چوڑی سی پیچ و خم والی پٹی ہوتی ہے اس سرحد کے آس پاس ایک دوسری زبان کے جزیرے ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے کی زبان کی فہم کی مقدار معلوم کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ مختلف علاقوں کی دو انفرادی بولیوں کو لو۔ ان کے مشترک ذخیرۂ الفاظ کا شمار کرو۔ بعض اوقات دور دور کی بے تعلق زبانوں میں بھی بعض الفاظ بحیثیت معنی دونوں کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں لیکن وہ محض اتفاق ہوتا ہے۔ مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ میں اتفاقی مماثلت چار فی صدی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بقیہ الفاظ اگر بہت بڑی تعداد میں مشترک ہوں تو ہم ایسی دو انفرادی بولیوں کو ایک زبان کا حصہ قرار دیں گے۔ اس اصول کا اطلاق بھی اتنا سہل نہیں۔ اشتراک کسے کہا جائے۔ گھوڑا، گھوڑو اور گھوڑوا۔ یا سانڈ اور سانڑ۔ یا مارتا ہے اور مارتا ہے۔ یا آٹھ اور اٹھ کو یکساں قرار دیا جائے یا مختلف، بڑی مشکل ہے۔

اس الجھن سے بچنے کا راستہ یوں نکالا گیا ہے کسی کی بات چیت کو ریکارڈ کر لیجیے۔ دوسرے شخص کو یہ ریکارڈ سنا کر معلوم کیجیے کہ وہ کتنے مطالب اور نکات کو سمجھ سکا۔ اگر وہ بیشتر مطالب کو سمجھ سکا ہے تو دونوں افراد ایک زبان کے بولنے والے ہیں ورنہ نہیں۔

دو شخصوں کا ایک دوسرے کی بات سمجھ لینا مشترک الفاظ کی تعداد پر منحصر ہے۔ دو بولیوں میں مشترک یا مماثل الفاظ پائے جائیں تو اس کی دو تاویلیں کی جا سکتی ہیں:۔ (۱) یا تو یہ دخیل (Loan) الفاظ ہیں (۲) یا یہ دونوں کا آبائی ورثہ ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ دونوں زبانیں ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ملیالم میں کوئی اسی فیصدی سنسکرت الفاظ ہیں اور انگریزی میں تقریباً ۶۰ فی صد فرنچ الفاظ ہیں جو باہر سے داخل ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف ہندی اور بنگالی میں الفاظ کا اشتراک ان کے ہم جدی ہونے کی وجہ سے

ہے۔ تاریخی لسانیات کی مدد سے زبانوں کا خاندانی رشتہ متعین ہو جائے تو زبانوں کے وصل و فصل اور ان کی لسانی حدود طے کرنا سہل ہو جاتا ہے۔

ہم نے اب تک قابلِ فہم ہونے کو زبان کی حد بندی کا معیار قرار دیا ہے لیکن اس میں بھی کسی قدر پیچیدگیاں ہیں۔ سمجھا جانا منحصر ہے ذخیرۂ الفاظ کے ایک بڑے حصے کا شترک اور مشابہت پر۔ ہریانی اور پنجابی میں ، اردو اور فارسی میں، انگریزی اور فرنچ میں بہت سے الفاظ مشترک یا مماثل ہیں

شمارِ سبحہ، مرغوب بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس شعر کو ایک ایرانی سمجھ سکتا ہے۔

تو کیا ہریانی اور پنجابی یا انگریزی اور فرنچ کو ایک زبان کی دو بولیاں قرار دے دیا جائے ؟ نہیں! یہاں ہمیں اپنے اصول میں ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ زبانوں کے رشتے میں صرف بنیادی الفاظ رہنمائی کرتے بقیہ ذخیرۂ الفاظ کی اہمیت نہیں۔ وہ بنیادی الفاظ کیا ہیں۔

اہم اعضائے جسم کے نام :- آنکھ۔ ناک۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں

خاص رشتے :- ماں۔ باپ۔ بیٹا۔ بیٹی۔ بھائی۔ بہن

گنتی کے الفاظ :- ایک دو تین چار دس گیارہ بارہ تیرہ بیس اکیس وغیرہ

بنیادی افعال :- آنا جانا۔ کھانا پینا۔ چلنا۔ کرنا۔ مارنا

ضمائر :- میں۔ ہم۔ تم۔ وہ

ایک ماخذ سے کچھ ہی پہلے جدا ہونے والی دو زبانوں یعنی سگی یا چچیری بہنوں میں یہ الفاظ بھی بڑی حد تک مماثل ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :-

ہندی	مراٹھی	گجراتی	تامل	کنڑ	ملیالم
ناک	ناہ	ناہ	موکو	موگو	موک
کان	کان	کان	پچوی	کیوی	چیوی
کھا	کھا	کھا	تن	تنّو	تنّو
پی	پی	پی	کدی	کدی	کدی

یہ بھی باوثوق پیمانہ نہ ہوا۔ ایک خاندان کی مختلف زبانوں میں بنیادی الفاظ مشترک ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کی مماثلت سے زیادہ قابلِ وثوق یہ اصول ہے کہ قواعد کی مماثلت پر تکیہ کیا جائے۔ تصریف و اشتقاق کے قواعد اور کلام کی نحوی ساخت زبانوں کے حصار کی حد بندی کا بہترین ذریعہ ہیں

یہ ایک زبان کی مختلف بولیوں میں مماثل ہوتے ہیں اور مختلف زبانوں میں مختلف۔ فعل کی گردان، اسم و ضمیر کی تعریف، حروفِ جار کا استعمال زبان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

ایک زبان کے بولنے والوں میں جس قدر ملنا جلنا ہوگا اسی قدر ان کی بولی یکساں ہوگی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک بڑے علاقے میں بسنے والے لسانی گروہ میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ مقامی خصوصیات پیدا ہوتی جائیں گی۔ یہ اختلافات ایک زبان کو بولیوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک بولی کے بولنے والوں کی انفرادی بولیوں میں کم و بیش یکسانیت ہوتی ہے۔ کیا قواعد، کیا روزانہ ضرورت کے ذخیرۂ الفاظ دونوں میں مکمل مطابقت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ بولی کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے "بولی کسی زبان کی وہ ذیلی شاخ ہے جس کے بولنے والوں کو کسی لسانی اختلاف کا احساس نہیں ہوتا۔"[1]

زبان کا علاقہ جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس میں بولیاں زیادہ ہوں گی۔ یہ علاقہ اگر دشوار گزار ہوگا یعنی اگر اس کے باشندے ایک دوسرے سے کم مل جل پاتے ہوں گے تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بولیوں کا فرق ہوتا جائے گا۔ غیر متمدن قبائل میں چونکہ نقلِ مکانی کم ہے اس لیے ان زبانوں میں بولیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ انڈونیشیا کے جزیرہ Celebes میں سیکڑوں بولیاں ہیں۔ نیوگنی میں اس سے بھی زیادہ ہیں۔ صفحۂ زمین سے محو ہونے سے قبل چھوٹے سے جزیرے تسمانیہ کے جنگلیوں کی تعداد محض پچاس رہ گئی تھی اور وہ چار بولیاں بولتے تھے جن میں آنکھ، ناک، سر کے لیے الگ الفاظ تھے۔[2]

زبان بولیوں کے مجموعے کا نام ہے لیکن جب ہم کسی کتاب میں ہندی، اُردو یا انگریزی زبان کے نمونے پڑھتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ الفاظ اس زبان کی ہر بولی کا مشترک حصہ ہیں، نہیں بلکہ یہ کتابی زبان بھی ایک بولی کی منزّہ صورت ہے جو بعض غیر لسانی وجوہ سے مؤقر ہو گئی ہے۔ کسی زبان کی سب سے اہم بولی کو معیاری زبان قرار دیا جاتا ہے۔ بولنے والوں کی یا مقام کی اہمیت سے کوئی بولی اہم ہو کر معیاری ہو جاتی ہے۔ معیاری زبان کے تعین میں اور دوسری بولیوں کی تقابلی اہمیت میں ذیل کے اسباب میں سے کوئی ایک یا کئی کار فرما ہوتے ہیں۔

۱۔ سیاسی اقتدار والے علاقے مثلاً راج دھانی کی بولی معیاری زبان بن جاتی ہے۔ دلّی کی اُردو لندن کی انگریزی اور روم کی لاطینی بولیاں اپنی زبان کی معیاری شکل قرار پائیں۔ پونا کی مراٹھی بھی اسی

---

1. Linguistic Change by Sturtevant P. 146 Chicago 1961
2. " " " " P. 153

اسی وجہ سے معیاری مانی گئی۔

۲۔ کسی مقام کی دینی برتری بھی وہاں کی بولی کو اہم کر دیتی ہے۔ متھرا کی برج بھاشا اور ایودھیا کی اودھی معیاری تسلیم کی جاتی تھیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک زمانے میں برج اور اودھی کو زبان کا مرتبہ حاصل تھا۔ امرتسر کی بولی کو پنجاب کی معیاری زبان قرار دینے کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سکھوں کا مقدس مقام ہے۔

۴۔ جس بولی میں جتنا ادب ہوگا اسی مناسبت سے اس کی اہمیت ہوگی۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں ماضی میں برج اور آج کھڑی بولی سب سے اہم ہے۔ مشرقی ہندی میں اودھی بقیہ دو بولیوں یعنی بھیگی یا چھتیس گڑھی سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس کی وجہ ان کے ادب کی کیفیت و کمیت ہے۔

اگر کسی وجہ سے معیاری زبان کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو وہ محض بولی ہو کر رہ جاتی ہے اور کوئی دوسری بولی معیاری زبان کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے۔ شاہ جہاں کے عہد تک جب آگرہ ہندوستان کا دارالخلافہ تھا، برج ہندی کا معیاری روپ تھی اور کھڑی بولی محض ایک بولی تھی۔ شاہ جہاں نے جب دارالسلطنت دلی کو منتقل کر دیا تو کھڑی بولی معیاری زبان ہو گئی اور برج محض ایک بولی ہو کر رہ گئی۔

معیاری زبان تعلیم و ادب، نظم و نسق، تہذیب اور مجلس کی زبان ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور وقعت روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ یہ مختلف بولیوں کے درمیان مشترک زبان کا کام دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان میں بات چیت کرنا تہذیب اور مرتبت کی نشانی سمجھا جاتا ہے اور بولی کا استعمال تہذیب و تعلیم و امارت سے بے بہرہ ہونے کی علامت۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان شہروں سے بولیوں کو نکال کر ان کی جگہ پر قابض ہو جاتی ہے۔ بولیوں میں ادب کی تخلیق رک جاتی ہے اور معیاری زبان ہی ادب کی زبان بن جاتی ہے۔

معیاری زبان اور بولی کے کئی روپ ہوتے ہیں

ادبی زبان سب سے زیادہ فصیح اور قواعد و ضوابط میں جکڑ بند ہوتی ہے۔ اس سے نیچے دوسرے موضوعات کی تحریری زبان ہوتی ہے مثلاً اخبار یا تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں کی زبان معیاری زبان کی تقریری شکل اس سے زیادہ وارستہ ہوتی ہے۔ کتابوں میں زبان جس طرح لکھی جاتی ہے اس طرح کوئی بولتا نہیں ورنہ گفتگو کو مصنوعی اور کتابی کہا جائے گا۔ اسی طرح تقریر کا روزمرہ تحریر میں پیش نہیں کیا جاتا کیوں کہ بولنے میں جلدی کی خاطر لفظوں کے تلفظ کو کچھ نہ کچھ مختصر اور مسلسل کیے بغیر چارہ نہیں۔

معیاری زبان ہی کی قدرے مختلف شکل بعض پیشوں کی طبقاتی زبان ہے مثلاً انجینیر، ڈاکٹر، وکیل

مذہبی قائدین، کھلاڑی، کرخندار اور آڑھتی کی زبان۔ ہندوستانی طلبا کی زبان میں انگریزی الفاظ، مولویوں کی زبان میں عربی و فارسی الفاظ، پنڈتوں کی بھاشا میں سنسکرت الفاظ کی بہتات ہوتی ہے۔

معیاری زبان میں بولنے والوں کی تعلیمی اور معاشی حالت کے اعتبار سے کئی درجے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے یا مرفّہ الحال طبقے زبان کا پاکیزہ روپ استعمال کرتے ہیں۔ تعلیم سے محروم یا معاشی اعتبار سے فروتر افراد اس کو کسی قدر مسخ کرکے بولتے ہیں۔ ان کی زبان کو ہم پست معیاری زبان (Sub-standard Language) کہیں گے۔ ایسے شہروں کے کم پڑھے لکھے لوگ، طبقۂ متوسط کی نچلی سطح کے افراد¹ (Lower Middle) کاریگر، مستری، خوانچے والے، چھوٹے دوکاندار استعمال کرتے ہیں۔ گویا یہ معیاری زبان کی غیر فصیح شکل ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ملک کی مشترک زبان کے طور پر یہی رائج ہوتی ہے۔ ہندوستان کی عوامی قومی زبان کوئی ہے تو یہ ہے جس کا ایک دلچسپ نمونہ بمبئی کی اُردو ہے۔

معیاری زبان کسی زبان کی سب سے اہم بولی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ زبان میں دوسری مقامی بولیاں بھی شامل ہوتی ہیں اور لسانیات کے طالب علم کو ان میں بہت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ بڑی زبانوں کی بولیاں بھی خاصے بڑے علاقے پر پھیلی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ کچھ اور ذیلی بولیوں (Sub-Dialects) میں بنٹ جاتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ہر بارہ کوس کے بعد پانی اور بانی (آواز یا زبان) بدل جاتے ہیں۔ اتنا بھی نہ سہی تو تقریباً ستر اسی میل بعد یعنی ایک ضلع کے ساتھ ساتھ بولی بدل جاتی ہے۔ مغربی ہندی کی ایک بولی ہے کھڑی بولی۔ کھڑی بولی کی ذیلی بولیاں، سہارنپور کی بولی، ضلع بجنور کی بولی، رامپور کی بولی وغیرہ ہیں۔ ان علاقوں کے رہنے والے ان کے نازک اختلافات کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ مثلاً سہارنپور کی زبان میں نون غنہ کے اعلان کا رجحان ہے۔ بجنور میں طویل مصوتے (Vowel) کے بعد آنے والے مصمتے (Consonant) کو کسی قدر مشدد کردیا جاتا ہے مثلاً آگئے، بولی۔ مرادآباد میں بعض ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جن سے آس پاس کے اضلاع والے ناواقف ہیں مثلاً "بہاری کرنا یعنی اٹھالینا" "صوزی" یعنی امرود۔

بولی کی سب سے زیادہ مسخ شدہ شکل کو گنوارو بولی (پیٹوا Patois) کہتے ہیں۔ اس کا علاقہ تو مختصر ہوتا ہی ہے، یہ غیر مہذب اور جاہلانہ بھی سمجھی جاتی ہے۔ جس طرح معیاری بولی کی غیر فصیح شکل کو پست معیاری بولی کہا گیا تھا اسی طرح علاقائی بولی کے پست ترگروپ کو گنوارو بولی

---

1. Bloomfield, Language 1955 P. 50

کہہ سکتے ہیں۔

ایک بحث ہے کہ زبان اور بولیوں کا تاریخی رشتہ کیا ہے۔ کیا استداد زمانہ کے ساتھ ایک زبان بنٹ کر بولیوں میں تقسیم ہوگئی یا مختلف بولیاں مل جل کر زبانیں بن گئیں یعنی بولیاں پہلے آئیں یا زبان؟

ریناں[1] (Renan) اور میکس مولر کا خیال ہے کہ زبان کا فطری ارتقا انتشار سے اتحاد کی طرف ہے۔ ابتدا میں انسانی بولیاں متعدد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ میل جول کے ساتھ اُن کے اختلافات کم ہوتے گئے اور وہ ایک زبان کی شکل میں گندھ گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ابتدا میں خاندان گوتر، ذات پات اور قبیلے تھے جو بعد میں قوم کی شکل میں منظم ہو گئے۔ امریکی ماہر لسانیات د ھٹنے اس نظریے کے خلاف ہے۔ اس کی رائے ہے کہ زبان پہلے آئی اور وہ آہستہ آہستہ بولیوں میں تقسیم ہوگئی۔ کچھ اور عرصے کے بعد یہ بولیاں خود زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور ان سے پھر بولیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جس کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ زبانوں کی تاریخ اس کی سب سے بڑی شاہد ہے۔ ہند یورپی یا ہند آریائی کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھیے، زبانیں کس طرح بولیوں کو جنم دیتی گئی ہیں[2] لسانی تاریخ میں یہ واقعہ عام ہے کہ بولیاں ایک دوسرے سے جُدا ہو کر مختلف زبانیں بن جاتی ہیں۔ اطالوی یا فرنچ یا جرمن اور ڈچ کسی زمانے میں ایک زبان کی دو بولیاں تھیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سو دو سو سال میں برطانیہ اور امریکہ کی انگریزی یا ہندوستان اور پاکستان کی اُردو دو مختلف زبانیں ہو جائیں۔ اس کے برعکس شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان زوال پذیر ہو کر محض بولی رہ جاتی ہے۔ برج اور اودھی کو عہدِ وسطیٰ میں زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اب وہ ہندی کی بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں۔ میتھلی اور راجستھانی کو بھی ہندی والے بولی قرار دینا چاہتے ہیں۔ کون جانے کہ لسانی جبر کے زیر اثر کچھ زمانے کے بعد پنجابی بھی ہندی کی بولی بن کر رہ جائے۔

معیاری زبان میں پھیلنے کا رجحان ہوتا ہے وہ پاس پڑوس کی بولیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ روم کی لاطینی بولی آس پاس کی کئی بولیوں کو کھا گئی۔ معیاری زبان اور بولیاں ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتی ہیں۔ انبالے کی ہندی پر ہریانی کا اثر اور بنارس کی ہندی پر بھوجپوری کے اثرات

---

1 Whitney : Language and its study of Language, London 1884. P. 177

2. " " " " " " " " " P. 180

ہیں۔ اُردو کی دکنی بولی پر مراٹھی کے اثرات ہیں اور جہاں تک لہجے کا تعلق ہے آندھرائی اُردو تلگو لہجے میں اور میسور کی اُردو کنڑ لہجے میں بولی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علاقائی بولیاں معیاری بولی سے ذخیرۂ الفاظ بلکہ بعض اوقات قواعدی روپ بھی لیتی جاتی ہیں۔

بولیوں میں زندگی کا حرکی خون رواں دواں ہوتا ہے۔ یہ ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ معیاری زبان ادب اور قواعد کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہر قدم پر سند کی تلاش کرتی ہے۔ روزمرہ سے بیگانہ ہو کر یہ روایت پسند اور ماضی پرست ہو جاتی ہے۔ بولیاں مستقبل کا آئینہ ہوتی ہیں۔ آخر کار معیاری زبان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تغیر سے پچھڑ کر پیچھے رہ گئی ہے۔ ہار کر اور جھنجھلا کر اُسے بولی کا ساتھ دینا پڑتا ہے شروع شروع میں وہ جن لسانی تبدیلیوں پر ناک بھوں چڑھا کر انھیں تحقیر کے ساتھ ٹکسال باہر قرار دیتی ہے ایک عرصے کے بعد اُسے وہی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ معیاری بولی کی زندگی کی شرط یہی ہے کہ وہ بولیوں کی طرف سے مغائرت نہ برتے اور ان کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کرتی رہے ورنہ سنسکرت کی طرح قواعد بند ہو کر ٹھٹھر جائے گی۔ معیاری زبان اس ندی کی طرح ہے جس کی سطح کے اوپر برف کی جامد تہہ جمی ہو لیکن اس کے نیچے موج تہہ نشیں مچل رہی ہو۔ یہ امواج تہہ نشیں بولیاں ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گفتگو عموماً بولی ہی میں کی جاتی ہے۔ معیاری زبان صرف پُرتکلف موقعوں کے لیے ہوتی ہے۔ کلاس روم عدالت، اسمبلی، لکچر ہال وغیرہ میں بھلے ہی باقاعدہ ٹکسالی معیاری زبان بولی جائے، گھر میں آکر ہر شخص کا رجحان بولی کی طرف ہو جاتا ہے۔

تقریری روپ سے زیادہ کنارہ کشی اور لغت و قواعد کے زیادہ احترام کے باعث بعض اوقات زبانیں مر بھی جاتی ہیں یعنی ان کا بولنے والا کوئی نہیں رہتا۔ سنسکرت اور عبرانی اس کی مثالیں ہیں لیکن ان کی خاکستر پر دوسری نسل پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری کئی وجوہ سے بھی زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی کبھی تو ان کے بولنے والے تنازع البقا میں پسپا ہو کر ختم ہو جاتے ہیں جس طرح تسمانیہ والے گورے ہو گئے یا جنوبی ہند میں ٹوڈا تقریباً ختم ہو چکے ہیں یا ریڈ انڈین روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض صورتوں میں ایک زبان کے بولنے والے سیاسی یا تہذیبی حیثیت سے دوسری زبانوں کے زیر اقتدار آکر آہستہ آہستہ اپنی زبان کو ہاتھ سے گنوا دیتے ہیں۔ امریکہ کے حبشیوں نے اپنی زبانیں چھوڑ کر انگریزی اختیار کر لی ہے۔ آئرلینڈ میں جہاں کی زبان انگریزی سے مختلف خاندان کی تھی، اب عام طور سے انگریزی بولی جاتی ہے۔ ماضی کے طویل دھندلکے میں متعدد چھوٹی زبانیں اس طرح کالعدم ہو گئی ہیں کہ ان کا نام لیوا بھی صفحۂ ارض پر موجود نہیں۔ چنانچہ یہ یقینی ہے کہ گردِ تاریخ میں دفن ہو جانے والی زبانوں کی تعداد

زندہ زبانوں سے کہیں زیادہ ہے۔

بعض اوقات احیائیت یا علاقائیت کا جذبہ بولی کو ایک وقعت عطا کردیتا ہے۔ میتھلی اور راجستھانی کو زبان کا مرتبہ دلانے کی ایک نحیف سی تحریک ہے جس کے زیراثر ان بولیوں میں ادب کی کچھ نہ کچھ تخلیق کی جارہی ہے۔ بھوجپوری میں فلمیں بن رہی ہیں۔ پرشوتم داس ٹنڈن اودھی میں بات چیت کرنے میں زیادہ آسودگی محسوس کرتے تھے۔ بلوم فیلڈ کے مطابق جرمنوں میں پچھلی ایک صدی میں بولیوں کے لیے ایک رومانی لگاؤ کا جذبہ پیدا ہوگیا ہے۔ چنانچہ طبقۂ بالا کے بعض جرمن گھر میں بولی ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے جرمن اپنے گھروں اور پڑوسیوں سے مقامی بولی میں بات چیت کرنا پسند کرتے ہیں۔

بولی انسان کی بنیادی ضرورتوں ہوا، پانی، سادہ خوراک کی طرح ہے۔ معیاری زبان ہماری ان ضروریات کی طرح ہے جو تہذیب نے پیدا کردی ہیں مثلاً ریل، بجلی، ابتدا میں یہ آسائش رہی ہوں گی لیکن اب ان کے بغیر زندگی مشکل ہے۔ ادبی زبان ان آسائشوں کی طرح ہے جو خواص کے لیے ہوتی ہیں مثلاً موٹر، ٹیلی فون، قصروایوان۔ تہذیب کے فروغ کے لیے ان سبھی کی ضرورت ہے۔

کھڑی بولی اور ہندوستانی

کھڑی بولی الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے اپنے ڈی لٹ کے مقالے مانک ہندی کا ایتہاسک ویاکرن (معیاری ہندی کی تاریخی قواعد) جلد اوّل میں 'کھڑی بولی' نام کی تحقیق کی ہے۔ جب یہ مقالہ غیر مطبوعہ تھا تبھی مصنف نے راقم الحروف کو دیکھنے کا موقع دیا۔ ذیل کے بیان میں اس سے نیز دوسرے ماخذ سے مدد لی گئی ہے۔

جیسوال کے مطابق ۱۷۹۸ء یا انیسویں صدی کی ابتدا میں گلکرسٹ نے Sterling Tongue یا اسٹینڈرڈ اسپیچ کا ترجمہ کھڑی بولی کیا۔ ۱۸۰۳ء میں گلکرسٹ للولال اور سدل مسر تینوں نے اس لفظ کا استعمال کیا۔ بعد کے دو کی کتابوں پریم ساگر اور چندراوتی ترجمہ ناسکیتو پاکھیان کی تاریخ سمبت ۱۸۶۰ وکرمی ہے جو برابر ہے ۱۸۰۳ء کے انیسویں صدی کے پہلے دہے میں مرکب 'کھڑی بولی' کا استعمال گلکرسٹ نے ۶ بار، للولال نے پانچ بار اور سدل مسر نے دو بار کیا۔ اس کے استعمال کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

گلکرسٹ

۱۔ ان کہانیوں میں سے کئی کھڑی بولی ہندوستانی کے شدھ ہندوی ڈھنگ کی ہیں اور کچھ برج بھاشا میں دی جاتیں گی[1]

۲۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ برج بھاشا کے ساتھ کھڑی بولی کو شامل نہیں کیا جا سکا ہندوستانی کا یہ بہتر اسلوب اس بھاشا کے طلبہ کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوتا[2]

---

1. Gilchrist : The Hindee Story Teller, Vol. 2, 1802, p-7.

2. Gilchrist : The Oriental Fabulist 1803, p-5.

۳۔ اصلی کھڑی بولی میں ہندوستانی کی قواعد پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور عربی و فارسی کو تقریباً چھوڑ دیا جاتا ہے[1]

۴۔ شکنتلا کا دوسرا ترجمہ کھڑی بولی یا ہندوستان کی خالص بولی (Sterling tongue of India) میں ہے۔ ہندوستانی سے مختلف یہ صرف اس بات میں ہے کہ عربی و فارسی کا لفظ چھانٹ دیا جاتا ہے[2]

۵۔ پریم ساگر کو جو ایک بہت ہی خوبصورت کتاب ہے۔ للولال جی نے ہمارے طالب علموں کے لیے ہندوستانی کی تعلیم کے لیے برج بھاشا کی خوبصورتی و پاکیزگی کے ساتھ کھڑی بولی میں انگریزی ہندوستان کے ہندو عوام کے وسیع طبقے کے حقیقی استفادے کے نظریے سے لکھا ہے[3]

للو لال:

۶۔ سمبت ۱۸۶۰ میں للو جی لال کوی برہمن گجراتی آگرے والے وس کا سار لے یامنی بھاشا (مسلمانی زبان) چھوڑ، دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ، نام پریم ساگر دھرا[4]

۷۔ اس میں جو پوتھیاں برج بھاشا و کھڑی بولی و ریختے کی گناتی ہیں سب پرسدھ ہیں[5]

سدل مسر:

۸۔ اب سمبت ۱۸۶۰ میں ناسکیتو پاکھیان کو جس میں چندراولی کی کتھا

---

1. The Oriental Fabulist, 1803, p-5.

بحوالہ ڈاکٹر عبدالودود، اردو سے ہندی تک، ص ۳۰۔ نسیم بک ڈپو، لکھنؤ ۷۶ء

2. The Hindee Roman Orthoebigraphical Ultimatum. 1804 p-19.

بحوالہ اردو سے ہندی تک ص ۳۱

[3] ایضاً

[4] للولال: پریم ساگر

[5] للولال: لال چندرکا ص ۳، ۱۸۱۹ء

کہی ہے دیو والی سے کوئی نہیں سمجھ سکتا، اس لیے کھڑی بولی میں کہا [1]
۹۔ گلکرسٹ نے ..... ایک دن آگیا دی کہ آدھیا تم را! تن کو ایسی بولی میں کرو جس میں فارسی عربی نہ آوے۔ تب میں اس کو کھڑی بولی میں کرنے لگا۔[2]
گلکرسٹ نے کھڑی بولی کو ہندوستان کی اصل زبان کہا ہے، برج سے مختلف گردانا ہے۔ اور اس میں فارسی عربی الفاظ سے احتراز پر زور دیا ہے جس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ بول چال کی سہل ہندوستانی مراد لیتے ہیں۔ للولال اس اصطلاح کو مغربی یوپی کی زبان کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ یامنی بھاشا اور ریختے سے انھوں نے اُردو مراد لی ہے۔ اُردو اور برج بھاشا کو چھوڑ کر کھڑی بولی محض بول چال کی ہندوستانی رہ جاتی ہے۔ انھوں نے کمال یہ کیا کہ کھڑی بولی کو دلی کے ساتھ آگرے کو بھی منسوب کر دیا۔ بہت ممکن ہے کہ اس وقت تک آگرے میں بھی کھڑی بولی شہری تہذیبی بولی ہو گئی ہو۔ سول مسر نے کھڑی بولی سے مراد کھڑی بولی ہندی لی ہے جس میں عربی فارسی الفاظ کم سے کم ہوتے ہیں۔
کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کیا ہے؟ اس کے مقابل کوئی پڑی بولی نہ تھی نہ یہ اصطلاح رائج ہے حالانکہ ہندی کے ادیب چندر دھر شرما گلیری نے 'پڑی' کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے۔
" ودیشی مسلمانوں نے آگرے، دلی، سہارنپور، میرٹھ کی پڑی بھاشا کو کھڑی کر کے اپنے لشکر اور سماج کے اُپ یوگی بنایا۔"
لسانی اعتبار سے گلیری کا یہ قول بے مغز اور بے معنی ہے۔ آگرہ، دلی، سہارنپور کی بول چال کی زبان یکساں نہیں۔ نہ یہ 'پڑی' ہے۔ پڑی اور کھڑی کے معنی کیا ہیں؟
بنی دھر وِدیالنکار نے کہا کھڑی بولی 'سنسکرت کھر' سے بنا جس کے معنی سخت، کھٹور، کھردرا ہے، جس میں نزاکت نہ ہو۔[3]

---

[1] سول مسر: تاسکیتو پاکھیان

[2] ایضاً ۲

[3] اگلے صفحہ پر

راجا شو پرشاد ستارۂ ہند نے بھی لکھا تھا کہ اس زبان کو صرف گنوار دآبادی میں برداشت کیا جا سکتا ہے[1]

مولوی عبدالحق کی بھی ایسی ہی رائے ہے۔ لکھتے ہیں:

'کھڑی بولی کے معنی ہندوستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں، جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ'[2]

مولوی عبدالحق کا لسانیاتی شعور کمزور ہے۔ وہ ملک کی عام رابطے کی زبان ہندوستانی کا ذکر کر رہے ہیں۔ یہ کھڑی بولی ہی ہے جو مختلف علاقوں میں جاکر قدرے بدل جاتی ہے۔ اس کے لیے تحقیر کا کوئی مقام نہیں۔ گراہم بیلی نے مولوی عبدالحق کے مشاہدے پر اعتراض کیا تو عبدالحق نے کھڑی بولی کو برج بھاشا کے مقابل کیا جو صحیح تھا۔ کہتے ہیں۔

"ہندی میں عموماً برج بھاشا میں نظم لکھی جاتی ہے اور اس میں جو مٹھاس اور لوچ تھا وہ کھڑی بولی میں نہیں تھا اور اس کا نام کھڑی بولی اس لیے رکھا گیا تھا کہ یہ بولی سخت تھی اور کانوں کو اتنی میٹھی معلوم نہیں ہوتی تھی[3]

ڈاکٹر دھریندر ورما نے بھی کہا

'برج بھاشا کی نسبت واقعی میں کھڑی سی لگتی ہے'[4]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں:

پچھلے صفحہ کا بقیہ:

رسالہ اردو ۱۹۳۳ء جلد اول ص ۷۷۔ ۱۷۴ بحوالہ ڈاکٹر جیسوال: مانک ہندی کا اتہاسک دیاکرن (غیر مطبوعہ ہندی مقالہ) جلد ا ص ۲۰۷

[1] بحوالہ ڈاکٹر عبدالودود: اُردو سے ہندی تک ص ۳۱

[2] رسالہ اُردو جولائی ۱۹۳۳ء ص ۵۹۷

[3] اُردو اپریل ۱۹۳۷ء ص ۲۶۳

[4] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۹۳

دراصل کھڑی بولی کے تصور کے لیے برج بھاشا کا پس منظر ضروری ہے۔
ایک کا تعلق (آ) گروہ کی زبانوں سے ہے اور دوسری کا (اُو) گروہ والیوں
سے۔ اگر یہ کہا جاتے کہ برج بھاشا کے مقابلے یہ کھڑی لگتی ہے تو بات ذرا
عقلیات کے دائرے سے نکل کر نفسیات میں آجاتی ہے ...... یہی وجہ ہے کہ
بندیل کھنڈ میں اسے کھاڑ بولی اور مارواڑی میں اسے 'کھانٹھ بولی' کہتے ہیں۔ کھاڑ
اور کھانٹھ دونوں کا مفہوم کھڑا ہوتا ہے ...... یہی کھڑا لہجہ ہریانے کے
علاقے اور جاٹوں کی زبان میں اکھڑ بن جاتا ہے [1]

گو ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے ذکر نہیں کیا لیکن بندیل کھنڈ اور مارواڑ کا ذکر
ڈاکٹر گراہم بیلی کے مضمون شائع شدہ بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز
جلد ۸ ص ۳۶۴ سے لیا گیا ہے 'کھاڑ' کے معنی کھڑا ہونا چاہیئے لیکن کیا کھانٹھ
کے معنی بھی 'کھڑا' ہیں' میں نہیں کہہ سکتا۔ (آ) کے نیچے کو کھڑا ماننا رسم الخط کا
پیدا کیا ہوا مغالطہ ہے۔ اُردو میں آ اور ہندی میں آ کی ماترا دونوں کھڑے ڈنڈے
کی طرح ہوتے ہیں لیکن صوتیاتی اعتبار سے دیکھیئے تو آ کہتے وقت زبان بالکل
مسطح حالت میں ہوتی ہے اور سب سے نیچے پڑی رہتی ہے جب کہ اُو کہنے
میں قدرے اوپر کو اٹھتی ہے۔ ہاں کھڑے کے معنی اکھڑ اور درشت لیے جائیں
تو دوسری بات ہے اور یہ درشتی 'آ' کے لہجے سے نہیں بلکہ تشدید اور معکوسی
آوازوں کی کثرت کی وجہ سے ہے۔ برج میں تشدید بہت کم ہے، کھڑی بولی
میں اس سے زیادہ، ہریانی میں اور زیادہ اور پنجابی میں ان سب سے زیادہ۔
اس کے علاوہ کھڑی کے 'ڑ' کی جگہ برج میں بیشتر 'ر' آتی ہے۔ کھڑی کے 'ڈ،
ڈھ' کی جگہ 'ڑ، ڑھ' سے کام چلایا جاتا ہے مثلاً کھڑی کے سانڈ، گڈریا کو برج
میں سانڑ، گڑریا کہا جاتے گا۔ تشدید اور ثقیل آوازوں کی کمی کی وجہ سے برج
کھڑی سے زیادہ شیریں ہے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے اپنی کتاب 'اُردو کی کہانی' لاہور ۱۹۷۵ء میں

---

[1] مقدمۂ تاریخ زبان اُردو طبع ششم ۱۹۷۸ء ص ۲۲۹

ایک نیا ہی نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ مشرقی سی پی (انگریزی عہد کا سنٹرل پراونس یا صوبۂ متوسط جو بڑی حد تک موجودہ مدھیہ پردیش ہے) کو کھڑ دیس کہتے ہیں۔ اس کی حدود اربعہ یہ ہیں۔

مشرق میں اُڑیسہ، شمال میں چھتیس گڑھ، جنوب میں تلنگانہ

اس طرح یہ علاقہ موجودہ مدھیہ پردیش کا جنوبی ضلع جگدل ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس علاقے کو ماضی میں کھڑ دیس کہتے تھے۔ سہیل بخاری کہتے ہیں 'کھڑی کے معنی ہیں کھڑ دیس کی بولی۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ وہ اس علاقے میں ایک بولی 'کھڑیا' نام کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہی اُردو ہو۔ ان کا قیاس یہ ہے کہ اُردو کھڑ دیسی کی کھڑیا بولی سے نکلی لے

کھڑی بولی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ان کا قیاس اس لیے بے بنیاد ہے کہ انیسویں صدی کی ابتدا میں گلکرسٹ، للولال اور سدل مسر نے اسے یہ نام دیا۔ ان کے ذہنوں میں نہ کھڑ دیس ہوگا نہ وہاں کی کھڑیا بولی۔ اُردو کو اس سے ماخوذ کرنا اور بھی دور اُز کار ہے۔ جگدل پور غیر متمدن قبائل کا ضلع ہے۔ وہاں کی بولی اور اُردو میں کون سی مشابہت ہے۔

کھڑی بولی کے سلسلے میں مناسب ہوگا کہ قبل مسیح دور کے مدھیہ پردیش اور اس کے نزدیکی علاقوں کا جغرافیہ پیش کر دیا جائے۔ اسے ڈاکٹر واسودیو شرن اگروال نے پانینی کالین بھارت (پانینی کے عہد کا ہندوستان) میں دیا ہے۔ یہاں ڈاکٹر ہردیو باہری کی کتاب گرامین ہندی بولیاں سے لے کر درج کیا جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں آریوں کے قبیلے کو جن اور ان کے اقامتی علاقوں کو جن پد یا راشٹر کہتے تھے۔ مدھیہ پردیش میں ۱۳ مہا جن پد تھے۔ اس کے ملحقہ مرد پردیش کا بھی مدھیہ پردیش سے گہرا تعلق تھا۔ مدھیہ پردیش کے ۱۳ جن پد یہ ہیں۔

۱ کرو جن پد۔ یہ سب سے اہم تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ جمنا کے مغرب میں کرو دن یا کرو جانگل یا کرو کشیتر (ہریانہ) تھا جسے منو نے برہما ورت کہا ہے

لے ڈاکٹر سہیل بخاری: اُردو کی کہانی ص ۱۵۶۔ لاہور۔ ۱۹۷۵ء

یہ سرسوتی اور گھگھر ندی کے بیچ تھا۔ بعد میں اس کی توسیع ہوئی۔ اس کی راجدھانی اندر پرستھ یعنی موجودہ دلی تھی۔ جمنا کے مشرق میں کرو پردیش ہے جس کی راجدھانی ہستنا پور تھی جو میرٹھ کے قریب ہے۔ بعد میں یہ دونوں جن پد مل کر ایک ہو گئے ان کی راجدھانی دلی بن گئی۔

۲۔ پانچال۔ موجودہ قنوج سے کچھ دور مغرب میں گنگا کے کنارے اس کی راجدھانی تھی۔ شمالی پانچال بریلی کے آس پاس اور جنوبی پانچال فرخ آباد کے آس پاس تھا۔ شمالی کی راجدھانی چیتر (جواب بھی جینیوں کا تیرتھ ہے) اور جنوبی کی راجدھانی قنوج تھی۔

۳۔ شورسین۔ پہلے اس کی راجدھانی متھرا تھی۔ بعد میں آگرہ ہو گئی۔ اس کی زبان شورسینی کہلائی۔

۴۔ متسیہ۔ یہ شورسین کے جنوب مشرق میں تھا۔ اس کی راجدھانی ڈھنڈ ھاڑ (موجودہ جے پور) تھی۔

مندرجہ بالا چاروں جن پدوں کو ملا کر برہم رشی دیش کہتے تھے۔

۵۔ مروجو متسیہ کے مغرب میں تھا۔ اسے اب مارواڑ کہتے ہیں۔

۶۔ اونتی۔ اسے بعد میں مالوہ کہا گیا۔ اس کی راجدھانی پہلے بدیشا، پھر اُجین اور آخر میں دھار ہوئی۔

۷۔ یہ چھوٹا سا جن پد تھا۔ اس کی بولی بندیلی ہے۔ اس کا مرکز اوڑچھا تھا۔

۸۔ وتس یا بگھیل کھنڈ۔ یہ کوسل دیس کے بیچ میں تھا۔

۹۔ کوسل اس کے دو حصے تھے۔ شمالی کوسل کی راجدھانی ساکیت یعنی اجودھیا یعنی فیض آباد تھی۔ جنوبی کوسل موجودہ چھتیس گڑھ ہے۔ اسے اسلامی دور میں گونڈوانا کہتے تھے۔

۱۰۔ مل۔ اس کا مقام موجودہ گورکھپور ہے۔ اس کی راجدھانیاں کشی نگر اور پاوا (پاوا پوری بہار میں جینیوں کا تیرتھ) تھیں۔

۱۱۔ کاشی اس کی راجدھانی وارانسی ہے۔ اس جن پد نے پھیل کر مل کو اپنے اندر ضم کر لیا اور دونوں کی راجدھانی وارانسی رہی۔

۱۲۔ مگدھ۔ کاشی کے مشرق میں مگدھ جن پد تھا۔ دوسری طرف انگ تھا جو موجودہ بھاگلپور ہے۔ انگ لوٹ کر متھلا (وجیّ) اور بنگال میں مل گیا۔
۱۳۔ ورجی یا وجیّ۔ اس کی راجدھانی ویشالی تھی۔ اس میں آٹھ ذیلی جن پد تھے جن میں لچھوی اور ودیہہ قابل ذکر ہیں۔ ودیہہ ہی متھلا ہے۔ یہاں کی زبان میتھلی کہلائی۔ جس طرح گوتم بدھ کا تعلق مگدھ سے ہے اسی طرح جینیوں کے مہابیر سوامی لچھوی کے رہنے والے تھے۔

ان تیرہ جن پدوں میں موجودہ ہندی پردیش یعنی دلّی، ہریانہ، راجستھان، یوپی، بہار، مدھیہ پردیش کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ مجھے اس میں شک ہے کہ اس پورے علاقے کو مدھیہ پردیش کہتے تھے۔ جن پہلے چار جن پدوں کو ملاکر برہم رشی دیش کہا گیا ہے وہی اصلی مدھیہ پردیش تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ اب بھی عظیم ہندی علاقے کی بولیاں انھیں جن پدوں سے ملتی جلتی ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں راہل سانکرتاین نے لسانی صوبوں کو جن پدوں کے مطابق تقسیم کرنے کا سجھاؤ دیا۔ اس میں کھڑی بولی کی دو راجدھانیاں ہوتیں۔ میرٹھ اور دلّی۔ اودھی کی لکھنؤ اور الہ آباد۔ بھوجپوری کی بنارس اور چھپرا[1]

دھریندر ورما کے مطابق کرو، جن پد انبالہ، دلّی، میرٹھ اور بجنور کے آس پاس تھا جو کھڑی بولی کا علاقہ ہے۔ سانکرتاین نے یہاں کی بولی کو 'کوروی' نام دیا۔ ڈاکٹر ہردیو باہری[2] اس علاقے کی علاقائی کھڑی بولی کو 'کوروی' اور ملک بھر کی رابطے کی زبان کو کھڑی بولی کہنا پسند کرتے ہیں۔ لیکن راہل سانکرتاین ہوں یا ہردیو باہری زبانوں کے نام کسی کے کہنے پر نہیں رکھے جاتے۔ اب کوئی امید نہیں کہ کوئی مغربی یوپی کی زبان یا بولی کو 'کوروی' کہے گا۔

فورٹ ولیم کالج میں پریم ساگر چھپی تو اس کے سرورق پر کھڑی کو انگریزی میں (Khari) لکھا تھا جسے کھڑی اور کھری دونوں پڑھا جا سکتا ہے۔ بعض

---

[1] ڈاکٹر رام بلاس شرما: بھاشا اور سماج (ہندی)، ص ۱۱۴ اور اس کے بعد
[2] ہندی کی گرامین بولیاں ص ۱۴۱۔ الہ آباد۔ ۱۹۶۶ء

بعض حضرات ڑ کے لیے انگریزی حرف r لکھنا پسند کرتے ہیں اور وہ کھڑی کو (Khadi) لکھتے ہیں۔ اس لیے پریم ساگر کی (Khari) کو بہتوں نے کھری پڑھ لیا۔ گلکرسٹ نے انیسویں صدی کے آغاز میں اسے ہندوستان کی (Sterling tongue) کہا تھا۔ اسٹرلنگ کے معنی کھری، مصدقہ، ٹکسالی، معیاری ہیں۔ بیلی کے نزدیک کھڑی کو کھری بنا نا مغربیوں کا کام تھا۔ چندر بلی پانڈے نے کھڑی کی اس طرح تاویل کی کہ اسے سچ مچ کھری کے معنوم میں لے لیا۔ وہ ایک جملہ چاول کھڑا رہ گیا، کا ذکر کر کے کہتے ہیں کہ اس میں کھڑا کے معنی کچا یا اصلی حالت میں ہے۔ اس طرح کھڑی بولی فطری، ٹھیٹ یا خالص بولی کو کہتے ہیں۔ پانڈے شاید اسے ٹھیٹ یا خالص اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش نہیں۔

کھڑی بولی کی سرپرستی اور ترقی میں مسلمانوں اور اُردو والوں کا خاص ہاتھ ہے۔ چندر دھر شرما گلیری کے مشاہدے کا اُردو ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"کھڑی بولی یا پکی بولی یا ریختہ یا جدید ہندی کے ابتدائی عہد کی نثر و نظم کو دیکھ کر یہی جان پڑتا ہے کہ اُردو تخلیق میں فارسی عربی تت سموں یا تت بھووں کو نکال کر سنسکرت یا ہندی تت سم اور تدبھو رکھنے سے ہندی بنالی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہندو تو اپنے گھروں کی صوبائی بولی میں رنگے تھے۔ ان کی روایتی شیرینی انھیں عزیز تھی۔ باہری مسلمانوں نے آگرہ، دلی، سہارنپور اور میرٹھ کی بھاشا کو کھڑی کر اپنے لشکر اور سماج کے لیے مفید بنایا۔ کسی صوبائی بھاشا سے ان کو روایتی لگاؤ نہ تھا۔ ان کی بھاشا عوام کی یا قومی زبان ہو چلی۔ ہندو اپنے اپنے صوبوں کی بھاشا کو نہ چھوڑ سکے۔ اب تک یہی بات ہے۔ ہندو گھرانوں کی بولی صوبائی ہے خواہ لکھا پڑھی اور ادب کی زبان ہندی ہو۔ مسلمانوں میں بہتوں کے گھر کی بولی کھڑی بولی ہے۔ درحقیقت اُردو کوئی بھاشا نہیں ہے ہندی کی ذیلی بولی ہے لیکن ہندوئی زبان بنانے کا کام مسلمانوں نے بہت کچھ کیا۔ اس کی عمومیت بھی انھیں کی مہربانی سے ہوئی۔ پھر ہندوؤں میں بیداری ہونے پر انھوں نے ہندی کو اپنالیا۔ ہندی نثر کی بھاشا للولال جی کے وقت سے

شروع ہوئی ہے۔ اُردو نثر اس سے پرانی ہے۔ کھڑی بولی کی شاعری ہندی میں نئی ہے۔ ابھی تک برج بھاشا بنام کھڑی بولی کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اُردو نظم کی بھاشا اس کے بہت پہلے ہوگئی ہے۔ پرانی ہندی نثر اور نظم کھڑے روپ میں مسلمانی ہے۔ ہندو شاعروں کی یہ روایت رہی ہے کہ ہندو کرداروں سے صوبائی بھاشا کہلاتے تھے۔ اور مسلمان کرداروں سے کھڑی بولی لے[1]"

اس قول میں اُردو بے زاری یا مسلم بے زاری سہی لیکن انھوں نے اعتراف کیا ہے کہ کھڑی بولی کا فروغ اُردو اور مسلمانوں کی بدولت ہوا۔ ہندی نے اُردو کے بعد کھڑی بولی کو اختیار کیا۔ وہ تو بھولے سے یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ جدید ہندی اُردو میں سے فارسی عربی الفاظ نکال کر اُردو سنسکرت الفاظ شامل کر کے بنی ہے لیکن آگے معلوم نہیں کیوں یہ آگے کہہ جاتے ہیں کہ اُردو ہندی کی ذیلی بولی ہے، گویا اُردو سے ہندی بنی اور ہندی سے اُردو۔ یہ اُلجھے ہوتے ذہن کا غماز ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندی رسالوں میں زوروں میں بحث چل رہی تھی کہ ہندی ادب اپنے اظہار کے لیے کھڑی بولی کو اپناتے یا برج کو۔ رادھا چرن گوسوامی نے ہندوستھان بابت ۵ جنوری ۱۸۸۸ء میں لکھا۔ اُردو ترجمے میں ملاحظہ ہو۔

'ہم اندازہ کرتے ہیں کہ اگر کھڑی بولی کی کوشش کی جلتے تو پھر کھڑی بولی کی جگہ تھوڑے دنوں میں خالی اُردو کا پرچار ہو جاتے۔ ادھر سرکاری کتابوں میں فارسی الفاظ گھس ہی پڑے ہیں ادھر شاعری میں بھی فارسی بھری گئی۔ تو سہل ہی جھگڑا نپٹائیے[2]

---

[1] بحوالہ پدم سنگھ شرما: اُردو ہندی اور ہندوستانی (ہندی کتاب ص ۳۰ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۵۱ء۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا

[2] بحوالہ ڈاکٹر کپل دیو سنگھ: برج بھاشا بنام کھڑی بولی۔ ونود پستک بھنڈار اسپتال روڈ آگرہ۔ طبع اول مئی ۵۶

ڈاکٹر کپل دیوسنگھ اپنی کتاب برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی میں لکھتے ہیں۔
" برج بھاشا و کھڑی کے جھگڑے میں ڈر رہتا کہ اُردو کی نقل کرتے کرتے ہندی کوئی اُردو کے کوئی نہ ہو جائیں[1]
ہزاری پرشاد دویدی نے امرت پتر کا بابت ۱۱ اپریل ۱۹۵۳ء میں لکھا۔
' شروع شروع میں کھڑی بولی مسلمانوں کی بھاشا مانی جاتی تھی۔ بعد میں بیدار ہندو مصنفوں نے اسے اس وصف سے آزاد کر دیا[2]
ڈاکٹر سنتی کمار چٹرجی نے کھڑی بولی کی نوعیت کے بارے میں یہ رائے دی ہے۔

"A peculiar thing about Khari Boli Hindi is that those who speak or use it as an inhesitance having this language as the language of the house, have for the last 250 years shown a decided preference for Perso-Arabic words Hindi which is being proposed as the pan-Indian Official lanaguage." [3]

ہندی کے ابتدائی محققین نے کھڑی بولی کے آغاز کے بارے میں کئی قیاس آرائیاں کی ہیں چونکہ یہ لوگ تاریخی لسانیات سے نابلد تھے اس لیے لال بجھکڑ کی طرح قیاس اور تاویل کرتے ہیں۔
بابو جگن ناتھ داس رتنا کر نے ہندی ساہیتہ سمیلن کے بیسویں اجلاس منعقدہ کلکتہ میں کھڑی بولی کی پیدائش برج بھاشا اور پنجابی کے میل سے

---

[1] بحوالہ ایضاً ص ۳۱۔
[2] بحوالہ برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی ص ۴۵ تا ۴۹
[3] آفیشل لنگویج کمیشن رپورٹ ص ۲۷۹
[4] بحوالہ برج بھاشا بہ نام کھڑی بولی ص ۴۵ تا ۴۹

مانی ہے۔ پنڈت شیو نرائن شکل سرس نے رسالہ سدھا بابت جولائی ۴۴ء[1] میں لکھا ہے کہ کھڑی بولی اُردو اور برج بھاشا کے میل سے بنی۔ فعل اور فاعل اُردو کے اور دوسرے لفظ برج بھاشا کے ہیں۔"

ظاہر ہے کہ سرس جی کو تاریخی لسانیات کا کوئی شعور نہیں۔ وہ اُردو اور کھڑی بولی کی تقدیم و تاخیر کا معکوس نظریہ رکھتے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ عجیب بلکہ سچ مچ لال بجھکراز نظریہ لالہ بھگوان دین کا ہے۔

'فارسی میں کچھ برج، کچھ بانگرو کی ٹیک لگا کر کھڑا کر دیا گیا اور اس کا نام پڑ گیا کھڑی بولی'[2]

لالہ جی کو فارسی اور اُردو کا فرق معلوم نہیں۔ چندر دھر شرما گلیری نے بھی کہا تھا کہ کھڑی بولی یا موجودہ ہندی، اُردو تخلیقات میں سے ع. ب. فارسی الفاظ نکال کر سنسکرت ہندی الفاظ رکھنے سے بنائی گئی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی بولی گلکرسٹ کا دیا ہوا نام ہے جو اس نے ہندوستان کی رابطے کی بول چال کی زبان کو دیا۔ اس کا لسانیاتی مفہوم ایک دوسرے مستشرق گریرسن نے متعین کیا۔ اس نے لسانیاتی جائزہ ہند میں مغربی ہندی کی پانچ بولیاں قرار دیں جن میں اہم ترین کھڑی بولی ہے۔ اس کی حدود اربعہ یہ ہیں۔

ہماچل میں کیلسا کے مشرق و جنوب میں، ضلع انبالہ کا مشرقی حصہ، یوپی میں ضلع دہرادون کا میدانی علاقہ، ضلع سہارنپور، مظفر نگر، میرٹھ، ضلع بلند شہر کا شمالی حصہ، ضلع بجنور، مرادآباد اور ضلع رام پور۔

اس علاقے میں یہ شہروں اور دیہاتوں کی واحد بولی ہے۔ دوسرے علاقوں میں شہروں اور مہذب سوسائٹی میں اس کا دخل ہوگیا ہے لیکن ان علاقوں میں کہیں بھی عوامی بولی نہیں۔ وہ لکھنؤ ہو کہ بنارس کہ حیدرآباد۔

---

[1] بحوالہ برج بھاشا بنام کھڑی بولی ص ۴۵ تا ۴۹

[2] بحوالہ ڈاکٹر جیسوال۔ مانک ہندی کا اتہاس۔ ویاکرن جلد اول ص ۲۹۹۔ غیر مطبوعہ نسخہ

جدید ماہرین لسانیات عام طور سے یہ مان کر چلتے ہیں کہ مغربی ہندی شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی۔ اہل اُردو میں سب سے پہلے شوکت سبزواری نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شورسینی سے کھڑی بولی پیدا نہیں ہوئی، برج ہوئی ہے۔ برج کو کھڑی بولی کی نہ ماں کہا جا سکتا ہے نہ بہن[1]

انھوں نے ایک طرف کھڑی بولی اور دوسری طرف شورسینی اَپ بھرنش و شورسینی پراکرت کے بہت سے اختلافات دکھا کر دعوا کیا کہ کھڑی بولی ان سے ماخوذ نہیں[2]۔ الہ آباد یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ ہندی۔ ڈاکٹر لکشمی ساگر وارشنے نے مجھ سے کہا کہ یہ نظریہ کہ کھڑی بولی شورسینی سے ماخوذ ہے کب کا باطل ہوگیا، یہ صرف اُردو والوں میں باقی ہے۔ راہل سانکر تاین نے کھڑی بولی کو کوروی اپ بھرنش سے ماخوذ کیا ہے۔ لیکن یہ کوروی تھی کہاں۔ یہ راہل کی ایجاد کی ہوئی اپ بھرنش ہے جس کا نہ کوئی نمونہ موجود ہے نہ کہیں اس کا نام آیا ہے۔

ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے کھڑی بولی کی دو خصوصیات گنوائیں۔

۱۔ بہت سے الفاظ کا آ پر ختم ہونا۔

۲۔ حال کے صیغے میں آتا ہے، کرتا ہے وغیرہ

''آ'' کا لہجہ اودوالی شورسینی سے ماخوذ نہیں ہوسکتا۔ آ کی مختلف تاویلیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر اودے نراین تواری اسے پنجابی کا اثر بتاتے ہیں۔ ان کے مطابق پنجابی میں یہ دَردی یا پیشاچی یا کیکئی اپ بھرنش سے آیا لیکن کیکیہ (کیکئی)، اپ بھرنش یا دردی میں مذکر میں آ کی مثالیں نہیں ملتیں۔

۲۔ سنسکرت کا لاحقہ ''ک'' آ میں بدلا مثلاً گھوٹک (گھوڑا، گردبھک (گدھا لوہک (لوہا۔ ستک (دما تھا۔ شوکت سبزواری بھی یہی مانتے ہیں[3]

---

[1] اُردو زبان کا ارتقا ص ۱۰۲۔ [2] داستان زبان اُردو ص ۱۱۵ تا ۱۱۸۔ چمن بکڈپو دلی۔ [3] اُردو زبان کا ارتقا ص ۱۰۸

۳۔ سنسکرت وسرگ (آخر میں آنے والی ہا تے مختفی۔ یا حرکت کی ماترا) 'آ' بن گیا لیکن یہ ادبی زبان میں نہ تھا۔ بولی ادبی زبان سے متاثر نہیں ہوتی۔
۴ بعض کے نزدیک فارسی آ کا اثر ہے لیکن اگر یہ اسلامی اثر ہوتا تو سب سے پہلے سندھ میں ظاہر ہوتا لیکن سندھی 'اُو' آخر والی زبان ہے۔ خود فارسی میں بھی افعال کا خاتمہ آ پر نہیں ہوتا۔

جیسوال آ کو ٹکی یا ٹاکی یا ٹکری اپ بھرنش سے ماخوذ کرتے ہیں۔ مارکنڈے کی ۲۷ اپ بھرنشوں میں ٹکی بھی شامل ہے۔ راج شیکھر نے دسویں صدی میں گاویہ میں لکھا ہے کہ ٹکی ٹک اور بھا ڈنک دیس کی بولی تھی۔ ٹک سے مراد مشرقی پنجاب (موجودہ ہریانہ اور ہندوستانی پنجاب) ہے اور بھادانک دلی، میرٹھ کا علاقہ تھا۔ ٹکی کے نمونے نہیں ملتے۔ گیارہویں صدی میں ایک مصنف راول کیلی (ا، مفتوح الف مضموم واؤ معروف نیز کیلی میں یائے مجہول) کئی خطوں کی محبوباؤں کے بعد ٹکی محبوبہ کا بیان کرتا ہے۔ اس مختصر بیان میں دو مذکر الفاظ آ پر ختم ہوتے ہیں۔ کبڈا، بچھڑا۔ اس کے علاوہ آٹھویں صدی کی ایک کتاب 'کولیہ مالا' میں مدھیہ پر دیش کی بھاشا میں تیرے، میرے لفظ ملتے ہیں جو ٹکی اپ بھرنش کے ہوسکتے ہیں۔ ان الفاظ کو دیکھ کر ڈاکٹر ماتا بدل جیسوال نے نتیجہ نکالا کہ کھڑی بولی ٹکی اپ بھرنش سے نکلی۔

اس نظریے پر دو اعتراض ہیں۔ اوّل تو یہ کہ محض دو الفاظ کی بنا پر ٹکی اپ بھرنش کی 'آ' والی خصوصیت طے کرنا اور صرف ان الفاظ کی وجہ سے کھڑی بولی کو ٹکی سے ماخوذ کرنا مناسب نہیں۔ واضح ہو کہ 'را' ول کیلی کی مندرجہ بالا سطور کے سوا ٹکی اپ بھرنش کا کوئی نمونہ محفوظ نہیں۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ٹک مشرقی پنجاب کا نام تھا۔ ظاہراً ٹکی مشرقی پنجاب کی اپ بھرنش تھی، جو جمنا کے پورب میں نہیں تھی۔ راج شیکھر کی شہادت پر اسے بھادانک یعنی مغربی یوپی تک بڑھا لیا گیا۔ تاکہ اسے کھڑی بولی کے علاقے پر بھی منطبق کیا جاسکے۔ اگر ٹکی کھڑی بولی کا

لہ ڈاکٹر جیسوال کا مقالہ ص ۴۴۵

کا ماخذ ہے تو مشرقی پنجابی، ہریانی، کھڑی بولی کا ایک خاندان یا گروہ ہوگا اور برج، قنوجی اور ہندی کا دوسرا گروہ۔ اس طرح مغربی ہندی کا گروہ ٹوٹ جائے گا۔ گریرسن اور چٹرجی جیسے ماہرین کے فیصلے کے برخلاف ہیں مغربی ہندی کے زمرے سے انحراف کی مجال نہیں۔ ٹکی کو کھینچ تان کر مشرق میں میرٹھ تک بھی لے آیا جاتے تو بھی وہ کسی طرح گنگا کے پورب میں بجنور، مرادآباد اور رام پور تک نہیں پہنچ سکتی۔ اس طرح نہ صرف مغربی ہندی کے زمرے کے بلکہ کھڑی بولی کے علاقے کے بھی حصے بخرے ہو جاتیں گے۔ میرٹھ کی بولی لاہور کی بولی کے ساتھ ایک گروہ میں آجاتے گی اور مرادآباد کی بولی سے مختلف قرار دی جاتے گی حالانکہ لاہور کی زبان اور میرٹھ کی زبان میں وہ قرب نہیں جو لاہور کی زبان اور مغربی پنجاب کی زبان میں ہے۔ اس طرح ٹکی کو کھڑی بولی کے مغربی علاقے اگنگا جمنا کے دوآبے تک مسلط کرنا تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ ٹک علاقے کی اپ بھرنش میرٹھ اور رام پور وغیرہ کی کھڑی بولی کو جنم نہیں دے سکتی۔

اہل اُردو کے لیے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کھڑی بولی کس اپ بھرنش سے نکلی جب کہ ہندی سنسکرت کے علما میں بھی اتفاق نہیں۔ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ الہ آباد یونیورسٹی میں سنسکرت کے پروفیسر رہ چکے ہیں۔ ساگر یونیورسٹی میں لسانیات کے پروفیسر تھے۔ تاریخی لسانیات کے ماہر ہیں۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہ چکے ہیں میں نے ان سے پوچھا کہ کھڑی بولی کس اپ بھرنش سے نکلی ہے۔ انھوں نے جواب دیا" بھائی میں نہیں جانتا۔ ڈاکٹر ہردیو باہری سے پوچھو" جب ڈاکٹر بابو رام سکینہ جیسا سنسکرت، پراکرت و اپ بھرنش اور لسانیات کا عالم اس بارے میں کچھ نہ کہنا چاہے تو ناواقفان اُردو کیونکر فیصلہ کرسکتے ہیں۔ ہم اپ بھرنش کا نام لیے بغیر یہی کہہ سکتے ہیں کہ اپ بھرنشوں کے آخری دور میں دلی، میرٹھ، مرادآباد، رام پور وغیرہ میں جو اپ بھرنش بولی جاتی تھی کھڑی بولی اسی کا ترقی یافتہ روپ ہے۔ ہم اس اپ بھرنش کو نام نہیں دے سکتے۔ ہوسکتا ہے یہ مشرقی پنجاب کی ٹکی اب بھرنش اور آگرے کی شورسینی اپ بھرنش کے بیچ کا کوئی روپ ہو۔

ھندوستانی

یہ نام یورپیوں کا دیا ہوا ہے لیکن اس سے پہلے ہم دکن میں اس لفظ کے استعمال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ پیرس کے قومی کتب خانے میں ایک مخطوطہ افسانۂ ہندی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے یورپ میں دکھنی مخطوطات میں اس کا ذکر کیا ہے اس کی ابتدا یوں ہے۔

" شروع کرتا ہوں میں اس زبانِ ہندوستانی کو خدا کے نام سوں • کیسا خدا کہ آسمان و زمین کتیں (کے تئیں) خدا اپنے کُن فیکون کے اشارہ سوں پیدا کیا ہے .....

" تمام بزرگ اور زمانہ کر (کے) دانش مندو سیں عرض کرتا ہوں کہ اس زبان ہندوستانی کر (کے)، درمیان کچّے زبان کیسو صاحبان کے نظر موں آوے اس کتیں اپنے مبارک زبان سیں صحیح فرمانوں گے اور کنے والا تقصیر نہ لوں گے"۔[1]

اس کی زبان کے پیشِ نظر میرا اندازہ ہے کہ یہ کتاب اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف دوم کی تصنیف ہوسکتی ہے۔ اس کی ابتدا میں دو جگہ 'زبان ہندستانی' آیا ہے۔ وجہی نے سب رس میں زبان ہندوستان کہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ نسخے میں زبان ہندوستان ہی لکھا ہو اور اسے نصیر الدین ہاشمی نے زبان ہندوستانی پڑھ لیا ہو۔ بہرحال اگر یہ ہندوستانی بھی ہے تو اسے شمال ہند کی زبان کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ انگریزی وضع کردہ لفظ ہندوستانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ابتدائی مستشرقین نے لغت اور قواعد کی کتابیں پرتگالی، لاطینی، ڈچ اور انگریزی میں لکھیں۔ وہ ابتداً اس زبان کو (Indostan Language) کہتے تھے ایک سیاح (John Fryer) نے ایک انگریز درویش ٹام کوریٹ (Tom Coryate) کا ذکر کیا ہے جو ۱۶۱۶ء میں ہندوستان میں تھا اور جسے انڈستان

---

[1] نصیر الدین ہاشمی : یورپ میں دکنی مخطوطات ص ۲۴۶

زبان پر پوری قدرت حاصل تھی[1] عتیق صدیقی نے لکھا ہے کہ ۱۶۳۰ء میں فارسی ہندوستانی، انگریزی و پرتگالی لغت سورت میں مرتب کیا گیا[2] لغت کے بارے میں مزید تفصیل نہیں دی لیکن ظاہراً یہ پرتگالی میں مرتب ہوئی ہوگی۔ اس میں ہماری زبان کے نام میں ہندوستانی یا اس کا مترادف پرتگالی لفظ رہا ہوگا۔ گریرسن کے بیان کے مطابق ایک یورپی پادری (Franciscuss M Turonensico) نے ۱۷۰۴ء[3] میں ہندوستانی زبان کی ایک لغت ۱۷۰۴ء میں لکھی۔ ایک زمانے میں اس کا مسوّدہ شہر روم کے کسی کتب خانے میں محفوظ تھا مگر ۱۸۹۰ء میں گریرسن نے اس کی تلاش کی تو نہ مل سکا۔ اس کے بعد ہالینڈ کے باشندے جون جوشوا کیٹیلر (John Toshna Keterlaser) نے غالباً ۱۷۱۵ء[4] میں لاطینی میں (Lngo Hindustanica) لکھی۔ ۱۷۴۴ء میں جرمن پادری شلز نے گرامٹکا ہندوستانکا[5] لکھی۔ اس کے بعد مختلف مستشرقین اس زبان کی قواعد اور لغت تیار کرتے رہے۔ اور ان کی زبان کو ہندوستانی کہتے رہے۔

۱۷۸۵ء میں گلکرسٹ نے کمپنی سے اپنی انگریزی ہندوستانی لغت کے بارے میں مراسلت شروع کی۔ اس کی (A Dictionery, English and Hindustani) کی پہلی جلد ۱۷۸۶ء میں اور دوسری جلد ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی[6] یہ جلدیں ڈاکٹر مختارالدین احمد کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہیں اور عتیق صدیقی نے اپنی کتاب

---

[1] لکشمی ساگر وارشنے: فورٹ ولیم کالج ہندی ص ۳ بحوالہ عتیق صدیقی: گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۷۴

[2] گلکرسٹ اور اس کا عہد ص ۲۷۲

[3] ایضاً ص ۵۰ - ۴۹ عتیق صدیقی نے اس بیان کے لیے رام بابو سکسینہ کی تاریخ کے حصّہ نثر ص ۵ کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے اس تاریخ میں یہ بیان نہیں مل سکا۔

[4] رام بابو سکسینہ: تاریخ ادب اُردو حصہ نثر ص ۱۷ ایڈیشن ۱۹۵۲ء لکھنو۔ حامد حسن قادری: داستان تاریخ اُردو ص ۷ دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۰ء آگرہ نیز عتیق صدیقی ص ۲۷۲

[5] رام بابو سکسینہ حصہ نثر ص ۱۷۔ نیز عتیق صدیقی ص ۲۷۲

[6] عتیق صدیقی ص ۹۱۔

کے آخر میں اس کے سرورق کا عکس دیا ہے۔ گویا ۱۷۸۹ء میں انگریزی میں پہلی بار اس زبان کے لیے ہندوستانی کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد گلکرسٹ کی تصانیف میں متعدد بار یہ لفظ ملتا ہے۔ اس نے ۱۷۹۶ء میں انگریزی میں ہندوستانی زبان کی قواعد شائع ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی شعبہ قائم کیا گیا جس کا پروفیسر گلکرسٹ تھا۔ کلکتہ میں ہندوستانی پریس بھی قائم ہوا۔ اس کے بعد ہندستانی لفظ عام ہو گیا۔

ہندی کے مصنفین یہ کہتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج کی ہندوستانی دراصل اُردو تھی۔ ڈاکٹر دارشنے لکھتے ہیں۔

"کمپنی نے جس ہندوستانی کو اپنایا تھا۔ وہ عربی، فارسی آمیز، خاص طور ہندوستانی یا اُردو تھی۔"[1]

چونکہ کمپنی کے ہر ملازم کو فارسی سیکھنی پڑتی تھی اس لیے ہندوستانی لکھنے بولنے میں بھی وہ فارسی الفاظ استعمال کرتے تھے۔ ہندی کے آغاز کے بعد مستشرقین نے ہندوستانی کا لفظ اردو کے لیے مخصوص کر دیا۔ برٹش میوزیم، انڈیا آفس وغیرہ کے اردو مخطوطات اور مطبوعات کی فہرستوں کو ہندوستانی مخطوطات و مطبوعات کی فہرست کہا جا سکتا ہے۔

بیسویں صدی میں ہندوستانی کا جدید مفہوم سامنے آتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مفہوم گریرسن کا عطا کردہ ہے۔ اس نے لسانیاتی جائزۂ ہند حصہ اوّل باب ۵ میں کھڑی بولی کے دو روپوں اُردو اور ہندی کا ذکر کیا۔ اس کے بعد اس نے ان دونوں کی قدرِ مشترک کا نام ہندوستانی قرار دیا لیکن وہ کھڑی بولی کو بھی ورناکیولر ہندوستانی کہتا ہے۔ مہاتما گاندھی نے اسی کو اپنایا۔ یہ دونوں رسوم الخط یعنی دیوناگری اور اُردو میں لکھی جاتی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشکل عربی فارسی اور سنسکرت الفاظ نہیں لاتے تھے۔ ایسی زبان بات چیت اور قصے کہانی کے لیے تو کفالت کر سکتی ہے لیکن علمی و ادبی موضوعات

بالخصوص تکنیکی علوم کے لیے کافی نہیں ہوگی۔ وہاں عربی یا سنسکرت میں سے کسی ایک کا سہارا لینا ہوگا۔ بہرحال ہندوستانی سے مراد کھڑی بولی ہی ہے ہمارے دستور میں دفعہ ۳۵۱ میں اس کا ذکر آگیا ہے۔

It shall be the duty of the Union to promote the spread of the Hindi Language..... to secure its enrichment by assimilating without interfering with its genuis, the forms, style and expressions used in Hindustani and in the other languages of India specified in the English Schedule.

یہ ہندوستانی ہی ہندوستان میں عام رابطے کی زبان ہے۔ اسے لسانیاتی اصطلاح میں کھڑی بولی کہتے ہیں عرف عام میں ہندوستانی جو حضرات اپنی زبان کو اردو یا ہندی کہتے ہیں وہ اسی ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں۔

ہندوستان کے رسوم الخط

لسانیات کی دنیا میں ہندوستان کہہ کر عظیم تر ہند مراد لیا جاتا ہے جس میں جنوبی ایشیا کے سبھی ممالک شامل ہیں۔ یہاں کی قدیم ترین تہذیب وادی سندھ یعنی موہن جوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب ہے۔ مارشل کے مطابق یہ سوا تین ہزار سے لے کر پونے تین ہزار قبل مسیح کی ہے۔ اسی تہذیب کی دین ایک رسم تحریر ہے جسے آج تک پڑھنے میں کما حقہٗ کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ پُراسرار رسم خط ہجائی نہیں تھا۔ اس نے ہندوستان میں فن تحریر کے ارتقا پر کوئی اثر نہیں چھوڑا اس لیے ہم نظرانداز کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

آریہ فن تحریر کے پُرجوش حامی نہ تھے۔ وہ مذہبی صحیفوں کو ازبر کرنے پر زور دیتے تھے تاکہ ان پر ایک فرقے کی اجارہ داری رہے اور نچلے فرقوں کی ان تک رسائی نہ ہو سکے۔ ہندوستان میں فن تحریر کب سے ملتا ہے اس کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ رگ وید میں لکھا ہے کہ گایوں کے کانوں پر آٹھ کی گنتی ہوتی تھی۔ رگ وید کو بعد از بعد ۱۲۰۰ ق م کا مانا جاتا ہے۔ اگر رگ وید کے اس اندراج کو پایۂ اعتبار نہ بھی دیا جائے تو چھاندوگیہ اپنشد کی ایک سطر میں اکشر کا لفظ ہے اور تیتریہ اپنشد کے ایک جملے वर्ण : स्वर मात्रा वलम् میں صاف صاف ورن سور اور ماترا کے الفاظ پاتے جاتے ہیں۔ اس سے یقینی ہے کہ اس وقت تک فن تحریر مکمل ہو چکا تھا۔ اپنشدوں کا زمانہ ۸۰۰ ق م تا ۶۰۰ ق م ہے اور یہی ہندوستان میں تحریر کی بسم اللہ کا عہد ہے۔

ہندوستان کے قدیم ترین رسم خط دو ہیں۔ کھروشٹھی اور براہمی۔ کھروشٹھی عظیم تر ہند کے شمالی مغربی حصے میں رائج رہی۔ اس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی تک کا مانا جا سکتا ہے۔ اس کے قدیم ترین نمونے

شہباز گڑھی اور منصورہ میں اشوک کے دو شلالیکھ ہیں۔ کھروشٹھی کو شمالی سامی کی آرامی شاخ سے ماخوذ کیا جاتا ہے۔ اس رسم خط نے کسی دوسرے خط کو جنم نہیں دیا اس لیے براہمی کے مقابلے میں اس کی اہمیت بہت کم ہے۔

جس طرح یورپ کے تمام خط یونانی سے ماخوذ ہیں اسی طرح ہندوستان کی تمام لپیاں براہمی کی اولاد ہیں۔ اس کا قدیم ترین نمونہ ضلع بستی کے گاؤں پیراوا کے ایک برتن پر اور ضلع اجمیر کے گاؤں بڈلی کے شلالیکھ پر ملا ہے۔ راتے بہادر گوری شنکر ہیرا چند اوجھا کے مطابق ان کا زمانہ پانچویں صدی ق م کا ہے۔ لیکن دوسروں کے نزدیک کچھ بعد کا ہے۔ دوسرے قدیم نمونے چوتھی صدی ق م کے ملتے ہیں۔ اگر ہندوستان میں فن تحریر کا آغاز آٹھویں صدی ق م میں ہو گیا ہو تو تب سے چوتھی صدی ق م تک تحریری نمونے نہ ملنے کی یہ وجہ ہوئی کہ اس عہد میں بھوج پتر یا تاڑ کے پتوں پر لکھتے تھے جو امتداد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اشوک کی لاٹیں زیادہ تر براہمی خط میں ہیں۔ اس کا استعمال چوتھی صدی عیسوی کے وسط تک رہا۔

براہمی صوتی اور ہجائی یعنی الفبائی خط ہے۔ ہجائی حروف یک بیک پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ کسی لفظ نقشی یا رکنی خط ہی سے ارتقا پا سکتے ہیں۔ براہمی کس خط سے نکلی؟ یہ ہندوستان کی ایجاد ہے یا باہر کی۔ ان سوالوں پر غضب کا اختلاف رائے ہے۔ بیشتر علما اسے باہر کے خط سے ماخوذ مانتے ہیں۔ مگر چند ہندوستانی علما اسے ہندالاصل کہنے پر مُصر ہیں۔ واضح ہو کہ کھروشٹھی کے بیشتر اور براہمی کے چند نمونے داتیں سے باتیں کو لکھے بھی ملتے ہیں۔

براہمی خط سے مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں مختلف اسالیب اور شاخیں رونما ہوئیں۔ براہمی کا اصل زمانہ ۳۵۰ء کے قریب تک کا ہے۔ اس وقت اس کے تین خاص اسلوب تھے۔

۱۔ موریہ اسلوب جو اشوک کی لاٹوں اور شلالیکھوں پر ملتا ہے۔

۲۔ کلنگ اسلوب جو اجنتا اور ایلیفنٹا کے غاروں میں ملتا ہے۔

۳۔ شنگ اسلوب جو دوسری عیسوی میں گرنار کاٹھیاواڑ میں ملتا ہے۔

براہمی کا وسطی دَور چوتھی سے دسویں صدی تک کا ہے ۔ جب کہ براہمی کی اولادیں اور موجودہ خطوط کے مورث سامنے آتے ہیں اس عہد میں دو اہم شاخیں گپت اور ولبھی ہیں ۔

گپت خط کا تعلق مگدھ کے راجاؤں کے گپت خاندان سے ہے۔ اس خاندان کا پہلا بڑا راجہ چندر گپت اول چوتھی صدی میں ہوا ہے اور یہی گپت خط کی ابتدا کا عہد ہے ۔ اس سے دو مزید اسالیب ارتقا پذیر ہوتے ۔

ا ۔ ہمالیائی اسلوب جس سے تبت ، نیپال اور آسامی قبیلوں کے کچھ خطوط نکلے۔

ب ۔ گپت خط کی مغربی شاخ سے چھٹی صدی میں سدھ ماترا خط اور اس سے ساتویں صدی میں کٹل خط نکلا ۔ یہ گیارہویں صدی تک مروج رہا ۔ کٹل ہی نے آٹھویں میں ناگری خط کو جنم دیا ۔

ولبھی خط چوتھی پانچویں صدی عیسوی میں براہمی کے سنگ اسلوب سے نکلا۔ گپت خاندان کے زوال پر کاٹھیاواڑ میں ولبھ راجاؤں کا عروج ہوا ۔ سُنگ خط کی طرح ولبھی خط کا مرکز بھی کاٹھیاواڑ ہے ۔

چوتھی صدی کے وسط سے براہمی کی دکنی شاخ علٰحدہ ہو جاتی ہے ۔ ولبھی خط کا دکنی شاخ پر واضح اثر ہے ۔

دسویں صدی کے قریب جدید رسم الخط اُبھر کر سامنے آتے ہیں ۔ ہم ایک ایک کو لیتے ہیں ۔

دیوناگری : کُٹل خط سے آٹھویں صدی میں ناگری کا ارتقا ہوا ۔ دکن میں اسے نندی ناگری اور شمال میں دیوناگری کہا جاتا ہے ۔ گیارہویں صدی تک اس کا شمال میں عام رواج ہو گیا تھا ۔ اس میں سنسکرت ، ہندی ، مراٹھی اور نیپالی زبانیں لکھی جاتی ہیں ۔ اس کی ترتیب حروف کسی ماہر صوتیات کی قائم کی ہوئی ہے ۔ یہ دنیا کے بقیہ تمام خطوط کی نسبت آوازوں کو زیادہ صحت کے ساتھ ادا کرتا ہے گو یہ بھی ہماری جملہ آوازوں کو صحیح صحیح ظاہر نہیں کرتا ۔ اس کا سب سے بڑا غیر سائنسی پہلو مصمتوں کو سارے اور آدھے میں تقسیم کرتا ہے اور یہ म یعنی زبر کے لیے کوئی ماترا نہ دینے کے باعث ہے ۔ ساکن مصمتوں کو ادا

کرنے کے لیے جو بھانت بھانت کی آدھی شکلیں لکھی جاتی ہیں۔ انھوں نے اس خط کو کافی الجھا دیا ہے۔

ناگری کی شارٹ ہینڈ قسم کیتھی یا مُنڈی ہے جو مہاجنوں کے بہی کھاتے لکھنے کے کام آتی ہے۔ اس میں اوپر کی لکیر اور ماترائیں نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے اسے جو لکھے وہی صحیح پڑھ سکتا ہے۔

بنگلہ: اس کے آغاز کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایس۔ این چکرورتی کے مطابق ساتویں صدی میں گپت خط کی مشرقی اور مغربی دو شاخیں ہو گئیں۔ مشرقی شاخ سے دسویں صدی میں قدیم بنگلہ لپی نکلی۔ اتنا تو واضح ہے کہ بنگلہ اور ناگری کے تمام حروف کی ترتیب یکساں ہے۔ آسامی بھی بنگلہ خط میں لکھی جاتی ہے بنگلہ ہی سے اڑیا اور بہار کے خط میتھلی کیتھی نکلی۔

گجراتی خط قدیم ناگری کی مغربی شاخ سے نکلا۔

اب لیجیے شمال مغرب کے خطوط کو۔

براہمی کی کٹل شاخ سے آٹھویں تا دسویں صدی میں شاردا لپی نکلی۔ یہ کشمیری زبان کی قدیم لپی ہے۔ شاردا سے کشمیر، ہماچل اور پنجاب کے موجودہ خطوط نکلے ان میں ٹکری، لنڈا اور کشتواڑی اہم ہیں۔ ٹکری کو گریرسن شاردا خط کی بہن اور بوہلر شاردا کی بیٹی مانتا ہے۔ ٹکری سے ڈوگری اور چمپالی خط نکلے۔ لنڈا سے قدیم سندھی اور گرمکھی خط نکلے۔ ٹیلر گرمکھی کو دیو ناگری اور گجراتی کی درمیانی منزل قرار دیتا ہے اور جان بیمز اسے کٹل سے براہ راست ماخوذ کرتا ہے۔ لیکن کٹل لپی زیادہ سے زیادہ گیارہویں صدی تک ملتی ہے اور گرمکھی کئی صدی بعد کی ہے اس لیے اسے شاردا سے ماخوذ کرنا ہی صحیح ہے۔

اب دکنی لپیوں کی داستان سنیے۔ ۳۰۰ ق م ہی سے دکن میں براہمی کے کتبے ملنے لگتے ہیں۔ ان میں ابتدائی کلنگ خط اور ابتدائی آندھرا خط قابل ذکر ہیں۔ ان سے دوسری اور چوتھی صدی عیسوی کے بیچ جو خط نکلے۔ انھوں نے موجودہ دکنی لپیوں کے ارتقا میں اہم رول ادا کیا۔

پیچھے کاٹھیاواڑ کے ولبھی خط کا ذکر آچکا ہے اس سے چالوکیہ خط نکلا۔

جو چھٹی صدی عیسوی میں شروع ہونے والے چالوکیہ خاندان سے متعلق ہے۔
دسویں صدی عیسوی میں ضلع امراوتی میں چالوکیہ خط کے جو شلالیکھ ملتے ہیں انھیں کرشنا خط کہا جاتا ہے۔ اسی کرشنا خط سے تیلگو کنڑ خط ارتقا پایا۔ واضح ہو کہ تیلگو اور کنڑ ایک ہی خط میں لکھی جاتی ہیں۔

گرنتھ خط : چونکہ تامل زبان میں بہت کم آوازیں ہیں اور اس کے خط میں بہت کم حروف ہیں اس لیے یہ خط سنسکرت صحیفوں کے ڈھب کا نہ تھا۔ تاہم برہمنوں نے اپنی مقدس کتابیں لکھنے کے لیے پانچویں صدی میں گرنتھ کا استعمال کیا جو براہمی کی دکنی شاخ سے نکلا ہے۔ اس کے چار ادوار ہوتے ہیں۔ قدیم گرنتھ سے جدید گرنتھ خط چودھویں پندرہویں صدی میں ظاہر ہوا۔

وٹ لُتّو خط۔ وٹ لتّو کے معنی ہیں مدوّر خط اور اس کے حروف گول ہوتے ہیں۔

تامل خط۔ بوہلر کے مطابق چوتھی یا پانچویں صدی میں یہ خط براہ راست براہمی کی جنوبی شاخ سے نکلا اور بعد میں گرنتھ خط سے متاثر ہوا لیکن برنیل کے بقول یہ گرنتھ خط سے نکلا ہے۔ اس کے آخری چار حروف وٹ لُتّو سے لیے گئے ہیں۔ پندرہویں صدی تک موجودہ تامل خط مکمل ہو چکا تھا۔ اس میں دیوناگری کے مقابلے میں بہت کم حروف ہیں۔

نویں دسویں صدی میں گرنتھ خط سے تلو ملیالم خط نکلے۔ تلو خط خوشنما ہے ملیالم خط بے ڈھنگا۔ سترہویں صدی سے ملیالم لکھنے کے لیے وٹ لُتو کی جگہ یہ استعمال ہونے لگا۔ موجودہ ملیالم خط بے شک گرنتھ خط سے نکلا ہے لیکن وٹ لُتّو اور تامل خط سے بھی متاثر ہے۔

کچھ ایسے رسوم خط بھی ہیں جو براہمی کی وسیع قلم رو سے باہر ہیں۔ یہ ہیں عربی فارسی سے ارتقا یافتہ خط جو پشتو، بلوچی، سندھی، پنجابی، کشمیری اور اُردو کے لیے استعمال ہوتے۔ پشتو اور بلوچی ایرانی زبانیں ہیں۔ اُردو کے لیے فارسی خط میں کچھ نشانات کا اضافہ کیا گیا۔ سندھی میں نشانات کی تعداد اُردو سے بھی زیادہ ہے وہاں کئی حروف چار نقطوں کی مدد سے لکھے جاتے ہیں۔ پنجابی کو سکھ گرمکھی میں

لکھتے ہیں اور مسلمان اُردو خط میں۔ کشمیری کے لیے بھی اب شاردا خط کے بجائے اردو خط ہی استعمال ہونے لگا ہے۔

اس جائزے سے معلوم ہوگا کہ ہندوستان رسوم الخط کی جنت ہے۔ تمام سفید اقوام کے پاس اتنے رسوم الخط نہیں جتنے تنہا ہندوستان میں ہیں۔ سنسکرت زبان نے صرف ہند آریائی زبانوں کو جنم دیا لیکن براہمی خط نے نہ صرف ہند آریائی اور دراوڑی زبانوں کے خطوط فراہم کیے بلکہ تبتی، برمی، سنگھالی، ہندچینی، جاوائی اور فلپینی زبان تک کو اپنے ہی روپ دیے۔ غرضیکہ رسم الخط کا مطالعہ عظیم تر ہندوستان کی وحدت رفتہ کی دل کش داستان ہے۔

مشترک رسمِ خط

ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے ایک رسم الخط کی بات بہت پرانی ہے۔ غالباً سب سے پہلے بال گنگا دھر تلک نے یہ آواز اٹھائی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں کاشی ناگری پرچارنی سبھا کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا[۱] "ہندوستان کی تمام زبانیں ایک لپی میں لکھی جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ اور وہ لپی دیوناگری ہی ہو سکتی ہے۔ جس طرح لارڈ کرزن نے پورے ملک کو ایک اسٹینڈرڈ ٹائم دیا ہے، اسی طرح سرکاری حکم سے ایک لپی بھی رائج کر دی ہوتی تو کتنا آسان ہوتا۔"

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تلک کو احساس تھا کہ اور تو اور بنگالی اور گجراتی بھی دیوناگری کے حق میں اپنی لپی سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہوں گے۔[۲] ۱۲ مئی ۱۹۰۵ء کو ڈاکٹر شیام سندر داس نے اسی موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ "بنگالی کہتے ہیں کہ ہماری (یعنی مراٹھی اور ہندی کی) دیوناگری مسخ شدہ ہے، اصل دیوناگری ان کی ہے؛ اور یہ کچھ غلط بھی نہیں کیوں کہ پُرانے شبد لیکھوں کے حروف بنگلا لپی سے بالکل ملتے ہیں۔"

۱۹۰۵ء ہی میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جسٹس شاردا چرن متر نے ملک کی سب زبانوں کے لیے دیوناگری لپی کی وکالت کی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ لنکا، برما، چین، جاپان، سماترا وغیرہ میں بھی وہ دیوناگری رائج کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک ماہنامہ "دیوناگر" نکالا جس میں ہندوستان کی اہم زبانوں کے کچھ اقتباسات دیوناگری میں چھاپے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "ایک لپی وستار پریشد" قائم کیا جس کا ہر سال اجلاس ہوتا تھا۔ ۱۹۲۸ء تک مہاتما گاندھی بھی دیوناگری لپی کے حامی تھے۔ انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاسِ مدراس میں کہا کہ تامل ناڈ میں ۹۰ فی صد لوگ بے پڑھے لکھے ہیں۔ انھیں دیوناگری جیسی سہل لپی میں تامل پڑھائی جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اس عقیدے کے تحت گاندھی جی نے گجراتی میں اپنی "آتم کتھا" لکھی تو گجراتی کے بجائے دیوناگری لپی استعمال کی۔ آخر میں مہاتما جی ناگری اور اُردو دونوں خطوں کے حامی ہو گئے۔

۱۹۴۸ - ۴۹ ۱۹ء میں ہندسرکار نے یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا۔ اس کے صدر ڈاکٹر رادھاکرشنن نے تمام زبانوں کے لیے مشترک رسم الخط کی بات اٹھائی اور کہا کہ "دیوناگری نہ صرف ہندی اور مراٹھی کی لپی ہے، بلکہ سنسکرت کی بھی۔ اس طرح ہندستان کی تمام زبانوں کو ایک لپی میں لکھنا ہے، تو کثرتِ استعمال کی بنا پر دیوناگری ہی اس کی مستحق ہے۔" آفیشل لینگویج کمیشن کی رپورٹ ۱۹۵۶ء میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا ہے اور دیوناگری کی پُرزور وکالت اور رومن کی تردید کی گئی ہے[۱۳]

پارلیمنٹ کی ہندی انجمن (سنسدیہ ہندی پریشد) ایک رسالہ "راج بھاشا" نکالتی ہے۔ اس میں ملک کے اس وقت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے لکھا تھا[۱۴] کہ "ہندستان کی تمام زبانوں کو دیوناگری میں لکھا جائے تو بڑی سہولت ہو، لیکن چوں کہ دراوڑی زبانوں کے لیے کسی قدر دقت ہو سکتی ہے اس لیے سردست ہندوستان کی آریائی زبانوں کے لیے ناگری لپی اختیار کر لینی چاہیے۔" اسی رسالے کے ایک اور شمارے میں آچاریہ ونوبا بھاوے نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا[۱۵] انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ جاپانی اور چینی زبانوں کو بھی اپنی بارہ لپی کو چھوڑ کر دیوناگری لے لینی چاہیے۔

مشترک رسم الخط کے معاملے میں دیوناگری کا واحد حریف رومن رسم خط ہے۔ مستشرقین نے اسے سنسکرت گرنتھوں کے لیے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ پین سلوینیا یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر ایڈگرٹن نے سنگھاسن بتیسی کے جملہ مخطوطات جمع کر کے اس کا مستند سنسکرت متن رومن رسم الخط میں چھاپا۔ پنچ تنتر کا مستند متن بھی رومن رسم الخط میں چھپ چکا ہے۔ انگریزی عہد میں فوج کو رومن میں ہندستانی پڑھائی جاتی تھی۔ منڈا بولنے والے قبائلی سو سال سے اپنی زبانیں رومن خط میں پڑھ رہے ہیں۔ رومن خط کی وکالت غداری یا وطن دشمنی نہیں۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس بھی اس کے حامی تھے؛ ۱۹۳۸ء کے ہری پورہ کانگریس کے صدارتی خطبے میں فرمایا۔

I am inclined to think that the ultimate solution would be the adoption of a script that would bring us into a line with rest of the world. Perhaps some of our countrymen would gap in horror when they hear

of the adoption of the Roman ipt, but I would beg them to consider the scien...ic and historical point of view. If we do that we shall realise that there is nothing sacrosanct in a script so for as our masses are concerned . Since more than 90% arc illiterate, it would not matter to them which script is introduced when they are educated.

یونیورسٹی تعلیم کی تاراچند کمیٹی نے بھی رومن رسم الخط کی وکالت کی تھی۔ مئی ۱۹۴۸ء میں ہندستانی یونیورسٹی کے وائس چانسلروں کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں کثرت رائے سے یہ طے پایا کہ ملک کی تمام زبانوں کے لیے رومن خط اختیار کیا جائے۔

رسم الخط کا مسئلہ ماہرین صوتیات کا میدان ہے۔ اہل سیاست اس میں خواہ مخواہ در آئے ہیں۔ ہندی کے علاوہ ملک کی دوسری زبانوں کے ماہرین لسانیات عام طور سے رومن خط کے حق میں ہیں۔ ہمارے ملک میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی علمائے لسانیات کے قافلہ سالار ہیں۔ بنگالی سے والہانہ عشق کے باوجود مشترک رسم خط کے طور پر رومن کی وکالت کرتے ہیں۔ اردو میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور پروفیسر ہارون خاں شروانی رومن خط کے پُرجوش حامیوں میں سے ہیں۔ پاکستان میں بھی کبھی کبھی رومن خط کا نام سننے میں آجاتا ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنے بعض مضامین اور تقریروں میں مخصوص اغراض کے لیے ہندی کو رومن میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ مسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب بدرالدین طیب جی نے غیر زبان کے طلبہ کو رومن خط میں ہندی پڑھوادی تھی جس کے باعث ان دونوں حضرات پر ہندی اخباروں نے بڑی لے دے کی تھی۔

ایک بات خیال میں رہے کہ محض ایک دو زبانوں سے ان کا رسم الخط بدلنے کا مطالبہ کرنا اور بات ہے اور ملک کی سب زبانوں کے لیے ایک مشترک رسم الخط اختیار کر لینے کی خواہش کا اظہار دوسری بات ہے۔ اس مضمون میں صرف دوسرے مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔ ایک پہلو اور بھی ہے۔ کسی زبان کے بولنے والے خود اپنا مروجہ رسم الخط بدلنے کی تحریک کریں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن کسی دوسری زبان والے ان سے یہ مطالبہ کریں کہ "تم اپنا رسم الخط بدل کر ہمارا

رسم الخط اختیار کرلو: ہم تو اپنے خط ہی پر قائم رہیں گے۔" تو اسی سے ان کی نیت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ آفیشیل لینگویج کمیشن کی رپورٹ میں جسٹس تیجا سنگھ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ مشترک رسم الخط کی تحریک ہندی سے ملتی جلتی زبانوں یعنی اُردو اور پنجابی کی مستقل اور آزاد حیثیت ختم کردینے کا حیلہ ہے[1] واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور میں ملک بھر کے لیے ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کیا گیا ہے لیکن مقامی زبانوں کے لیے کسی مشترک رسم الخط کا کوئی مذکور نہیں۔ اس کے برعکس دستور کے سب سے اہم حصے یعنی بنیادی حقوق میں ہر ایک زبان کے رسم الخط کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ دستور کی متعلقہ دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:۔

> Sec. 29 (i) Any section of the citizens residing in the territory of India or any part there of having a distinct language, script or culture of its own shall have the right to conserve the same.

بمبئی میونسپل کارپوریشن نے ناگری دوستی کے جذبے کے تحت یہ طے کیا کہ سندھی کو عربی خط کے بجائے دیوناگری میں پڑھا جائے۔ چنانچہ کارپوریشن کے اسکولوں میں سندھی بچوں کو ان کی زبان ناگری خط میں سکھائی جانے لگی۔ کسی من چلے کے۔ جے۔ گوکلوانی نے بنیادی حقوق کی اسی مندرجۂ بالا دفعہ کے تحت کارپوریشن پر مقدمہ دائر کردیا۔ بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس دیسائی کے فیصلے پر کارپوریشن کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور اب سندھی اپنے رسم الخط ہی میں پڑھائی جارہی ہے۔ غرض یہ کہ جب تک آئین موجود ہے، اُردو کو کوئی شخص اپنا رسم الخط بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ قومی یک جہتی کانفرنس کے سامنے جب ایک رسم الخط کا سوال آیا تھا، تو سب زبانوں کے نمائندوں نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز ترک کردی گئی۔ اس کے باوجود مقامی زبانوں کے بولنے والوں کے دلوں میں شبہات باقی رہے۔ آخر پنڈت نہرو نے ۴؍اکتوبر ۱۹۶۱ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسۂ مدراس میں اپنی تقریر میں یقین دلایا کہ کسی رسم الخط کو ہٹا کر اس کی جگہ دیوناگری کو جبراً نہیں ٹھونسا جائے گا۔ لیکن مشترک رسم الخط کے نام پر ہر طرف سے دیوناگری کا جو یلغار ہوتا رہتا ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پوری طرح جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر کبھی کچھ محدود اغراض کے لیے مختلف زبانوں کو واقعی ایک لپی اختیار کرنی پڑے تو اس کام کے لیے کون سی لپی بہترین رہے گی اور اُردو کو

کس کی تائید کرنی چاہیے۔

رسم الخط کے تین استعمال ہیں (۱) ہاتھ سے لکھنے کے لیے (۲) ٹائپ اور چھاپے کے لیے (۳) پڑھنے کے لیے۔

لکھنے کے لیے وہ خط بہترین ہے جس کے (ا) ہر حرف کو قلم کی ایک ہی کشش میں لکھا جا سکے، اور (ب) تمام حروف ملا کر لکھے جا سکیں تاکہ پورے لفظ کو لکھنے میں قلم کو بالکل اٹھانے کی ضرورت نہ ہو یا کم سے کم اٹھایا جائے۔

ٹائپ اور چھاپے کے لیے وہ خط موزوں ترین ہے جس کے سب حروف کی ہر موقع پر ایک ہی شکل ہو اور جس کا ہر حرف منقطع لکھا جائے۔ نیز حروف کی تعداد جتنی کم ہو اتنی ہی سہولت رہتی ہے۔

پڑھنے میں وہ رسم الخط بہترین ہے (ا) جس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ صحیح پڑھا جا سکے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر آواز کے لیے ایک اور صرف ایک حرف ہو اور ہر حرف کی ایک اور صرف ایک آواز۔ اس سلسلے میں مصوتوں (حروفِ علت) کی صحیح اور مکمل نمائندگی خاص طور سے اہم ہے۔ (ب) جسے تیزی اور آسانی سے پڑھا جا سکے۔ یہ مقصد اس رسم الخط سے سب سے اچھی طرح حاصل ہوگا جس میں ہر حرف علیحدہ علیحدہ لکھا جائے۔ کچھ چیزیں علیحدہ علیحدہ رکھی ہوں تو باریک ہونے پر بھی فاصلے سے نسبتاً واضح نظر آ سکتی ہیں۔ ملی جلی ہوں تو ان کی علیحدہ حیثیت متعین کرنے میں نظر کو دقت ہوتی ہے۔

ایک عام پڑھا لکھا آدمی اپنی روزمرہ کی زندگی میں 'لکھنے' پر جتنا وقت صرف کرتا ہے پڑھنے پر اس سے کئی گنا زیادہ لگاتا ہے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ زبانوں میں ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں پڑھنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے۔ زیادہ تر مطبوعہ یا ٹائپ شدہ مواد پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دورِ حاضر میں کارآمد رسم الخط کے لیے لکھنے کی سہولت زیادہ اہم نہیں، بلکہ اصل ضرورت چھاپے اور مطالعے کی سہولت کی ہے۔

اردو رسم خط

لکھنے کے معاملے میں اردو رسم خط برا نہیں۔ یہ ایک قسم کی مختصر نویسی ہے جس کی وجہ سے اسے بہت تیزی سے لکھا جا سکتا ہے۔ دیکھنے میں بھی اردو تحریر بڑی خوشنما ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اردو خطاطی مصوری کی حدود تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ خط اس دور کے لیے بہت موزوں تھا جب چھاپے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اب اس کی سب سے بڑی کمی یہی ہے

کر یہ چھاپے کی مختلف قسموں مثلاً ٹائپ ، لینو ٹائپ ، رولیری ، ٹیلی پرنٹر وغیرہ کے لیے بہت سُست کام ہے ، کیوں کہ اس میں سب حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں اور مختلف موقعوں کے لحاظ سے ایک ایک حرف کے متعدد روپ ہوتے ہیں۔

پڑھنے کے لیے بھی یہ خط خاصا ناقص ہے۔ یہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں اور بیشتر مصوتوں کے لیے کوئی حرف نہیں۔ حرفوں کے نہایت مختصر اجزا کو ملا کر ایک جا لکھنے کی وجہ سے گڈ مڈ ہو جانے کا کافی امکان ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو رسم خط میں جو لکھا جائے وہ اس صورت میں صحیح پڑھا جا سکتا ہے جب کہ ہم پہلے سے اس لفظ کے تلفظ اور مفہوم کو جانتے ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رسم خط اہلِ زبان ہی کے مصرف کا ہے۔ دوسری زبان والا اگر محض کتاب کی مدد سے اُردو سیکھے تو وہ تلفظ کے معاملے میں کیا کیا گُل نہ کھلائے گا۔ اگر اردو تحریر میں کسی دوسری زبان کا اجنبی لفظ ، شہر یا انسان کا نام آ جاتا ہے تو اہلِ زبان چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس کا صحیح تلفظ کیا ہے مثلاً کارنیلیس ، ایکلس ، ونندیزی ، ٹمبکٹو ، سنندیہ ، پینسلین جیسے الفاظ اردو خط میں صحیح پڑھنا ناممکن ہے تاوقتیکہ پہلے سے ان الفاظ کا تلفظ اور معنی معلوم نہ ہوں۔ حروف کا جو اختصار اور وصل لکھنے کے لیے خوبی ہے وہی سنگِ راہ بن جاتا ہے۔ بقائے اصلح وانسب کے اس دور میں یہ خط کبھی نہیں جیت سکتا۔

میکانکی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہونے کی وجہ سے دوسری زبانوں کے لیے اس کا اختیار کیا جانا تو درکنار ، خود اردو کے لیے بھی اس خط کی بقا کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ملک میں اُردو کے محدود استعمال کی وجہ سے جہاں تک اس زبان کی ضروریات کا تعلق ہے (اور اب ان میں نمایاں اضافہ ہونے کی کوئی امید بھی نہیں) یہ رسم الخط کام دے رہا ہے۔ اس لیے صرف اُردو کا رسم خط بدلنے کی تشویش نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں اگر کسی وقت ملک کی سب زبانیں ایک مشترک رسم خط پر تیار ہو جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ اکیلی اُردو اس اتحاد کی راہ میں حائل نہیں ہو گی اور مشترکہ متفقہ رسم خط کو قبول کرے گی۔ اس سے پہلے محض اردو کو اپنے رسم خط کی قربانی دینے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اس میں کچھ اصلاحیں کر لی جائیں تو کافی ہو گا۔

پچھلے دنوں اُردو رسم خط کی تائید بالکل خلاف توقع حلقے سے ہوئی۔ ہندی کے ماہر لسانیات ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری نے ایک مضمون میں ملک کی سب زبانوں کے لیے دیوناگری کی وکالت کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے ایک فرانسیسی ، ایک کبودی اور ایک امریکی کو لے کر ہندوستان کے

مختلف رسوم خط سکھانے کے الگ الگ تجربے کیے۔ ان کا نتیجہ یہ نکلا۔

۱۔ تامل، تیلگو، کنڑ، ملیالم اور اڑیا کی نسبت دیوناگری رسم خط زیادہ آسان ہے اور کم وقت میں سیکھا جاسکتا ہے۔

۲۔ دیوناگری، بنگلہ اور گرمکھی میں لگ بھگ برابر وقت اور محنت کرنا پڑتی ہے۔

۳۔ گجراتی اور اُردو سب سے سہل ہیں۔

دیوناگری

دیوناگری لپی میں حروف اور الفاظ کے لکھنے میں قلم کو بار بار اٹھانا پڑتا ہے۔ پہلے دو حرف अ اور आ کو دیکھیے۔ چینی حروف کی طرح ہاتھ اور پاؤں پھیلائے پڑے ہیں۔ بھ اور جھ کی بالائی لکیر ٹوٹی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے انھیں لکھنا وقت طلب ہے۔ رومن کے مقابلے میں ہندی لکھنے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ ہندی میں ٹائپ کرنے کی رفتار انگریزی کے مقابلے میں کافی کم ہوتی ہے۔ حروف کے متعدد جوڑوں کی وجہ سے پریس کمپوزنگ میں بھی ناگری کافی وقت لیتی ہے۔ حروف کو ملاکر لکھنے کی وجہ سے خط کو زیادہ باریک نہیں چھاپا جاسکتا اگر حروف باریک ہوں تو آپس میں گڈمڈ ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ چھپائی پھیل جاتی ہے اور پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس رومن چھپائی میں چونکہ ہر حرف علیحدہ لکھا جاتا ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ رومن حروف نہایت باریک ہونے کی صورت میں بھی پڑھے جاسکیں۔ آپ نے ریڈرز ڈائجسٹ کا ایک ڈیڑھ انچ سائز والا نسخہ دیکھا ہوگا۔ ہاتھ کی گھڑی پر چھپے ہوئے انگریزی حروف دیکھیے۔ اتنی باریک طباعت ہندی یا اُردو میں ممکن نہیں۔ ہندی اور انگریزی چھپائی پر فی صفحہ برابر لاگت آتی ہے لیکن باریک ٹائپ کی وجہ سے رومن میں بہت زیادہ مواد آسکتا ہے۔ مدن گوپال نے اپنی کتاب میں ہندی اور انگریزی کے یکساں سائز کے کالم کے الفاظ کا شمار درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

ہندی روزنامہ ہندوستان	۲۲ سطر فی کالم	×	۶ لفظ فی سطر	۱۳۲ الفاظ فی کالم
انگریزی ہندوستان ٹائمس	۳۸ ، ، ،	×	۶ ، ، ،	۲۲۸ ، ، ،
انگریزی اسٹیٹسمین	۳۹ ، ، ،	×	۶ ، ، ، ،	۲۳۴ ، ، ،
اُردو ملاپ	۲۱ ، ، ،	×	۱۱ ، ، ،	۲۳۱ ، ، ،
ہندی وشو بھارتی	۴۰ ، ، ،	×	۱۰ ، ، ،	۴۰۰ ، ، ،
انگریزی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا	۸۴ ، ، ،	×	۱۰ ، ، ،	۸۴۰ ، ، ،

ریلوے ٹائم ٹیبل ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپتے ہیں۔ میرے پیش نظر سنٹرل ریلوے کے ہندی اور انگریزی ٹائم ٹیبل (اپریل تا ستمبر ۱۹۶۵ء) ہیں۔ ان میں صفحات کا تقابل یوں ہے

	ہندی	انگریزی
پہلا ٹیبل بمبئی سے دلّی تک	۱۶ صفحے	۹ صفحے
دوسرا ٹیبل دلّی سے بمبئی تک	۱۷ صفحے	۹ صفحے

مدن گوپال صاحب نے پڑھنے سے متعلق بھی انگریزی اور ہندی کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔[9] انھوں نے ایسے بچوں کو لیا جو ہندی اور انگریزی برابر کئی سال تک پڑھ چکے تھے۔ دونوں سے مقررہ وقت میں ہندی اور انگریزی کی عبارتیں پڑھوائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی میں پڑھنے کی رفتار انگریزی کے مقابلے میں ۲۰ سے ۵۰ فی صدی تک سست تھی۔

رومن کے مقابلے میں دیوناگری کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اس کے استعمال پر قوم کا کتنا زیادہ وقت، محنت اور روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ناگری خط کی خوبیاں یہ کہی جاتی ہیں: (الف) اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہی پڑھا جاتا ہے یعنی تلفظ کو صحیح صحیح لکھنا اور ظاہر کرنا ممکن ہے، (ب) یہ خط مکمل اور سائنٹیفک ہے۔ دیکھیں ان دعووں میں کہاں تک صداقت ہے۔

یہ تسلیم کہ ناگری خط تلفظ کو بڑی حد تک صحت کے ساتھ ادا کر دیتا ہے، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اردو ہندی میں موٹے طور سے ۱۲ مصوتے ہیں، لیکن ناگری میں صرف دس کے لیے علامتیں ہیں۔ خفیف اِے، خفیف اَے اور خفیف اُو کے لیے اردو کی طرح ہندی میں بھی کوئی علامت نہیں۔ اس لیے اس خط میں کہنا، کہرام، سہرا، عوض جیسے الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں ادا ہوسکتا۔ ناگری میں اَے اَئی۔ اَو۔ اَؤ۔ میں کوئی امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ جس کی وجہ سے پنڈت لوگ وَید، جَین، عورت وغیرہ کو وُئید، جئین، عَوُرت بولتے سُنے گئے ہیں कौवा اور तैयार کو "تَے یار" اور "کووا" بھی پڑھا جاسکتا ہے، تلفظ کے مطابق ان کا املا कउवा اور तइयार ہونا چاہیے۔ हैं । में । नहीं । लडकों کے اوپر نون غنہ کی علامت کے طور پر ایک نقطہ لگایا جاتا ہے جو دراصل انوسوار کی علامت ہے۔ اصلاً اس کی جگہ چندر بندو (ँ) ہونا چاہیے جیسا کہ यहाँ میں ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ہندی میں کسی قدر خلفشار ہے۔ رسم خط سے متعلق ایک کتاب[10] کے ایک ہی صفحے پر ایک لفظ کو کہیں आजायें اور کہیں आजाएं لکھا ہے۔ जाय کو य سے لکھا

جاتا ہے، حالاں کہ ہم یہاں ण پڑھتے ہیں نہ کہ य۔ کنیا (لڑکی) میں 'ن' کو مشدد بولا جاتا ہے لیکن ہندی میں غیر مشدد لکھتے ہیں संयम کا تلفظ ہم عموماً सँइयम کرتے ہیں۔ जय اور विजय کو تلفظ سے بے نیاز ہو کر य سے لکھنے پر اصرار ہے حالاں کہ انھیں जै اور विजै بولا جاتا ہے۔

ہندی رسم خط کے سائنٹیفک ہونے کا دعویٰ کچھ ایسا بار بار دہرایا گیا ہے کہ غور کیے بغیر سب اس پر ایمان لے آئے ہیں، حالاں کہ اس کے سائنٹیفک ہونے میں شبہ ہے۔

(۱) فنِ تحریر کے ارتقا میں کئی منزلیں پیش آتی ہیں۔ تصویری، تصوری اور صوتی۔ صوتی منزل کے بھی دو حصے ہیں صوت رکنی اور ابجدی۔ ابجدی رسم خط فن تحریر کے ارتقا کی معراج ہے۔ جدید زبانوں کا رسم خط عام طور پر ابجدی ہے لیکن ناگری اب بھی جزوی طور پر صوت رکنی اور جزوی طور پر ابجدی ہے۔ اس کے مصمتوں کو صوت رکن فرض کر لیا گیا ہے یعنی یہ واحد آوازیں نہیں بلکہ دہری آوازیں ہیں جن کے آخر میں خفیف مصوتہ अ بھی شامل ہے لیکن حسبِ ضرورت اسے حذف بھی کر دیا جاتا ہے اور اس پر کوئی سکون کا نشان (ہلنت) نہیں لگایا جاتا۔ वद्दे میں پہلے द میں अ شامل ہے دوسرے میں نہیں اور دونوں لکھے ایک ہی طرح جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف آخر میں عام ہے بلکہ لفظ کے درمیان میں بھی ہو جاتا ہے مثلاً पहले، निकल، लगभग، करते، आसपास کے وسطی ر، س، گ، پ، ح اور ہ تحریر کے اعتبار سے مفتوح ہیں، لیکن تلفظ میں ساکن ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ ہندی کے مصمتوں میں अ کی آواز شامل ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں دوسرے مصوتوں کی وسطی صورت کو ماترا کی شکل میں ظاہر کیا جاتا ہے وہاں अ کی وسطی شکل کے لیے کوئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔ اگر अ مصمتے کا لازمی جزو ہوتا تو की اور का کا تلفظ कई اور कमला ہوتا۔ درمیانی अ کی کوئی شکل معین نہ کرنے سے ہندی کو کتنی بڑی قیمت دینی پڑی ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں۔ شاید ذیل کی تفصیل سے یہ واضح ہو جائے۔

ہندی میں ایک افسانہ رائج ہے کہ بعض موقعوں پر مصمتے آدھے بولے اور اسی لیے آدھے ہی لکھے جاتے ہیں حالاں کہ صوتیات کی مبادیات جاننے والا بھی بتا سکتا ہے کہ مصمتہ کبھی آدھا نہیں بولا جاتا۔ یہ یا تو پورا بولا جائے گا یا بالکل ہی نہیں بولا جائے گا۔ یہ کہاں کی سائنس ہے کہ [illegible] میں پورا न ہو اور [illegible] میں آدھا، शार میں پورا र ہو اور शर्म میں آدھا۔ शरम اور शर्म میں یہ فرق نہیں کہ ایک میں پورا ہے اور دوسرے میں آدھا، بلکہ یہ کہ پہلے میں 'ر' کے بعد ایک مصوتہ

अग्र ہے جب کہ دوسرے میں "ر" اور "م" کے بیچ میں کوئی مصوتہ نہیں अ के اس حذف کو دکھانے کے لیے مختلف حروف کے بیچ میں دیوناگری کو کیا کیا کھڑاگ کرنا پڑتا ہے۔ مسلسل دو یا تین مصمتوں کے جوڑ (سنیکت اکشر) کیسی کیسی انوکھی شکلیں اختیار کرتے ہیں یہ کسی نوآموز سے پوچھیے جسے اس کا تلخ تجربہ ہے۔ بلامبالغہ کئی سو شکلیں ہیں جو علیحدہ علیحدہ یاد کرنی پڑتی ہیں جیسے तद्भव لفظ میں نیچے لٹکتے ہوئے भ پر رحم آتا ہے

سنیکت اکشروں کے اس ٹڈی دل سے چھٹکارا پانے کا سہل علاج یہ ہے کہ درمیانی अ کے لیے بھی کوئی ماترا وضع کرلی جائے۔ فرض کیجیے یہ ماترا ایک ترچھی لکیر " / " سے ظاہر کی جائے۔ اب ہم کسی مصمتے کو آدھا نہیں لکھیں گے۔ صَدَر بہ دال مفتوح کو स/द/र اور صدر بہ دال ساکن کو स/दर لکھیں گے۔ ستری۔ دھرم۔ پرچار۔ راشٹر۔ کرشی کو یوں لکھیں گے:

सतरी धा/रम पर/चार राषटर करषि

(۲) مصوتوں کی بارہ کھڑی میں अं अः کو بھی مصوتہ ظاہر کیا گیا ہے حالاں کہ یہ دراصل مصمتے ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ऋ کو مصوتہ ماننے پر اصرار ہے۔ حالاں کہ یہ سیدھا سادا रि ہے اور کچھ نہیں۔

(۳) تین خفیف مصوتوں یعنی مختصر اِے، مختصر اَے، مختصر اُو کے لیے کوئی نشان نہیں۔

(۴) ऐ ए کی سالم شکلیں یہ ہیں اور ان کی ماترائیں بالترتیب ै े ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ े ماترا ऐ سے مماثل ہے اپنے سالم حرف ए سے نہیں اور कैसा اور ऐसा اور गए اور ग़े کے جوڑوں میں مماثل آوازیں مختلف انداز سے لکھی گئی ہیں۔

(۵) کئی حرفوں کی دو شکلیں ہیں۔ ہندی کی حد تک श اور ष کے تلفظ میں بھی کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے ایک کو ترک کر دینا چاہیے۔

ایک آواز کے لیے ایک ہی نشان ہونا چاہیے لیکن ہندی میں مثلاً ایک र کی آواز کتنے طریقوں سے لکھی جاتی ہے ملاحظہ ہو۔

रस , धर्म , प्रेम , ट्रेन , कृषि , ऋषि

ان چھ کے چھ لفظوں میں "ر" کی ایک ہی آواز ہے جس میں قطعاً کسی جگہ فرق نہیں۔

(۶) بعض نشانات اپنے ملفوظی مقام سے ہٹ کر لکھے جاتے ہیں ि کی ماترا کو مصمتے سے پہلے لگانا کتنا خلاف حقیقت ہے جیسے لفظ میں ि کی ماترا न्द्र سے پہلے لکھی گئی ہے चन्द्रिका

حالاں کہ بولی اُن کے بعد جاتی ہے   अनार्थी , पुनर्जागरण میں "ر" کی آواز بالترتیب
न اور अ کے بعد بولی جاتی ہے لیکن ان سے دور ہٹ کر لکھے جانے کی وجہ سے ان الفاظ کو "پن جارگرن" اور "انا یوں ر" پڑھا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔

(۷) انوسوار سے کم از کم تین مختلف آوازوں کا کام لیا جاتا ہے لیکن ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ہی آواز ہے۔ چنانچہ संगम , संत सुबह میں تین مختلف آوازوں کے لیے ایک ہی نشان استعمال کیا گیا ہے۔

(۸) کئی نشانات دو مصوتوں کا مجموعہ ہیں   ज्ञ - त्र - क्ष   انھیں یکسر خارج کر دینا چاہیے۔ جس لپی میں اتنی کمیاں ہوں اسے سائنٹیفک کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اصلاح شدہ رومن یا صوتیاتی خط

چوں کہ لکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حرف کو ملا کر لکھا جائے اور پڑھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حرف منقطع ہو اس لیے رومن نے ان متضاد تقاضوں کو آسودہ کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ لکھنے اور چھاپے کے حروف کی شکلیں مختلف کر دیں۔ رومن لکھائی میں قلم کو صرف "i" پر نقطہ لگانے اور "t" کو کاٹنے کے لیے اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی کے مقابلے میں رومن لکھنے میں ۲۰ سے ۵۰ فی صدی تک کم وقت لگتا ہے۔ ادھر منقطع ہونے کی وجہ سے پڑھنا بہت سہل ہو جاتا ہے۔ آپ نے سڑک پر بس سے سفر کرتے ہوئے ہندی اور انگریزی میں کندہ سنگ میل دیکھے ہوں گے۔ موٹر تیز چل رہی ہو تو ہندی میں لکھا ہوا شہر کا نام نہیں پڑھا جا سکتا جب کہ انگریزی میں لکھا ہوا پڑھا جا سکتا ہے۔

رومن رسم خط کے معنی لازماً انگریزی یا فرانسیسی کا خط نہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی میں ہجے کی جو بوالعجبیاں ملتی ہیں انھوں نے رومن کو بدنام کر دیا ہے۔ ان زبانوں میں مستعمل رومن خط بدترین صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ برنارڈ شا کی وصیت کے مطابق انگریزی حروف ہجا میں جو اصلاح ہوئی ہے اس میں کوئی ۲۱ حروف کا اضافہ کیا گیا اور دو حرف یعنی X اور Q نکال دیے گئے ہیں۔ ایک طرف انگریزوں کی روایت پرستی ہے کہ وہ انگریزی املا کی کسی لغویت کو دور کرنے پر رضامند نہیں ہوتی اور دوسری طرف انگریزی بولنے والی قوم کی یہ دھاک ہے کہ آج یہ رسم خط دنیا کا مقبول ترین خط ہے۔ کوئی ۶۰ زبانوں نے اسے اختیار کر لیا ہے لیکن یہ ہر جگہ یکساں نہیں اپنی اپنی زبان کی مخصوص ضروریات کے مطابق اس کے حروف کی آوازوں میں ترمیم کی جا سکتی ہے مثلاً "t" اور "d" اطالوی، اسپانوی اور پرتگالی میں "ت" اور "د" کی آواز دیتی ہیں حالاں کہ

انگریزی میں اس سے مختلف ہے " ch " انگریزی میں چ ، فرانسیسی میں شش اور اسکاچ اور جرمن میں خ اور اطالوی میں ک کا قائم مقام ہے۔ ج کی آواز کے لیے انگریزی میں J یا G ہے، ترکی میں C اور انڈونیشیا میں J یا DJ

رومن کا مکمل اور بہترین روپ بین الاقوامی صوتیاتی تحریر ہے۔ ہندوستان کی ہر اہم زبان کے لیے اس کی علامتیں وضع کرلی گئی ہیں۔ ان کے امتزاج سے جو ہندوستانی I.P.A تیار ہوتا ہے اسے سہل کرنے کے لیے معمولی سی ترمیمیں کرلی جائیں، تو یہ بخوبی مشترکہ رسم خط کا کام دے سکتا ہے۔ اس میں مروجہ رومن کی خوبیاں تو ہیں مثلاً حروف کا منقطع لکھا جانا اور چھاپے کی سہولتیں لیکن یہ اس کی خرابیوں سے مبرا ہے۔ دوسری طرف دیوناگری جس بات پر فخر کرتی ہے یعنی املا اور تلفظ کی مطابقت وہ یہاں دیوناگری سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اس خط میں ہندوستانی زبانوں کے تلفظ کو جس صحت کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے وہ خود ان زبانوں کے مخصوص رسم خط میں بھی ممکن نہیں۔ ہم ہندوستان کی تمام زبانوں کو ملاکر ایک مصنوعی مشترکہ زبان تو نہیں بناسکتے لیکن ان کی آوازوں کے لیے ایک مشترکہ رسم خط ضرور ایجاد کرسکتے ہیں۔

رومن خط پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ " چوں کہ اس میں املا تلفظ کے مطابق نہیں اس لیے ہر حرف کے ہجے یاد کرنے پڑتے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کے لیے رومن خط اختیار کرنے سے اسی تکلیف کا یہاں بھی سامنا کرنا پڑے گا مثلاً Dharam کو ڈی، ایچ، اے، آر، اے، ایم، کہنا کتنا مصنوعی لگتا ہے " لیکن یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہم اس رسم خط کے حروف کو محض انکی آواز کے نام سے پکاریں گے، جیسا کہ ناگری خط میں ہوتا ہے۔ D کو "ڈی" نہیں بلکہ ڈے اور R کو "آر" نہیں بلکہ "رے" کہیں گے۔ اسی طرح حروف کی ترتیب بھی صوتیاتی اصولوں کے مطابق ہوگی مثلاً،

P- B- T- D- J- D- C- K- J- G- Q

ہماری زبان میں عام طور سے ۱۲ مصوتے ہیں۔ رومن میں محض پانچ نشانات ہیں۔ لیکن صوتیاتی خط میں ان سب کے لیے نشانات موجود ہیں۔ یہی حال مصمتوں کا ہے۔ اس طرح ترمیم شدہ رومن خط یا ترمیم شدہ صوتیاتی خط مروجہ رومن خط سے کسی قدر مختلف ہوجائے گا۔ لیک اور اعتراض یہ ہے کہ "اس طرح ایک ہی نشان کی آواز صوتیاتی خط میں کچھ اور، انگریزی خط میں کچھ اور ہوگی۔ مثلاً مروجہ انگریزی خط میں c کی آواز 'ک' یا 'س' ہے۔ صوتیاتی خط میں یہ

پیچ' ہوگی۔ یا مثلاً x کو لیجیے۔ مروجہ خط میں یہ 'ک س' کا مجموعہ ہے۔ مجوزہ خط میں یہ خ کی تمام نمائندگی
کرے گا۔ اس کی وجہ سے بچوں کو دونوں خط سیکھنے میں بڑی مشکل ہوگی۔ لیکن رومن استعمال کرنے
والے دوسرے ملکوں کا تجربہ اس کی تائید نہیں کرتا۔ روس۔ ترکی۔ انڈونیشیا میں انگریزی زبان روز بروز
مقبول ہوتی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مروجہ رومن خط ہی میں پڑھائی جاتی ہوگی۔ اس کے باوجود
اس کا ان زبانوں کے اپنے رومن اسلوب سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ روسی حروف تہجی میں سے اکثر
رومن سے مشابہ ہیں، لیکن ان کی آوازمیں فرق ہے۔ مثلاً روسی میں H "ن" کی اور P "ر" کے
قائم مقام ہیں۔ روسی میں نہرو کے ہجے ہیں Hepy جو غالباً 'Neru' کے برابر ہے۔ آج
روس کے اسکولوں میں ایک کروڑ بچے انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ یہی حال کئی دوسرے ملکوں کا ہے
اگر ان سب کا ذہن ایک رسم خط سے دوسرے میں جاتے وقت نشانات کی مختلف آوازوں کو خلط ملط
نہیں کرتا تو آخر ہم کیوں الجھیں گے۔

آج ایک تامل یا اردو بولنے والے کو تین رسم خط سیکھنے پڑتے ہیں۔ اپنی مادری زبان کا
خط، رومن اور دیوناگری۔ اگر اصلاح شدہ رومن کو سب زبانوں کے مشترکہ خط کے طور پر مان لیا
جائے تو محض ایک خط سے کام چل جائے گا کیوں کہ یہ مروجہ رومن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔
ایک مزید یعنی دیوناگری کیوں سیکھی جائے۔ پھر یہ اصلاحی رومن خط صرف ہندستان خط ہی نہیں
ہوگا۔ یہ دنیا بھر کا مشترکہ خط ہے۔ اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کوئی ہندستانی زبان اپنا
موجودہ خط چھوڑ کر دیوناگری خط اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے۔ لیکن ترمیم شدہ صوتیاتی
خط اپنا لینے میں تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔

اصلاح شدہ رومن کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس خط کے ہوتے ہوئے ہمیں
سائنس، ڈاکٹری، انجینئرنگ وغیرہ کی بین الاقوامی اصطلاحوں کا اجنبی ہندی (یا سنسکرت) میں
ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ کہا جاتا ہے تمام تکنیکی علوم میں کوئی بیس لاکھ
اصطلاحیں ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم کہاں تک ان کا ترجمہ کریں گے اور ان چیستانوں کو کون
سمجھے گا۔ ہم سائنس اور دوسرے موضوعات سے متعلق سب کچھ اصلاح شدہ رومن میں لکھ
سکتے ہیں اور اس میں تمام مروجہ بین الاقوامی اصطلاحیں جوں کی توں برقرار رکھی جائیں گی۔
دوسرے لفظوں میں اگر رومن خط اپنا لیا جائے تو تمام علوم و فنون کی تعلیم آج ہی سے ہندی
یا علاقائی زبانوں میں دی جاسکتی ہے۔ وہی اصطلاحیں جو دیوناگری کے ساتھ بے میل ہیں

رومن خط میں آسانی سے گھل مل جائیں گی۔

۱۹۲۷ء میں ترکی میں پڑھے لکھوں کی تعداد صرف ، فی صدی تھی۔ رومن رسم خط اختیار کر لینے کے بعد ۲۰ فی صدی تک پہونچ گئی۔ انڈونیشیا میں آزادی سے پہلے حرف شناس بھی بہت ہی کم تھے۔ رومن رسم خط کا کمال یہ ہے کہ صدر عبدالرحمان سوکارنو کے بیان کے مطابق ۱۹۶۵ء میں خواندگی ۹۰ فی صدی ہوگئی۔ ہمارے ملک میں کشمیر کو چھوڑ کر سب سے زیادہ ناخواندہ لوگ ہندی ریاستوں میں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دیوناگری لپی میں (اور اردو میں بھی) خواندگی کو فروغ دینے کی کوئی خاص صلاحیت نہیں۔ اگر ملک کی سب زبانیں اصلاح شدہ رومن خط میں لکھی جانے لگیں، تو یقین ہے کہ خواندگی کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی۔

جذبات دیوناگری کے حق میں ہوں تو ہوں لیکن عقل کی ہر دلیل اصلاح شدہ رومن کو مشترک رسم خط کے طور پر اپنا لینے کی تائید کرتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ ہم وطن کی حدود میں محصور کر خود کفیل نہیں ہو سکتے، یہ بین الاقوامیت کا زمانہ ہے۔

حواشی

(۱) دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور سمسیائیں (ہندی) ص ۲۰ (ہندی ساہتیہ بھنڈار امین آباد لکھنؤ، ۱۹۶۲ء)۔

(۲) ایضاً ص ۲۴

(۳) ایضاً ص ۱۴۰

(۴) راج بھاشا (۷ فروری ۱۹۵۷ء) ص ۲

(۵) "ہندوستان کی سبھی بھاشاؤں کے لیے ناگری لپی مانیہ ہو" از ونوبا بھاوے بشمول راج بھاشا (۲۴ مئی ۱۹۶۰ء) ص ۷

(۶) Official Language Commission Report ص ۲۲۹

(۷) "راشٹریہ لپی کے روپ میں دیوناگری" مشمولہ دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور

سمسیائیں۔ ص ۲۳۸

(۸) This Hindi and Devnagri 1953. از ملن گوپال ص ۲۸۰۔ ۲۸۱ (۱۹۵۳ء)

(۹) ایضاً ص ۲۹۰

(۱۰) دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور سمسیائیں (ہندی) ص ۱۵۳

(۱۱) Roman or Devnagri از ڈاکٹر ایم اے گھاٹگے۔ مشمولہ دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور سمسیائیں۔ (ہندی) ص ۵۰۴

(۱۲) ایضاً

(۱۳) اردو رسم خط اور طباعت از ہارون خاں شروانی ص ۶۳

اُردو الفاظ کا رومن املا

اس مضمون کے لکھنے کا منشا یہ نہیں کہ راقم السطور کی رائے میں اُردو کو اپنا رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط اختیار کرلینا چاہیے لیکن چوں کہ بعض موقعوں پر اُردو الفاظ کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی ضرورت درپیش آتی ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کے رومن املا کو مستند کرلیا جائے تاکہ لکھنے اور پڑھنے میں غلطی کا احتمال نہ رہے۔

رومن رسم الخط کو انگریزی رسم الخط کے مترادف سمجھ لینا بڑی غلط فہمی ہے۔ رومن خط ایک ایسا لچک دار سانچہ ہے جو تھوڑی سی ترمیم کے بعد ہر زبان کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کا کتابچہ "اُردو رسم خط اور طباعت" نہایت مفید اور بصیرت افروز ہے۔ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط (I.P.A.) رومن رسم الخط ہی پر مبنی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ جس صحت کے ساتھ یہ رسم الخط کسی بھی زبان کی آوازوں کو ادا کرتا ہے، اس صحت سے کے ساتھ خود اس زبان کا رسم الخط بھی ادا نہیں کرسکتا۔ اُردو کو مخصوص موقعوں پر رومن رسم الخط میں لکھنے کے لیے کیوں نئی نئی علامات وضع کی جائیں جب کہ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط کی نعمتِ عظمیٰ موجود ہے۔

رسم الخط کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ اوّلین اصول نہ بھولنا چاہیے کہ زبان کی اصلی اور بنیادی شکل تقریر ہے۔ تحریر تقریر کی پیش خدمت اور طابع ہے۔ رسم الخط کا کام تکلّم کو زیادہ از زیادہ صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ لیکن یہ ترجمانی بیشتر ناقص رہتی ہے۔ جو رسم الخط تقریری تلفظ سے بغاوت کرے غاصب ہے۔ بہترین رسم الخط وہ ہے جو صحیح بھی ہو اور سہل بھی۔

اردو کی مختلف آوازوں کی صراحت پچھلے کئی مضامین میں کی جا چکی ہے۔ انھیں کو پیشِ نظر رکھ کر اُردو کی آوازوں کے لیے رومن علامات تجویز کی جائیں گی۔

۱۔ اردو میں تیرہ مصوتے ایسے ہیں جنھیں لسانیات سے ناواقف شخص بھی بآسانی شناخت

کر سکتا ہے۔ اگر ہم ان کے لیے علامات مقرر کر لیں تو ایک بڑی منزل طے کر لیں گے کیوں کہ انگریزی ہو کہ اُردو دونوں تحریروں میں مصوتے ہی بڑی الجھن ڈالتے ہیں۔

انگریزی خط میں سادہ زبر کے لیے کوئی متعین علامت نہیں جس کی وجہ سے اردو الفاظ کی بڑی مٹی پلید ہوتی ہے مثلاً Chand کو چند پڑھیں کہ چاند۔ بہتر ہے کہ a کو آ کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور فتحہ کے لیے صوتیات کی مشہور علامت ə اپنالی جائے۔ بقیہ خفیف مصوتوں کے لیے بھی بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط کے نشان لے لیے جائیں اور ان طویل مصوتوں کو ان کے آگے کولن کے طور پر دو نقطے بڑھا کر ادا کیا جائے مثلاً Khi : R زبر کو ə سے اور الف ممدودہ کو :a سے اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ ہماری نظریں a کو آ سے تعبیر کرنے کی خوگر ہو گئی ہیں۔

(۲) صوتیاتی تحریر میں غنائی مصمتوں کے اوپر ایک مد کا نشان ~ بنا دیا جاتا ہے اور بس۔ پرتگالی رسم الخط میں بھی یہی علامت اختیار کی گئی ہے۔ اردو کے رومن خط میں بھی نون غنہ کے لیے یہی نشان استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً اونٹ ũ:ṭ

(۳) گذشتہ اصوات میں غنائی اصوات کے تجزیے میں اُردو کے خفیف غنائیوں کا بھی ذکر کیا گیا یہ ب۔ بھ۔ د۔ دھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ گ۔ گھ۔ ج۔ جھ۔ سے پہلے آتے ہیں جب کہ خالص غنائیت بقیہ تمام حروف کے قبل آ سکتی ہے۔ اسی لیے ان دونوں اقسام کے لیے ہم ایک ہی علامت ~ اختیار کر سکتے ہیں کیوں کہ غنائیت کی صورت میں ب۔ د۔ ڈ۔ گ۔ ج وغیرہ کے لیے ہم خود بخود خفیف غنائیہ شامل کر کے بولنے کے عادی ہیں۔ غنائیت کی یہ دونوں قسمیں ایک ہی صوتیے کی ہم صوت ہیں ایک صوتیے کے لیے اب جد کی ایک علامت کوئی برا اصول بھی نہیں۔ مثال طنبورہ tə̃bu:ra

(۴) اُردو کے غنائی مصمتوں میں م۔ ن کے علاوہ ں (ŋ.ʒ Pa) بھی ہے۔ یہ ک۔ گ۔ گھ سے پہلے وصل ہو کر آتا ہے۔ اس کے لیے صوتیاتی نشان ŋ موزوں ترین ہے مثلاً فرق ملاحظہ ہو

mənka منکا   dəŋka ڈنکا

(۵) تین معکوسی مصمتوں ٹ۔ ڈ۔ ڑ کو ٹائپ اور طباعت میں صوتیاتی رسم الخط کی علامات ʈ ɖ ɽ اور دستی تحریر میں نیچے نقطہ لگا کر ṭ ḍ ṛ سے ادا کیا جائے گا۔ ٹائپ میں نیچے نقطہ لگانا بار دہ ہو گا مثال

طباعت: کاٹ	kaʈ	ڈال	ɖal	تاڑ	taɽ
تحریر: کاٹ	kaṭ	ڈال	ḍal	تاڑ	taṛ

(۶) چند اور علامات کی تخصیص یوں ہوگی

چ (c) ج (j) گ (g) خ (x) غ (ɣ) ژ (ʒ) و (v) ش (s)

ز (z).

(۷) منفوس آوازوں اور ہائے مخلوط کو حسبِ دستور h کے شمول سے لکھنے میں کفایت اور دونوں کا حق ادا ہوتا ہے مثلاً کوڑا kora سرہانہ sirhana

(۸) عربی کے مخصوص حروف میں متحد الصوت حروف کو محض ایک علامت سے ادا کیا جائے مثلاً ز۔ ذ۔ ض۔ ظ سب کو z سے لکھا جائے۔

(۹) جس طرح بعض مصوتوں کا طول ظاہر کرنے کے لیے ان کے آگے دو نقطے لگائے جائیں گے اسی طرح تشدید ظاہر کرنے کے لیے مصمتے کے آگے دو نقطے لگانا ضروری ہے کیوں کہ تشدید دوہرا مصمتہ نہیں بلکہ ایک طویل مصمتہ ہے۔ دستی تحریر میں اگر حروف کے آگے نقطے لگانے میں وقت محسوس ہو تو حسبِ رواج تشدید کے لیے دو حروف ہی لکھے جا سکتے ہیں۔

(۱۰) ایک لفظ کے منفصل اجزا کا جوڑ دکھانے کے لیے hyphen, (—) کا استعمال کیا جائے گا مثلاً قرآن Qur-an

(۱۱) اردو کو رومن میں لکھتے وقت کسی بھی موقع پر بڑے (Capital') حروف کا استعمال نہ کیا جائے گا۔ سب حروف برابر ہوں گے۔

اب ہم صوتیاتی تحریر کے ساتھ اردو کی مختلف آوازوں کی فہرست اور ان کا رومن یا بین الاقوامی صوتیاتی املا تحریر کرتے ہیں۔

مصمتے (حروفِ صحیح)

۱۔	پ	p	۸۔	دھ	dh
۲۔	پھ	ph	۹۔	ٹ	ṭ
۳۔	ب	b	۱۰۔	ٹھ	ṭh
۴۔	بھ	bh	۱۱۔	ڈ	ḍ
۵۔	ت	t	۱۲۔	ڈھ	ḍh
۶۔	تھ	th	۱۳۔	ک	k
۷۔	د	d	۱۴۔	کھ	kh

نمبر	حرف	علامت	نمبر	حرف	علامت
۱۵۔	گ	g	۲۷۔	ڑ	ɽ
۱۶۔	گھ	gʰ	۲۸۔	ف	f
۱۷۔	ق	q	۲۹۔	س	s
۱۸۔	چ	c	۳۰۔	ز	z
۱۹۔	چھ	ch	۳۱۔	ش	ʃ
۲۰۔	ج	J	۳۲۔	ژ	ʒ
۲۱۔	جھ	Jh	۳۳۔	خ	x
۲۲۔	م	m	۳۴۔	غ	ɣ
۲۳۔	ن	n	۳۵۔	ہ	h
۲۴۔	ں	ŋ	۳۶۔	و	v
۲۵۔	ل	l	۳۷۔	ی	y
۲۶۔	ر	r			

۲۷۔ تشدید۔ حروف کے آگے (:) یا حرف کو دوبار لکھنا۔

مصوتے

نمبر	مصوتہ	علامت	نمبر	مصوتہ	علامت
۳۸۔	واوِ معروف	u:	۴۵۔	یائے معروف	i:
۳۹۔	پیش معروف	u	۴۶۔	زیر معروف	i
۴۰۔	واوِ مجہول	o:	۴۷۔	یائے مجہول	e:
۴۱۔	پیش مجہول	o	۴۸۔	زیر مجہول	e
۴۲۔	واوِ لین	ɔ	۴۹۔	یائے لین	ɛ:
۴۳۔	الف ممدودہ	a	۵۰۔	زبرِ مجہول	ɛ
۴۴۔	زبر معروف	ə			

اتصال ، Juncture کی علامت (—)

مندرجہ بالا رسم الخط میں ایک علامت بھی ایجادِ بندہ نہیں تمام علامتیں بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط سے مستعار ہیں۔ جو بولا جائے گا وہی لکھا جائے گا اور جیسا لکھا جائے گا ویسا ہی پڑھا جائے گا۔ اردو کے کسی بھی لفظ کا تلفظ، عربی تلفظ نہیں فصیح اردو تلفظ، جس صحت کے ساتھ اس

رسم الخط میں قلم بند کیا جا سکتا ہے اتنی صحت کے ساتھ ادا کرنا نہ اُردو رسم الخط کے بس کا ہے نہ دیوناگری کا۔ ایسے عالم گیر و سہل، مانے ہوئے رسم الخط کے ہوتے ہوئے رومن حروف میں ہمیں کوئی اختراع کرنے کی ضرورت نہیں۔

آخر میں اس رسم الخط میں چند الفاظ کا املا ملاحظہ ہو۔

kiya	کیا (فعل ماضی)	kya	کیا (استفہام)
vaojea	واقعہ	nɛhr	نہر
m-ən	معاً	mool:a	معلّی
fa-il	فاعل	fail	فائل
rəb:ul-alimi:n	رب العالمین	mɛhdi:	مہندی
svrajya	سوراجیہ	svətəntr	سوتنتر
		Səuval	شوال

sən-əte bəra-ətul-istehlal	صنعت براعت الاستہلال
Jəm-i:yətul-ulama	جمعیت العلماء

sku:l	سکول	fəiyaz	فیاض
thənka	ٹھنکا	nəŋga	ننگا

اردو ہندی یا ہندوستانی

کچھ ایسے مسائل ہیں جن پر دوسروں کے خیالات سُننے اور کچھ سوچنے کے باوجود ان کا حل میری سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسے کچھ مسائل یہ ہیں۔

ا۔ ہندوستان کی تہذیبی جہت کیا ہو۔ ایک راستہ صنعتی تکنیکی تہذیب کا ہے جس کا منتہا امریکی زندگی ہے۔ دوسرا راستہ مہاتما گاندھی کا گاؤں کی خود کفالت اور چھوٹی صنعتوں کا تھا۔ دونوں میں قباحتیں ہیں۔ ملک نے فی الحال تکنیکی صنعتی تہذیب کو پسند کیا ہے، لیکن معاشرے میں تکنیکی وصنعتی ترقی کے مہلک اثرات کا کس طرح ازالہ کیا جاتے؟

۲۔ ہندوستان میں اعلا تعلیم کی کیا شکل ہو، جو ملک کے لیے بھی مفید ہو، اور طلبہ کو مطمئن کر سکے؟

۳۔ ہندوستان میں اُردو کا مسئلہ؟

سب سے آخری مسئلے کو لیجیے۔ اُردو کون سی اور کس کی زبان ہے؟ یہ کیونکر وجود میں آئی؟ کیا اُردو، ہندی، ہندوستانی اور کھڑی بولی الگ الگ زبانوں کے نام ہیں یا ان میں سے کچھ یا سب ایک ہی زبان پر دلالت کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ زبانوں کی تاریخ میں ان کے نام کی غیر معمولی اہمیت نہیں۔ زبان پہلے وجود میں آتی ہے، اس کا نام بعد میں رکھا جاتا ہے۔ پالی زبان ۵۰۰ ق م سے مولودِ مسیح تک پھل پھول رہی تھی، لیکن اس کا نام پالی انیسویں صدی میں رکھا گیا۔ برج بھاشا کا نام اس کے وجود کے کئی صدی بعد رکھا گیا۔ بے پڑھے لکھے عوام کو زبان کے نام اور اس کی انفرادیت کا شعور نہیں ہوتا۔ کسی لٹھ گنوار سے اس کی زبان کا نام پوچھیے تو وہ آپ کا منہ دیکھے گا۔ زبان کا نام اہلِ علم متعین کرتے ہیں۔ اُردو کا نام انیسویں صدی کے اوائل میں رکھا گیا۔ اس سے پہلے

اسے من جملہ دوسرے ناموں کے ہندی بھی کہا جاتا تھا۔ فضلی نے کربل کتھا میں لکھا ہے:

"اب تک ترجمۂ فارسی بہ عبارتِ ہندی نثر نہیں ہوا مستمع،"

محمد حسین عطا خاں تحسین نے "نوطرزِ مرصع" کے سبب تالیف میں لکھا ہے:

"لیکن مضمون اس داستان بہارستان کے تئیں بیچ عبارتِ رنگین زبانِ ہندی کے لکھا جاتے۔"

مولوی خرم علی ۱۲۴۳ھ "نصیحت المسلین" میں لکھتے ہیں:

"ہر آیت کا ترجمہ ہندی زبان میں صاف بیان کرے تاکہ ہر ایک کو فائدہ عام ہو"

اور آتش سے یہ شعر منسوب ہے۔

مطلب کو میرے یار نہ سمجھے تو کیا عجب سب جانتے ہیں کہ ترک کی ہندی زبان نہیں

ہندی کا نام "ہندی" انیسویں صدی کے آخر کا ہونا چاہیئے۔ پہلے پوربی، برج بھاشا وغیرہ مستعمل تھے۔ اس لیے اُردو ہندی کے ناموں کو نظر انداز کر کے ہم ان کی ماہیت پر غور کریں۔

اہلِ ہندی کا دعوا رہا ہے کہ اُردو کوئی علاحدہ زبان نہیں، یہ ہندی کا ایک اسلوب ہے۔ لسانیات کا قاعدہ ہے کہ زبانوں کے تعین میں صرف تقریری روپ معتبر ہے۔ تحریری روپ معتبر نہیں ہے۔ اس لیے اہلِ لسانیات اُردو اور ہندی کو کھڑی بولی کے رُوپ قرار دیتے ہیں۔ کھڑی بولی کی حیثیت زبان کی نہیں، بولی کی ہے جو مغربی ہندی کی معیاری بولی ہے۔ دراصل گریرسن اور دوسرے مستشرقین نے مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کی اصطلاحیں استعمال کر کے ستم کیا۔ مغربی ہندی کو ہندوستانی اور مشرقی ہندی کو پوربی کہا ہوتا تو خوامخواہ انھیں ایک ہی زبان کی بولیاں نہ سمجھ لیا جاتا۔

جہاں تک بول چال کا تعلق ہے، ابتدا سے آج تک اُردو اور ہندی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یہ ایک ہی زبان کے دو رُخ ہیں، بلکہ ایک ہی زبان ہیں۔ ذیل کی حکایت ملاحظہ ہو:

ایک کوّا ایک پیڑ کی ٹہنی پر پنیر کا ٹکڑا لیے بیٹھا تھا۔ ایک لومڑی نیچے آکر

بیٹھ گئی ۔ پنیر دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ اس نے سوچا کسی ڈھب سے یہ ٹکڑا اڑانا چاہیئے ۔ اس نے کہا " میاں کوتے ! تم بہت اچھا گاتے ہو ۔ ذرا ایک بول تو سناؤ ۔" کوا اپنی تعریف سن کر پھول گیا اور گانے کے لیے منہ کھولا ۔ منہ کھولتے ہی پنیر کا ٹکڑا نیچے گر پڑا ۔ لومڑی اسے اٹھا کر چلتی بنی ۔ سچ ہے خوشامدیوں کی بات پر دھیان نہیں دینا چاہیئے ۔

یہ حکایت اُردو زبان کی ہے ' اس سے کسی اُردو والے کو انکار نہیں ہو سکتا ۔ ہر ہندی والا اسے ہندی کی تسلیم کرے گا ۔ پھر فرق کا ہے کا ہے ؟ انشا کی " رانی کیتکی کی کہانی " فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ شدہ " سنگھاسن بتیسی " اور " بیتال پچیسی " یہ تینوں کتابیں اُردو ادب کا بھی سرمایہ ہیں ' ہندی ادب کا بھی ۔ یہ کیسی دو زبانیں ہیں جن میں ایک دو جملے نہیں ' پوری پوری کتابیں تک مشترک ہیں ۔ دو مختلف زبانوں میں تو اتنا فرق ہوتا ہے کہ ایک زبان کے بے پڑھے کو دوسری زبان بیشتر سمجھ میں نہیں آتی ۔ صاف ظاہر ہے کہ اُردو ہندی دو الگ زبانیں نہیں ۔ انھیں دو زبانیں کہنا لسانیات کے تمام اصولوں کو جھٹلانا ' خود کو اور دوسروں کو فریب دینا ہے ۔ انجمن ترقی اُردو کے جنرل سکریٹری پروفیسر آل احمد سرور کا بیان ہے :

> " اُردو زبان ایک آریائی اور ہندوستانی زبان ہے ۔ اس کی بنیاد کھڑی بولی پر رکھی گئی ہے ۔ اس اعتبار سے اس میں اور ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ ہندی اور اُردو دو مستقل جداگانہ زبانیں نہیں ہیں ۔"[1]

اگر اُردو ہندی سے جداگانہ زبان نہیں تو اُردو کے آغاز کے یہ تمام نظریے کیا ہیں ؟ اصل یہ ہے کہ اُردو کے آغاز کی دو منزلیں ہیں ۔ اول جدید ہند آریائی زبانوں میں کھڑی بولی ' جو گیارہویں بارہویں صدی میں نمودار ہوئی ہوگی ۔ دوسرے کھڑی بولی کے اُردو روپ کی نشو و نما جو بعد کا کارنامہ ہے ۔ میر امن ' سید سلیمان ندوی ' نصیر الدین ہاشمی ' مسعود حسین خاں ' سب نے اُردو روپ کے ابھرنے کے نظریے پیش کیے ہیں ۔ محمود شیرانی اور ڈاکٹر زور نے کھڑی بولی کو اُردو تک محدود جان کر

---

[1] نئے ہندوستان کی تعمیر میں اردو کا حصہ ' مشمولہ " ادب اور نظریہ " ص ۲۶۳ ۔

دونوں کے ایک ساتھ آغاز کی تلاش کی ہے۔ جب کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے کھڑی بولی کی ابتدا کا نظریہ پیش کیا ہے۔ پاکستان کے ماہر لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری عجیب نظریے پیش کیا کرتے ہیں، لیکن اُردو کے آغاز کے بارے میں ان کا جو نقطۂ نظر ہے اس کے مرکزی جزو سے مجھے اتفاق ہے۔ لکھتے ہیں:

" دراصل اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرینِ علم زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔ ان کی موجودہ روپوں میں دو فرق واضح ہیں۔ ایک لپی اور دوسرا دخیل الفاظ۔ ہندی دیوناگری لپی میں لکھی جاتی ہے اس لیے اس میں سنسکرت الفاظ کی بھرمار ہوگئی ہے اور اُردو نے ایرانی لپی میں تحریر ہونے کی باعث بے شمار عربی فارسی الفاظ مستعار لے لیے ہیں لیکن علم زبان کے لحاظ سے دونوں کے یہ اختلافات قابل التفات نہیں کیونکہ ان سے زبان کی بنیادی خصوصیات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس نقطۂ نظر سے ہندی اور اُردو کی تاریخ ایک ہی ہے۔ خاص کر کھڑی بولی کی قدیم تاریخ اُردو زبان کا بھی ایسا ہی اہم حصہ ہے' جیسا ہندی زبان کا۔[1]

اُردو زبان امیر خسرو سے شروع کی جاتی ہے اور اس کے بعد شمالی ہند میں تقریباً تین سو سال کا وقفہ ہے جسے ہم دکن سے پُر کرتے ہیں اس کے بعد افضل اور فائز کے وقت سے پھر اُردو کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایک زبان کی تاریخ میں اتنا بڑا فصل کیوں کر ممکن ہے؟ سہیل بخاری نے اُردو اور ہندی ادب (اُردو اور دیوناگری لپی میں)، کو یک جا کے کر ان سے عہد بہ عہد ایسے نمونے پیش کیے ہیں جن سے شمالی ہند میں کھڑی بولی کی ایک مسلسل روایت سامنے آتی ہے، حقیقت صرف یہی ہے۔

اٹھارھویں صدی کے ربع اوّل تک شمالی ہند میں کھڑی بولی کے جستہ جستہ نمونے بیشتر ہندی ادب اور دیوناگری لپی میں ملتے ہیں' اُردو میں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کے بعد اُردو نے بھرپور طریقے پر کھڑی بولی کی سرپرستی کی۔

---

[1] اُردو کا قدیم ترین ادب' مشمولہ نقوش' شمارہ ۱۰۲ بابت مئی ۱۹۶۵ء، ص ۸۴

انیسویں صدی کے اوائل میں یعنی فورٹ ولیم کالج میں کھڑی بولی ہندی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف دوم میں ہندی رسالوں میں یہ بحث بڑے زوروں سے چھڑی کہ ہندی ادب کے اظہار کے لیے برج بھاشا کو برقرار رکھا جائے کہ کھڑی بولی کو۔ اس وقت تک اہل ہندی میں یہ خیال عام تھا کہ کھڑی بولی میں مسلمان لکھتے ہیں، ہندو مقامی بولیوں کو ذریعہ اظہار بناتے ہیں۔ اب بھی ہندی کے کئی ماہر لسانیات صریحاً تسلیم کرتے ہیں کہ کھڑی بولی کا ارتقا ہندی ادب سے پہلے اُردو ادب میں ہوا۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا تک کھڑی بولی میں اُردو یا ہندی ادب کا کسی کو شعور نہ تھا۔ اٹھارہویں صدی میں کھڑی بولی پر اُردو ادب کا اجارہ ہوگیا۔ انیسویں صدی میں ہندی ادب بھی کھڑی بولی کے لباس میں ظاہر ہونے لگا۔ میں اسباب کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ ایک زبان کھڑی بولی (جو مغربی ہندی کی معیاری شکل ہے) دو زبانوں میں کیسے تقسیم ہوگئی۔ اس کے سیاسی، مذہبی اور تہذیبی اسباب تھے۔ بہرحال میرا ادعا یہ ہے کہ اگرچہ اُردو ادب اور ہندی ادب دو مختلف اور آزاد ادب ہیں لیکن اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں۔

ادب اور روزانہ زندگی میں اردو اور ہندی کی تقسیم کا ہمارا معیار کیا ہے؟ ذیل کے ٹکڑوں کو ہم سب اُردو تسلیم کرتے ہیں۔

الف :" بادشاہ زادے کا دل تو ہے کسان اور تن اس کا ہوا کھیت۔ تس کا ر حسن آباد کے جو سگھن سگھن درخت ہیں۔ سو تی ہوتے سیام گھٹا، اور پھول جو جھڑیں ہیں درختوں کے سو تی ہو تی بوندیں، سو یہ مانو اس کا تن روپی ہے جو کھیت، تس پر برسے ہے۔"

(قصہ مہر افروز و دلبر صفحہ ۱۱۲)

ب : جو ہوتے تیرا کرم   تو لوٹے سبھی بھرم
اس کارن تجھ کو دھاؤں   اور تیرا نام لیتوں
ہے تیرا انت نہ پار   کس مکھوں کرا چار

(شہادت الحقیقت از میراں جی شمس العشاق)

ج: کیسی بسنت سہاتے رے سکھی کیسی بسنت سہاتے

پھولوں کی نرمل چھیّا میں مند پون اٹھلاتے — کیسی بسنت سہاتے
پریتم کے سنگ ہولی کھیلیں گاؤں کی رتنا ریں — امرت رس کی پھواریں
من آنگن میں پھول کھلائیں، نیور کی جھنکاریں — بان لگن کے ماریں
باغ میں کھلتی مادھوریں کی ڈار ڈار لہراتے — مست سگندھ برساتے
کیسی بسنت سہاتے

(چاندنی کی پتیاں از نامر شہزادہ ص ۴۴)

مندرجہ بالا سطور اُردو ادب سے لی گئی ہیں۔ انھیں ہر اُردو والا اُردو کی مانتا ہے، یلیں ذیل کی ہندی سطور پر کسی حامی اُردو نے دعوا نہیں کیا۔

الف: "ہم لوگوں کو جہاں تک بن پڑے چننے میں ان شبدوں کو لینا چاہیئے کہ جو عام فہم اور خاص پسند ہوں۔ ارتھات جن کو زیادہ آدمی سمجھ سکتے ہیں اور جو یہاں کے پڑھے لکھے، عالم فاضل، پنڈت ودان کی بول چال میں چھوڑے نہیں گئے ہیں اور جہاں تک بن پڑے ہم لوگوں کو ہرگز غیر ملک کے شبد کام میں نہ لانا چاہئیں اور نہ سنسکرت کی ٹکسال قائم کر کے نئے نئے اوپری شبدوں کے سکے جاری کرنے چاہئیں۔"

(راجا شوپرشاد ستارہ ہند بنارس اخبار)

ب: بوند گرتے دیکھ کر یوں مت کہو
جو سمجھتے ہو نہیں تو چُپ رہو
آنکھ تیری گڑ گئی یا سڑ گئی
کرکری اس آنکھ میں ہے پڑ گئی

(ہری اودھ: ٹھیٹھ ہندی کا ٹھاٹھ)

ج: "بیلن پور قصبے میں تحصیل عدالت ہے، تھانہ ہے، خزانہ ہے۔ ان کی عمارتیں سنگین، اور پختہ ہیں۔ ان سرکاری عمارتوں کے علاوہ کیول ایک اور مکان قصبے میں بمنزلہ اور پکا ہے بنیا کروڑی مل کا۔ باقی سبھی برہمن اور چھتری، شیخ اور سید کچے گھروں میں، جھونپڑیوں میں بسے ہیں۔ تنگ دست، خستہ حال، لوگوں

کی تنگ دستی کا سبب کچھ لوگ نوکر شاہی سرکار کو کہتے ہیں اور بہت لوگ بنیا کروڑی مل کو۔"

(پانڈے بے چن شرما اگر: "پولی عمارت")

د: اسی لیے کھڑا رہا کہ تم پکار لو
زمین ہے نہ بولتی نہ آسمان بولتا
جہان دیکھ کر مجھے نہیں زبان کھولتا
نہیں جگہ کہیں جہاں نہ اجنبی گنا گیا
کہاں کہاں نہ پھر چکا دماغ دل ٹٹولتا
اسی لیے کھڑا رہا کہ تم مجھے پکار لو

(ہری ونش رائے بچن)

ہ: آج ساقی کو پلا دی جائے گی
بس یہی اس کو سزا دی جائے گی
کیا کہا ساقی کہ میں بے ہوش ہوں
ہوش کی تجھ کو دوا دی جائے گی

(دیو راج دینیش)

مجھے تسلیم ہے کہ اُردو تحریروں میں عربی فارسی کے الفاظ زیادہ ہوتے ہیں اور ہندی تحریروں میں سنسکرت الاصل الفاظ زیادہ۔ لیکن کیا مجرد لفظوں کی اس نوعیت سے زبانیں بدل جاتی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو جسے ہم اُردو ادب کہتے ہیں وہ بھی ایک سے زیادہ زبانوں کا ادب ہے۔ "قصۂ مہر افروز دلبر" اور "رانی کیتکی کی کہانی" ایک زبان کی کتابیں ہیں اور "فسانۂ عجائب" دوسری زبان کی۔ بلکہ یہی کیوں "باغ و بہار" اور "فسانۂ عجائب" کے ذیل کے اقتباسات کے جوڑے ملاحظہ ہوں:

باغ و بہار

الف: "یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا، جا بجا قمقمے، سرو چراغاں، کنول اور فانوس خیال، شمع مجلس حیراں اور فانوسیں روشن تھیں کہ شب برات باوجود چاندنی اور چراغاں کے اس کے آگے اندھیری لگتی تھی۔"

ب: "میں رانی کے نیڑے جو میری ماتا تھیں، اٹاری پر اوجھل میں بیٹھی تھیں اور داتیاں، سہیلیاں حاضر تھیں، تماشا دیکھتی تھیں۔ یہ دیوان کا پوت ۔۔

اور گھوڑے کو کاوے دے کر کسب کر رہا تھا۔ مجھ کو بھایا اور دل سے اس پر رجھی۔ مدت تلک یہ بات گپت رہی۔ آخر جب بہت بیاکل ہوئی تب دائی سے کہا۔"

فسانۂ عجائب

الف :"گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن یعنی محررانِ رنگین تحریر و مورخانِ جادو تقریر نے اشہب جہندۂ قلم کو میدانِ وسیع بیان میں باکرشمہ سحرسازو لطیفہ ہائے حیرت پرداز گرم عناں و جولاں یوں کیا ہے۔"

ب : ایک پنکھیرو سُوے کے برن میں ہاتھ آئے گا۔ تریا کے کھٹ پٹ سے وہ بچن سناتے گا۔ کہ راج پاٹ چھڑا دیس بدیس لے جاتے گا۔ ڈگر میں شہزادہ بھٹکے۔ کوئی پاس نہ پھٹکے۔ ساتھی چھٹیں۔ اپنے ڈیل سے ڈانوڈول رہے۔ پھر ایک منکھ ٹھاکر کا سیوک کرپا کرے راہ لگاتے۔ کوئی کلنکن لوبھی ہو کشٹ دکھاتے وہاں سے جب چھٹے رانی ملے۔ بہا سندر۔ وہ چرن پر پران وارے۔"

جس منطق سے اُردو اور کھڑی بولی ہندی الگ الگ زبانیں ہیں، اسی منطق سے باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کے مندرجہ بالا 'الف' اور 'ب' اقتباسات دو الگ الگ قرار پائیں گے۔ یعنی یہ کتابیں دو لسانی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اوسط اُردو تحریر اور اوسط ہندی تحریر میں اتنا فرق نہیں ہوتا جتنا اوسط اُردو اور دقیق اُردو میں یا اوسط ہندی اور مشکل ہندی میں۔ اُردو ہو کہ ہندی کہ انگریزی، ہر زبان کے ادب میں ذخیرۃ الفاظ کے اعتبار سے زبان کے مختلف پرت ملیں گے۔ ایک سرے پر بالکل سہل بول چال کی عوامی زبان تو دوسرے سرے پر کلاسیکی یا غیر زبان الفاظ سے بوجھل معلق زبان۔ انگریزی میں دیہاتی روزمرہ والے مکالموں اور لاطینی و فرانسیسی سے زیر بار جملوں کو دو مختلف زبانوں کا نہیں قرار دیا جاتا۔ کیونکہ اہمیت بنیادی الفاظ اور صرف و نحو کے بنیادی قواعد کی ہے۔

اُردو کے بنیادی الفاظ کچھ اس طرح ہیں۔

۱۔ خاص اعضا کے نام : آنکھ، ناک، کان، منھ، ہاتھ، پاؤں، پیٹ۔

۲۔ خاص عزیزوں کے نام : ماں، باپ، بھائی، بہن، بیٹا، بیٹی، نانا، نانی، دادا دادی، چچا، تاؤ۔

۳۔ اعداد : ایک، دو، تین، چار، پانچ، چھے وغیرہ۔
پہلا، دوسرا، تیسرا، چوتھا، پانچواں، چھٹا وغیرہ۔

۴۔ فعل کے بنیادی مادّے : آ۔ جا، کھا۔ پی۔ کر۔ مر وغیرہ۔

۵۔ حروف جار کے۔ سے۔ ہیں۔ تو۔ تک۔ نے وغیرہ

۶۔ بنیادی ضمائر : میں۔ تو۔ ہم۔ تم۔ وہ۔ آپ۔

زبانوں اور بولیوں کا تعین اس قسم کے بنیادی الفاظ سے ہوتا ہے۔ دخیل مجرّد الفاظ سے نہیں۔ اگر ملیالم میں اسّی فی صدی کے قریب سنسکرت الفاظ ہیں تو بھی وہ دراوڑی زبان ہے اور البانوی میں چند سو کے علاوہ بقیہ تمام الفاظ دوسری زبانوں (بالخصوص) لیٹن کے ہیں۔ تو بھی وہ سلاف زبان ہے۔ کیا ہندی کے بھی بنیادی الفاظ وہی نہیں جو اُردو کے ہیں؟ کیا ہندی اور اُردو میں فعل کی گردان اسم وصفت، وغیرہ کی جمع اور تانیث کے بنیادی قاعدے مشترک نہیں؟ یہی وجہ تو ہے کہ پوری عبارتیں بلکہ پوری کتابیں دونوں زبانوں میں مشترک ہو جاتی ہیں۔

اب لیجئے بول چال کی سطح پر دونوں زبانوں کو ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں اُردو بولنے والوں کی تعداد تقریباً پونے تین کروڑ تھی۔ ان کی مذہبی تقسیم معلوم نہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں دہلی، یوپی اور بہار کی اُردو آبادی اور مسلم آبادی کا موازنہ حسب ذیل ہے :

ریاست	اہل اردو	مسلمان
دہلی	۱۱۵۵۱۴۳	۱،۵۳،۲۴۷
یوپی	۷۸،۹۱،۷۱۰	۱،۰۰،۷،۸۸،۸۹
بہار	۴۱،۴۹،۲۴۵	۵۷،۸۵،۶۳۱
	۱،۲۱،۹۶،۴۰۸	۱،۶۷،۲۶،۹۶۷

میرا خیال ہے کہ ان میں معدودے چند ہی ہندو ہوں گے کیونکہ موجودہ حالات

میں اُردو کا بہت شعور رکھنے والے ہندو بھی اپنی زبان اُردو لکھاتے۔ ان کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ ہم نظرانداز کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد سے اُردو والوں کی تعداد کا کم ہونا مردم شماری کے عملے کی ہیرا پھیری کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ زبانوں کا تعلق اکثر اوقات علاقے سے ہوتا ہے، مذہب سے نہیں۔ میں قارئین کرام سے معذرت کے ساتھ اپنی ذات کم صفات کے تعلق سے کچھ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

میں مردم شماری میں اپنی مادری زبان اُردو لکھواتا ہوں حالاں کہ میرے ماں باپ، دادا دادی اُردو سے نابلد تھے۔ والدین تھوڑی سی ہندی پڑھے ہوتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ میری زبان وہی ہے جو میرے نزدیک کے ضلع مرادآباد کے ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی ہے۔ کوئی یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ میری زبان میرے والدین یا میری اہلیہ کی زبان سے مختلف ہے۔ لیکن مردم شماری بری زبان اُردو اور میری اہلیہ کی زبان ہندی لکھی جاتی ہے۔ میں قصبہ سیوہارہ ضلع بجنور، یو۔ پی کا رہنے والا ہوں۔ یہ قصبہ آزادی سے پہلے بھی مسلم اکثریت کا تھا اور آج بھی مسلم اکثریت کا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں کی تمام قدیمی آبادی ایک ہی زبان بولتی ہے اور سب ایک دوسرے کی آواز کو سو فیصدی سمجھتے ہیں۔ لیکن میرا قیاس ہے کہ مردم شماری میں تمام مسلمانوں کی زبان اُردو اور ہندوؤں کی زبان ہندی لکھی جاتی ہوگی۔ کم و بیش یہی کیفیت تمام ہندی (یا ہندوستانی) ریاستوں کی ہونی چاہیے۔

مذہب کی بنا پر زبان کی یہ مصنوعی تقسیم بد دیانتی نہیں ہے؟ پنجاب اور چند دیگر علاقوں کے ہندو پنجابی بولتے ہیں لیکن سیاسی وجوہ سے اپنی زبان کو ہندی کہتے ہیں۔ اسے سراہا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مذاہب کی بنیاد پر ایک زبان بولنے والوں کی زبان کو بانٹ دینا سیاست اور فرقہ واریت کا کرشمہ ہوتا ہے، قرار واقعی صورت حال نہیں۔ ہندوستان کے آئین میں اُردو ہندی کو دو زبانوں کی حیثیت سے درج کرنا سیاسی مصلحت ہے، لسانی حقیقت نہیں۔ مردم شماری میں اُردو اور ہندی بولنے والوں کی تعداد کی تقسیم محض فرضی اور خیالی ہے۔ یہ سب اُردو بولنے والے بھی کہلا سکتے ہیں، ہندی بولنے والے بھی

مجھے تسلیم ہے کہ اُردو اور ہندی دو مختلف ادب ہیں لیکن زبانیں نہیں۔ جیسا کہ پیچھے لکھا گیا ہے۔ دخیل الفاظ سے زبان کا تعین نہیں ہوتا۔ رسم الخط کا فرق بھی اسی طرح ایک زبان کے دو حصے نہیں کر سکتا۔ جس طرح رسم الخط کی مطابقت دو زبانوں کو ایک نہیں کر سکتی۔ ملیشیا اور انڈونیشیا کی زبان ایک ہے جسے ملائے کہتے ہیں۔ ملیشیا میں یہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور انڈونیشیا میں رومن میں۔ اس کے باوجود یہ دو زبانیں نہیں ہیں۔ اگر تقسیم سے قبل پنجاب کے مسلمان پنجابی کو اُردو خط میں سکھ گرمکھی میں اور کچھ ہندو دیوناگری خط میں لکھتے تھے تو یہ تین زبانیں نہیں ہو جاتی تھیں۔ کلچرل پس منظر بھی زبان کی نوعیت طے نہیں کر سکتا اُردو خط میں جماعت اسلامی کی کتابیں بھی ہیں اور آریہ سنگیت راماین اور آریہ سنگیت مہابھارت بھی۔ تہذیبی پس منظر کے اختلاف سے ان کی زبان مختلف نہیں ہو گی۔

اٹھارہویں صدی کی ابتدا تک اُردو اور ہندی کی تفریق نہیں تھی۔ مہاتما گاندھی نے ملک کی زبان ہندوستانی تجویز کی تھی جو اُردو اور دیوناگری دونوں خطوں میں لکھی جانی چاہیئے۔ مجھے ڈاکٹر محمد حسن کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ ہمارے ملک کی عام زبان نہ ہندی ہے نہ اُردو، بلکہ ہندوستانی ہے۔ اُردو ہندی کی تفریق جرمنی، کوریا اور ویت نام کی مصنوعی تقسیم کی طرح ہے۔ کیا اِن دونوں زبانوں اور ادبوں کو ملایا نہیں جا سکتا۔ شروعات کے طور پر انھیں قریب لایا جاتے پھر جن الفاظ اور ادبی روایات میں زیادہ جان ہو گی، وہ غالب ہو گی۔ جو تصنع آمیز ہیں وہ دب کر ختم ہو جائیں گے۔ اس سے اُردو اور ہندی کی علاحدہ حیثیتوں کو مزور مزر پہنچے گا، لیکن دونوں کا مجموعہ ہو گا، وہ ملک کے لیے زیادہ مفید ہو گا۔

ناخواندہ لوگوں کے لیے یہ زبانیں ایک ہی ہیں۔ پڑھے لکھوں میں اس کی تفریق ہے۔ اسے دور کرنے کی یہی صورت ہے کہ اسکول کی تعلیم کی کسی منزل میں اُردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط سکھاتے جائیں اور بی۔ اے اور ایم۔ اے میں علاحدہ اُردو ادب اور علاحدہ ہندی ادب کے علاوہ ایک ایسا مضمون یا نصاب تیار کیا جاتے جسے ہندوستانی ادب کہا جاتے۔ اس کے

طلبہ دونوں رسوم الخط سے کما حقہ، واقف ہوں ۔ اور انھیں نصاب میں دونوں رسوم الخط کے ادبوں (یعنی اُردو ادب اور ہندی ادب) کے شاہکاروں سے واقف کرایا جائے ۔ ظاہر ہے کہ ان گریجویٹوں کو دونوں ادبوں میں سے کسی پردہ عبور نہ ہوگا جو ان میں سے ایک پر مرکوز ہونے والے طلبہ کو ہوتا ہے ۔ لیکن ان دونوں پر جس قدر بھی قدرت ہوگی، وہی ایک ملے جلے ادب کی تخلیق کے لیے کافی ہوگی ۔

اہل اُردو اور اہل ہندی دونوں میں کچھ ایسے صلح کل مل جائیں گے جو اس تجویز کو مان لیں ۔ بہرحال اس مسئلے پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ اُردو اور ہندی زبان و ادب کو اگر ایک بھی نہ کر دیا تو بھی انھیں ایک دوسرے کے قریب قریب تر لایا جائے کہ نہیں ؟ میں فصل پر وصل کو ترجیح دیتا ہوں ۔

بھوپالی اُردو

زبان اور بولی کی تعین میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ بالخصوص اُردو جیسی زبان کے معاملے میں جسے اہلِ لسانیات کھڑی بولی کا ایک روپ اور ہندی کو دوسرا روپ مانتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو ہی نے کھڑی بولی کو سنوارا اور نکھارا۔ اس نے استواری کے ساتھ اپنا دامن کھڑی بولی سے وابستہ رکھا لیکن ہندی نے ہرجائی پن کے ساتھ ہر طرف دام ڈالا۔ چنانچہ آج وہ بہاری سے لے کر راجستھانی تک کو اپنے کنبے میں شمول کی داعی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُردو میں بولیاں ہیں کہ نہیں۔ بولیاں نہ بھی ہوں تو ذیلی بولیاں ضرور ہیں اور یہ ذیلی بولیاں مختلف مقامات کی اُردو کے علاقائی روپ ہیں۔

معیاری زبان کسی زبان کی بولیوں میں سب سے اہم بولی ہوتی ہے۔ اس کا نام معیاری زبان کی بجائے معیاری بولی ہوتا تو صحت کا حق زیادہ ادا ہوتا۔ معیاری زبان کی ایک شرارت یہ ہے کہ یہ بولیوں کے علاقے میں بھی شہروں یا کم از کم پڑھے لکھوں کی مجلس سے بولی کو باہر دھکیل کر خود اس کی جگہ لے لیتی ہے لیکن اُسے اس قبضۂ مخالفانہ کی کچھ قیمت دینی ہوتی ہے جو یہ ہے کہ اسے متعلقہ بولی سے اثر قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسی متاثر روپ کو ہم پنجابی اُردو، بمبئیا اُردو کہتے ہیں۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی یا اُردو نے اسی طرح مختلف شہروں میں اپنا ڈیرا جما لیا ہے۔ ان میں سے کچھ زیادہ اہم ہیں اور ان میں سے ایک بھوپال ہے۔ یہاں کی علاقائی زبان کو ہم اُردو کی بھوپالی ذیلی بولی یا اختصار کے ساتھ بھوپال اُردو کہہ سکتے ہیں۔ یہ پاس پڑوس کے قصبوں مثلاً سیہور، آشٹہ، رائے سین، بیگم گنج وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ بھوپال مالوے کا جزو ہے گو بندیل کھنڈ کے ڈانڈے کو بھی چھوتا ہے۔ مالوے کا مرکزی حصہ بکرماجیت کے اجین، راجہ بھوج کے دھار، باز بہادر کے مانڈو اور اہلیہ بائی کے اندور پر مشتمل ہے لیکن روایت کے مطابق بھوپال

بھی دھار والے راجہ بھوج کا بسایا ہوا بھوج پال ہے۔

اس علاقے کی بولی مالوی ہے جو راجستھانی کی ایک ذیلی بولی ہے۔ یہاں کے ہندو مردوں کی پگڑی اور ان کی عورتوں کا لباس بھوپال اور راجستھان کی مماثلت کے شاہد ہیں۔ یہ وسیع علاقہ اُردو کا نہیں جس طرح ریگستان کے بیچ نخلستان ہوتا ہے اسی طرح مالوی کے سمندر میں بھوپال اور چند دوسرے قصبے اُردو کے جزیرے ہیں۔ شہر سے قصبات اور قصبات سے دیہات کی طرف کو جائیے، بتدریج اُردو کا اثر کم اور مالوی کا اثر زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ بھوپال میں بھی نچلے طبقے کے ہندو مثلاً دودھ والے، کہار (بھوئی) وغیرہ اُردو پر مالوی کی تہہ چڑھا کر بولتے ہیں۔

بھوپال بمبئی کی نسبت دلّی سے قریب تر ہے لیکن تہذیبی اور تجارتی تعلقات بمبئی سے زیادہ ہیں اس لیے بھوپال کی زبان کسی قدر بمبیا اردو سے بھی متاثر ہے۔ یعنی بھوپال کی زبان وہ اُردو ہے جس پر تھوڑا تھوڑا مالوی، بندیلی اور بمبئی کی ہندوستانی کا اثر ہے۔ اہلِ بھوپال کو اس کا شعور نہ ہوگا لیکن یو۔پی سے آنے والوں کو معیاری اُردو سے اختلافات بادی النظر ہی میں دکھائی دے جاتے ہیں۔ انھیں اختلافات کا نام بھوپالی اُردو ہے۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:

صوتی

۱۔ یائے لین کو یائے مجہول بولنا مثلاً ضمیر متکلم 'میں' اور 'پیسہ' کو فتحِ اوّل کی بجائے بکسرۂ اوّل سے ادا کرنا جس سے ضمیر 'میں' کی آواز حرفِ جار 'میں' (اندر) جیسی ہو جاتی ہے۔ یہ نزلہ انگریزی الفاظ پر بھی پڑتا ہے مثلاً وَیسٹ (West) بمعنی مغرب کو waste بمعنی برباد کرنا کے ہم آواز کر دیتے ہیں۔

۲۔ واؤ لین کو واؤ مجہول بنا دینا مثلاً سَو (بمعنی صد) کو فتحۂ اوّل کی بجائے پیش سے سُو بولتے ہیں۔ حرفِ عطف اَور کو پیش کے ساتھ اُور بولتے ہیں جس سے یہ ہندی لفظ بمعنی طرف کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔

۳۔ کہا، سہا کی وسطی ہ کو ی سے بدل کر فتحۂ اوّل کی جگہ کسرۂ اوّل سے بولتے ہیں یعنی کیا، سیا (یائے معروف کے ساتھ)۔ دلی کی کرخنداری اردو اور مغربی یو۔پی کی بولی میں بھی ان الفاظ کو مسخ کرتے وقت ہ کی جگہ ی رکھ دی جاتی ہے لیکن وہاں یہ ماقبل مفتوح ہوتی ہے جب کہ بھوپال میں ماقبل مکسور۔

۴۔ معکوس پر ختم ہونے والے بعض الفاظ کے آخر میں الف زائد کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً بیجا (بیج)، پیڑا (پیڑ)، دوبا (دوب)۔ آخری 'آ' کا رجحان یہاں تک ہے کہ باسی کو باسا کہتے ہیں۔

۵۔ چند دوسرے الفاظ کا مخصوص بھوپالی تلفظ ملاحظہ ہو۔
شعر میں ہمارے تلفظ میں ع یائے مجہول کی آواز دیتی ہے یعنی ہم اسے شیر (بمعنی ضیغم) کا ہم آواز کر دیتے ہیں لیکن بھوپال میں اسے یائے لین سے، بہ قافیۂ خیر بولتے ہیں۔ بھوپال کے شاعر اظہر سعید خاں کا مصرع ہے ع بھلا یہ شعر تمھیں کیوں پسند آئیں گے۔ وہ اس مصرع کو پڑھتے وقت شعر کو شَیر (بہ قافیۂ خیر) ادا کرتے ہیں۔
اسی طرح محلّہ میں م پر پیش ہے لیکن بھوپال میں م اور ح دونوں کو فتحتین سے اس طرح بولتے ہیں کہ محلّہ کے ابتدائی تین حرفوں کی آواز لفظ 'محل' جیسی ہو جاتی ہے۔ پٹھا بمعنی دفتی یا گتّا کو یہاں زبر کی بجائے فتحۂ اوّل سے پٹّھا بولتے ہیں۔ پتھر کو دکنی انداز سے پھتّر کہتے ہیں۔

نحوی

یہاں تعظیمی ضمیر حاضر 'آپ' کے ساتھ فعل کے وہ صیغے استعمال کرتے ہیں جو 'تم' کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ مثلاً

آپ ایسا کرو	بجائے	آپ ایسا کیجیے۔
آپ تو کھانا کھاؤ	بجائے	آپ تو کھانا کھائیے۔

معنوی

اسے ہم تین شقوں میں دیکھیں گے۔
(الف) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو مقامی اردو میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن بھوپال میں ان کے معنی قدرے مختلف ہیں مثلاً
<u>بائی</u> ۔ معیاری اردو میں 'بائی جی' محض طوائفوں کے لیے مخصوص ہے لیکن یہاں محض عورت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی بھی عورت کو بائی یا بائی جی کہہ کر خطاب کر سکتے ہیں۔

بھوپال میں اس لفظ کی کثرتِ استعمال ہمارا شنر کا اثر ہے۔

بوا بھوپال میں خادمہ کے معنی میں آتا ہے۔ مسلمان ملازماؤں کو بوا کہا جاتا ہے۔ یو پی میں ہندوؤں میں یہ لفظ باپ کی بہن کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مسلمان خواتین برابر والیوں کو بوا کہہ کر خطاب کرتی ہیں مثلاً

کارخانے میں ہے قدرت کے کیسے کل بوا   بچہ تم پہلے جنیں، بیاہ ہوا میرے بعد

(جان صاحب)

دادا۔ معیاری اُردو میں باپ کے باپ کے لیے مخصوص ہے۔ بنگال میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ بمبئی میں اس لفظ کے معنی اس طرح زوال پذیر ہوئے کہ غنڈے بدمعاش کو کہتے ہیں۔ بھوپال میں کسی بھی بڑے کو کہہ سکتے ہیں، خواہ وہ عمر کے لحاظ سے بڑا ہو یا رتبے کے لحاظ سے۔

کھیرا اور ککڑی شمالی ہند میں جسے کھیرا کہتے ہیں اسے بھوپال میں ککڑی اور جسے شمال میں ککڑی کہتے ہیں اسے یہاں کھیرا بولتے ہیں۔ بھوپال کے کھیرے (مقامی زبان میں ککڑی) لوکی کی طرح بڑی جسامت کے ہوتے ہیں اور اس کے باوجود کچے اور نرم رہتے ہیں۔ لکھنؤ کی پتلی دبلی ککڑی کی توصیف میں ہانک لگاتی تھیں۔

'لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں، کیا خوب ککڑیاں ہیں'

وہ بھوپال کی فربہ ککڑیوں (یعنی ہماری زبان میں کھیروں) کا ڈیل ڈول دیکھیں تو سر پیٹ لیں یا غش کر جائیں۔

پپیتے کو یہاں 'ارنڈ ککڑی' کہتے ہیں۔ اگلے زمانے میں یو پی میں اسے 'رنڈ خربوزہ' کہا جاتا تھا۔

خاں۔ نون غنہ کے ساتھ اُردو میں تنہا استعمال نہیں ہوتا۔ خاں صاحب کہتے ہیں یا نونِ اعلان کے ساتھ سرحد کے پٹھانوں کو 'خان' کہہ کر پکار لیتے ہیں۔ بھوپال چونکہ پٹھانوں کی بستی ہے اس لیے یہاں نون غنہ کے ساتھ 'خاں'، 'ارے خاں'، اور 'کیوں خاں' (مہلت میں 'کیوں خاں') کہہ کر خطاب کرنے کا عام دستور ہے۔ اس میں پٹھان کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہندو کو بھی 'ارے خاں' کہہ کر خطاب کیا جا سکتا ہے۔

کاریگر۔ یہاں معمار کے معنی میں مخصوص ہے۔ اس کے 'سہال' کو بھوپال میں گوریا کہتے ہیں۔

مالِ۔ سیمنٹ ریت کے ملاکر بنائے ہوئے گیلے مسالے کو کہتے ہیں۔

کھرا۔ بمعنی کونا۔ اس معنی میں یہ لفظ مہاراشٹر میں بھی بولا جاتا ہے۔

قند۔ بمعنی چینی۔ مانا کہ فارسی میں اس لفظ کے معنی شکر ہیں لیکن بھوپال میں کارخانے کی دانے دار چینی کو قند کہا جاتا ہے۔

جھاڑ۔ معیاری اُردو میں جھاڑی کا مکبّر ہے یعنی کانٹے دار یا بدنما یا سوکھی جھاڑی۔ بھوپال میں کسی بھی پودے کو کہتے ہیں شلاً چمیلی کا جھاڑ۔

مٹکا۔ معیاری اُردو میں مٹکا اتنے بڑے گھڑے کو کہتے ہیں جس میں آدمی گھس کر بیٹھ سکتا ہے لیکن بھوپال میں ہر گھڑے کو مٹکا کہتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔

عمدہ۔ یہ لفظ یہاں مخصوص انداز سے 'بہت اچھے' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

الف۔ "یہاں کیسے بیٹھے ہو؟"

ب۔ "عمدہ بیٹھے ہیں"

یا

الف۔ "ٹیکسی تو ملی نہیں تانگے سے آیا ہوں"

ب۔ "عمدہ"

کنے۔ (پاس) مثلاً اُس کنے یا اس کے کنے۔ قدیم اُردو میں یہ لفظ عام تھا۔ اب بھوپال کے علاوہ رام پور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اتفاق سے دونوں پٹھانوں کی بستیاں ہیں۔

بتانا۔ معیاری اُردو میں اس کے جو معنی ہیں بھوپال میں اس معنی میں تو استعمال ہوتا ہی ہے اس کے علاوہ یہاں "دکھانا" کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے مثلاً

'فوٹو ذرا مجھے تو بتاؤ'

اس معنی میں یہ لفظ بھوپال سے بمبئی تک مستعمل ہے۔

چلے گا۔ بمعنی "کام میں آئے گا" "راس آجائے گا" مثلاً

الف۔ "امرود ضرور کھاتا ہے"

ب۔ "چلے گا" (یعنی کوئی مضائقہ نہیں اسکو کھائیں گے۔)

الف۔ "دیکھیے یہ مکان کرایے پر مل سکتا ہے لیکن بہت چھوٹا ہے"

ب۔ "سب چلے گا" (یعنی اسی پر اکتفا کریں گے۔)

یہ بھی بمبئی کا محاورہ ہے جو بھوپال نے مستعار لیا ہے اور اب تو شمالی ہند کی طرف بھی بڑھتا جا رہا ہے۔
پٹکنا۔ معیاری اُردو میں کسی چیز کو اوپر سے اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارنے کو کہتے ہیں۔
بھوپال میں محض "رکھنے" کو کہتے ہیں۔ شدت یا تشدد کا کوئی شائبہ نہیں مثلاً "دیگچی چولہے پر پٹک دو"
کے معنی ہیں دیگچی چولہے پر رکھ دو۔
مچانا۔ سیمنٹ کے مسالے یا گارے کو بھگو کر معمار کے استعمال کے لیے تیار کرنا مثلاً
مال مچاؤ یعنی سیمنٹ اور ریت کو پانی میں ملا کر مسالہ بنالو۔ معیاری اُردو میں شور اور اس کے ہم معنی الفاظ
کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مثلاً شور مچانا، غل مچانا، ہڑ مچانا۔
دودھ کھانا۔ یہاں دودھ کے لیے پینے کے علاوہ کھانا بھی بولا جاتا ہے مثلاً "بابو جی سیر
دودھ بہت گاڑھا ہے۔ ایک دن کھا کر دیکھیے۔"
(ب) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو ہیئت اور معنی دونوں کے لحاظ سے معیاری اُردو کے
الفاظ سے کافی ملتے ہیں لیکن کسی قدر مختلف بھی ہیں مثلاً
ممیا۔ عوام میں ایک تعظیمی خطابیہ لفظ ہے جو ظاہر ہے ماما یعنی ماموں سے بنا ہے
پٹیا۔ (فرش لگانے کے پتھر کے تختے) نفری۔ (ایک آدمی کا ایک دن کا کام یعنی
man-day) چنیٹی (چونہ دانی)۔ سوجا۔ (سُوا یعنی بڑی سوئی جس سے بوری سیتے ہیں)
گلواتی۔ (چھوٹی مولی) بھٹا (بینگن) چھٹا یا چھٹے۔ (ریزگاری) کھلے (ریزگاری
(ج) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو معیاری اُردو میں بالکل نہیں ملتے مثلاً
بیا۔ یہ بائی کا مصغر ہے اور لڑکی کے معنی دیتا ہے۔ لڑکی کو بیا کہہ کر خطاب بھی کر سکتے
ہیں۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم کی دو صاحبزادیاں چھوٹی بیا اور بڑی بیا کے لقب سے مشہور تھیں۔
بندھانی (مرد مزدور)۔ ریزہ (عورت یا لڑکا مزدور جن کی مزدوری کم ہوتی ہے)
دہاڑی (ایک دن کی مزدوری)۔ یہ لفظ پنجابی سے لیا معلوم ہوتا ہے۔ پگار۔ (تنخواہ) یہ لفظ
مراٹھی سے آیا ہوگا۔ پٹیل۔ (گاؤں والوں کے لیے تعظیمی خطابیہ لفظ جیسے شمالی ہند میں چودھری کہتے
ہیں) بھوپال سے لے کر گجرات تک گاؤں کے مکھیا یا پردھان کو پٹیل کہتے ہیں۔ بھوپال میں لفظ گجراتی
سے مستعار ہونا چاہیے۔ ڈوکرا (بوڑھا) ابتدائی اُردو میں جو صوفیائے کرام کے کچھ فقرے ملتے ہیں
ان میں کسی بزرگ کی زبانی "بڑھ ڈوکرے" کہا گیا ہے۔ انھوں نے کسی لڑکے کو مزاحاً یا دُعا کے طور پر
بوڑھا کہا تھا۔

ڈوکری یا ڈکریا (بڑھیا)۔ کھکھیا (خالہ)۔ برونی (ملازمہ) خاص طور سے برتن مانجھنے والی)۔ بھولی۔ (کہار)۔

بٹلا (مٹر)۔ گنز پری (لوکی)۔ گلکی (توری)۔ روسے کی پھلی (لوبیے کی پھلی) بیہی (امرود) اس کی جمع بیہیں یا بہیں آتی ہے۔ تور یا توہر (ارہر) راج گیرا (چولائی جس کے لڈو بنتے ہیں) پیی (گیہوں) وہاں اس کی دو قسمیں مشہور ہیں دیسی پیی یعنی سفید رنگ کا گیہوں جو گھٹیا ہوتا ہے اور شربتی پیی جو ہلکے سرخ رنگ کا اور بڑھیا ہوتا ہے۔ بہی (چھاچھا جھجرے (دورتے یعنی جو کے چھوٹے پودے) شمالی ہند میں دسہرے کی رسم میں بہنیں بھائیوں کے کانوں پر رکھتی ہیں۔ بھوپال میں برسات تک کسی تقریب میں کام آتے ہیں۔

گھنکا (سونف الائچی کی طرح تواضع کا ایک خوش رنگ بنایا ہوا دانہ)۔ ہندی میں گھٹکا جادو کی شے کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو رانی کیتکی کی کہانی میں یا پھر چھوٹی کتاب کو بھی کہتے ہیں۔

چلر (ریزگاری) غلّا (پتھر کا ٹکڑا جو پھینک کر مارا جائے۔)

کھریلو۔ ک مفتوح۔ یائے مجہول اور آخری واؤ معروف کے ساتھ (کھپریل)

پھدی (بیڈ منٹن کھیلنے کی پروں کی چڑیا)۔ پنجابی میں اس کے معنی شرم گاہ کے ہیں۔

سدیں۔ یائے مجہول کے ساتھ (تڑکے)

بیٹنا۔ یائے معروف سے (دکھینا)

(د) محاوروں میں صرف تین یاد آتے ہیں۔

پٹیوں پر آجانا یعنی کنگال ہو کر اپنی اوقات پر آجانا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ بھوپال میں مکانوں کے باہر دو پتھر رکھ کر ان کے اوپر پتھر کا بڑا سا ٹکڑا رکھ دیتے ہیں جو ایک قسم کی عوامی بینچ کا کام کرتا ہے۔ اس پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہیں۔ صوفے اور کرسی سے گر کر پٹیوں پر بیٹھنا فلاکت کی نشانی ہے۔

جنّت کی چڑیاں۔ (ہیجڑے)

بردکاٹ بھوپالی۔ برد میں واؤ معروف ہے۔ بھوپال میں اس لفظ کے معنی سرکنڈہ ہیں جس کے قلم بنائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں بھوپال علاقے میں بیہڑ کا عالم تھا۔ جگہ جگہ سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ شروع شروع میں جو پٹھان یہاں آکر آباد ہوئے انھوں نے سرکنڈوں کو کاٹ کر زمین صاف کی۔ ان نوآبادیاتی متنداؤں کو بردکاٹ بھوپالی

کہتے ہیں۔ یعنی وہ قدیم بھوپالی جس کے اجداد نے یہ بستی بسائی تھی۔

بھوپال نے اُردو کو مشہور مزاح نگار ادیب مُلّا رموزی دیا۔ انھوں نے گلابی اُردو تو بہت لکھی لیکن بھوپالی روزمرّہ کو مزاح کا موضوع نہ بنایا۔ اس کے لیے کسی انشا کی ضرورت نہ تھی جو بھوپالی میر غفر غینی کی زبانی یہاں کے عوامی روزمرّہ کا لطف پیش کرتا۔ حیدرآبادی اُردو کی ظریفانہ تخلیقات پڑھنے میں آتی ہیں۔ بھوپالی اُردو میں بھی اسی ڈھنگ کی چیزیں ممکن ہیں اور میں نے ایک آدھ سُنی بھی ہیں۔ کاش کوئی فرزندِ بھوپال اپنی بولی پر آپ ہی ہنسنے کا سامان فراہم کرے۔

زبان کا مسئلہ

ہندوستان اور پاکستان کو ملا کر بجا طور پر ایک برصغیر کہا گیا ہے۔ روس کو چھوڑ کر یورپ کا رقبہ تقریباً اتنا ہی ہے۔ وہاں جس قدر زبانیں بولی جاتی ہیں اس برصغیر میں اس سے کم نہ ہوں گی۔ ہماری ریاستیں رقبے اور آبادی میں یورپ کے ممالک کی ہمسری کرتی ہیں۔

زمانہ ماقبل تاریخ میں جہاں تک ہم جا سکتے ہیں اس برصغیر میں سب سے پہلے بسنے والی نسل نیگرٹو (Negritto) تھی۔ اس نسل کی کچھ نشانیاں انڈمان کے غیر متمدن قبائل میں ملتی ہے۔ ان کے بعد آسٹرک نسل نے اس برصغیر کو آباد کیا۔ چھوٹا ناگپور کے آدی واسی اسی نسل کے ہیں۔ اس خاندان کی زبانوں میں منڈا گروہ سب سے اہم ہے۔ گنگا اسی آسٹرک خاندان کی زبان کا لفظ ہے۔ آسٹرکوں کے بعد دراوڑ اس برعظیم میں داخل ہوئے۔ یہ ایک بڑی تہذیب کے مالک تھے۔ بعد میں آریوں نے انھیں جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ آریہ ہندوستان میں اس طرح داخل ہوئے کہ یہاں کے مالک بن بیٹھے۔ ہندوستان کی اکثر زبانیں ہند آریائی ہیں۔ آریوں کے بعد عرب، افغان اور مغل حملہ آور ہوئے۔ ان کی تہذیب اور زبان نے ہندوستان کی بوقلمونی میں اضافہ کیا۔ انھوں نے ہندوستان کو فارسی سے آشنا کیا۔ آخری قابلِ ذکر بیرونی فاتح انگریز تھے جنھوں نے ملک کو انگریزی زبان دی۔

جس قدیم زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت کا دور دورہ تھا اس وقت مفتوحین یعنی دراوڑ تو اپنی زبانیں بولتے ہی تھے۔ تمام آریہ ایک ہی زبان کا استعمال کرتے ہوں یہ قرینِ قیاس نہیں۔ پشاور سے بنگال تک ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ اس زمانے میں رسل و رسائل کے وسیلے آج کل کے سے تو تھے نہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ کئی صدیوں کی مدت میں اتنے بڑے علاقے میں بول چال کی بولیاں مختلف نہ ہو گئی ہوں۔ علما کا خیال ہے کہ آج کی طرح اس دور میں بھی کئی دیسی بولیاں تھیں۔ سنسکرت ایک مرصّع ادبی زبان تھی جو اس زمانے کی بول چال کی زبان کی

نمائندگی نہیں کرتی۔ سرکاری[1] زبان کمیشن کی رائے ہے کہ کلاسکل سنسکرت کبھی جمہور کی زبان نہ تھی۔

نیچی ذات والوں کو سنسکرت سیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ جو مشہور ہے کہ شودروں کے لیے سنسکرت سننے پر بھی قدغن تھی، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ قابلِ عمل نہیں کیوں کہ راجاؤں کے محل میں داس داسیاں تو ہوتے ہی تھے۔ کیا ان کے سامنے ان کے آقا آپس میں بولتے چالتے نہ ہوں گے۔ اس زمانے کی دیسی بولیوں کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ کئی صدیوں کے بعد جب پراکرتوں کی تشکیل ہوئی تو سنسکرت ڈراموں میں طبقۂ بالا کے افراد سنسکرت میں گفتگو کرتے ہیں اور عوام پراکرتوں میں۔ اکثریت سے مغائرت برتنے، زیادہ مرصع ہونے اور قواعد میں جکڑبند ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۵۰۰ ق۔م۔ کے لگ بھگ سنسکرت بول چال کی زبان کے طور پر ترک ہو گئی اور اس کی جگہ پہلے پالی نے لی پھر پراکرت نے اور پھر اپ بھرنش نے لیکن اس زمانے میں بھی سنسکرت حکومت، تہذیب اور ادب کی زبان کی حیثیت سے چھائی رہی۔ پانچسو قبل مسیح سے بارھویں صدی تک ہندوؤں کے راج میں سرکاری زبان کے طور پر سنسکرت استعمال ہوا کی۔ ملک کے مختلف حصّوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن سنسکرت ہر ایک کو قبول تھی۔ حد تو یہ ہے کہ دراوڑوں نے بھی سنسکرت کو اسی طرح پڑھنا لکھنا شروع کیا جس طرح شمال کے آریوں نے۔ اسلامی دورِ حکومت میں جب سرکاری زبان فارسی ہو گئی تو شمال میں سنسکرت کا چراغ گل ہو گیا۔ لیکن اہلِ دکن نے اس کی لَو کو ویسے ہی فروزاں رکھا۔ چنانچہ بیسویں صدی میں بھی شمال کی نسبت دکن میں سنسکرت کا زیادہ رواج ہے۔ اس علاقے میں سنسکرت کے بڑے بڑے علما ہوئے ہیں۔

اسلامی دورِ حکومت میں دربار اور امرا کی مجلسوں پر فارسی کا عمل دخل رہا۔ چند بیرونی علماء کے علاوہ یہ بھی عوام کی زبان نہ تھی لیکن یہ بھی ملک کی تہذیبی اور ادبی زبان بن گئی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں کمپنی نے فارسی کو ترک کرکے عدالتوں اور دفتروں کی نچلی سطح پر اُردو کا چلن کر دیا اور اوپری سطح پر انگریزی رائج کی۔ ہندوستان اور پاکستان کی مرکزی حکومتوں کا کام آج بھی زیادہ تر انگریزی میں ہو رہا ہے۔ اس طرح یہ صاف نظر آتا ہے کہ ۵۰۰ ق۔م سے آج تک یعنی

---

[1] نیشنل لینگویج کمیشن رپورٹ (انگریزی میں) ص ۲۱

پچھلے دو ہزار سال میں اس برصغیر کی مرکزی حکومت کا کام کبھی جنتا کی بھاشا میں نہیں ہوا۔

ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف زبانوں کا دیس ہے۔ یہ اختلافات ہی کیا کم تھے کہ مذاہب اپنی جنگی نعروں کے ساتھ یہاں میں کود پڑے۔ جس ملک میں اتنے سارے اختلافات ہوں اس کا ایک قوم کے شیرازے میں منسلک ہونا آسان کام نہ تھا۔ پھوٹ ڈالنے والی طاقتوں میں مذہب سب سے زیادہ مہلک ثابت ہوا اور اس کے نام پر ملک تقسیم ہو گیا۔ آزادی سے قبل زبان کا مسئلہ بھی اسی سیاست میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت نہ ہندی تامل کا جھگڑا تھا نہ ہندی پنجابی کا بلکہ تمام افتراقات ہندی اردو پر مرکوز ہو کر رہ گئے تھے۔

آزادی سے پہلے کے ہندی اُردو نزاع کی داستان اتنی تلخ ہے کہ اس کے سننے کی تاب کم ہی لوگ لا سکتے ہیں۔ ذیل میں اختلافی امور سے قطع نظر کر کے چند اشاروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ہندی نے برج، بندیلی، اودھی، بھوجپوری، میتھلی، چھتیس گڑھی اور راجستھانی وغیرہ کو اپنے دامن میں لے لیا۔ اُردو نے محض کھڑی بولی سے سروکار رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی کی پشت پر افراد کی جتنی بڑی تعداد ہے اُردو کے پیچھے نہیں۔ مغربی یوپی کے علاوہ بقیہ علاقوں میں کھڑی بولی کا چلن محض شہروں میں تھا۔ گیارھویں صدی سے انیسویں صدی تک ہندی کھڑی بولی میں کہیں کہیں اکا دکا کوئی تحریر مل جاتی ہے لیکن یہ ایک مضبوط روایت نہ بن تھی۔ اُردو میں کھڑی بولی کی مقبولیت دیکھ کر ہندی نے بھی کھڑی بولی کی طرف توجہ کی اور اس میں تیزی سے ادب کی تخلیق ہونے لگی یہاں تک کہ بیسویں صدی میں نئی ہندی کی دکان میں ایک وقیع سرمایہ جمع ہو گیا۔ کچھ ہی سال بعد یہ ہوا کہ ہندی نے اُردو کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ ملک میں ہندی کی کتابیں اُردو سے دُگنی چھپتی تھیں اور یوپی میں تو یہ اُردو کے مقابلے میں سات آٹھ گنی ہوتی تھیں۔ مولوی عبدالحق نے ایک خطبے میں یوپی کی ہندی اُردو مطبوعات کی تقابلی تعداد دی ہے۔[1]

سنہ	ہندی مطبوعات	اُردو مطبوعات
۱۹۳۱ء	۱۶۵۹	۲۸۶
۱۹۳۲ء	۲۰۹۰	۴۰۱

---

[1] خطبات عبدالحق حصہ دوم طبع اوّل ص ۱۰۹

۱۹۳۲ء	۲۲۳۲	۲۷۵
۱۹۳۵ء	۲۰۹۶	۲۰۶
۱۹۳۶ء	۲۰۹۸	۲۵۴
۱۹۳۹ء	۱۷۸۵	۱۸۲
۱۹۴۰ء کے ۹ مہینے	۱۰۷۷	۱۵۹
۱۹۴۱ء	۱۴۹۰	۱۹۸

ان حالات میں دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ اُردو ہندی سے مفاہمت کرکے ساتھ جینے کی کوشش کرتی لیکن ہندی کی طرح اُردو تحریک بھی بلا شرکت غیرے اس ملک کی واحد قومی زبان بننا چاہتی تھی۔ مولوی عبدالحق کا دعویٰ تھا

"اس ملک میں جہاں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں یہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک کی مشترکہ اور عام زبان ہونے کا حق رکھتی ہے"[1]

"تمام ملک ہندوستان میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اکثر صوبوں میں بلکہ تقریباً ملک کے ہر علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اور ملکی یا قومی زبان ہونے کا حق رکھتی ہے"[2]

ملک کی تقسیم نے اُردو۔ ہندی۔ ہندوستانی کا قضیہ طے کر دیا۔ اُردو پاکستان کی قومی زبان بنی، ہندی ہندوستان کی۔ روایت کی جاتی ہے کہ مجلس آئین سازی کی کانگریس اسمبلی پارٹی میں بحث اٹھی تھی کہ ملک کی زبان ہندی ہو کہ ہندوستانی برائے نام اکثریت سے ہندی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ تقسیم ملک سے پہلے کی فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے بعد پاکستان کے جارحانہ رویے کی ہیبت اس طرح دلوں پر طاری تھی کہ آئین ساز اسمبلی نے اتفاق رائے سے ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔ ریاستوں کے حصے میں علاقائی زبانیں آئیں۔ دستور میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ۱۵ سال تک مرکز اور ریاستوں میں انگریزی کا چلن رہے گا لیکن ساتھ ہی ہندی اور علاقائی زبانیں آہستہ آہستہ کام کاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں گی یہاں تک کہ

---

[1] ۔ خطباتِ عبدالحق حصہ دوم طبع اول ص ۱۴۳

[2] ایضاً ص ۱۸۷

۱۹۶۵ء میں انگریزی کو بالکل ہٹا دیا جائے گا۔ اگر اس میں کوئی دقت ہو تو پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں قانون بنا کر انگریزی کے استعمال کی مدت میں توسیع کر سکتی ہیں۔ پانچ سال بعد ایک سرکاری زبان کمیشن مقرر ہوگا جو یہ دیکھے گا کہ انگریزی کی جگہ ہندی کو استعمال میں لانے کی رفتار کیسی ہے اور اس کے لیے مزید کیا کرنا چاہیے۔

دستور کے آٹھویں گوشوارے میں ملک کی ۱۴ زبانوں کی فہرست دی گئی ہے۔ وہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ سنسکرت کو بھی ان میں شامل کر لیا گیا ہے۔ سنسکرت کی عظمت مسلم لیکن سنسکرت اب تو کسی کی زبان نہیں۔ میں اپنے مرحوم پردادا کا لاکھ احترام کروں لیکن مردم شماری کے وقت اپنے اہلِ خانہ کے سلسلے میں ان کا نام تو نہیں لکھا سکتا۔ اگر ہندوستان کی تمام زندہ مردہ زبانوں کا شمار کرنا تھا تو سنسکرت اور نئی زبانوں کی درمیانی کڑیوں کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ پالی، اہم پراکرتوں اور خاص خاص اپ بھرنشوں کے نام بھی کیوں نہ ٹانک دیے گئے۔ بول چال کی زبان کی حیثیت سے تو کوئی سنسکرت کا بولنے والا نہیں لیکن چند پڑھے لکھے پنڈتوں نے مردم شماری میں اسی کو اپنی مادری زبان لکھا دیا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۵۵۵ تھی، ۱۹۶۱ میں ۲۵۴۴ ہو گئی۔ یہ اضافہ پانسو فی صدی ہے۔ ان بزرگوں میں ضبط تولید کا پرچار ہونا چاہیے۔

سنسکرت میں اخبار اور رسالے نہیں نکلتے، ادبی تخلیق نہیں ہوتی لیکن علاقائی زبانوں کے دوش بدوش جگہ پانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ہر سال اس کی کتاب کو بھی پانچ ہزار کا انعام دیا جاتا ہے حالاں کہ اس میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد ہی کتنی ہوتی ہے سہ لسانی فارمولے کے تحت یوپی سرکار نے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔ غرض زندہ زبانوں کو جو حقوق ملتے ہیں ان میں سنسکرت بھی برابر کی شریک ہے۔ اگر ملک کی تہذیب میں اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو لیا گیا ہے تو انگریزی کو بھی لینا چاہیے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہماری روزانہ زندگی اور ہماری نئی تہذیب میں انگریزی سنسکرت سے کہیں زیادہ رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ تو ہندوستانیوں کے ایک طبقے کی مادری زبان بھی ہے۔ اینگلو انڈین اسکولوں کے مقدمے میں فیصلہ دیتے ہوئے بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد علی کریم چھاگلا نے اعلان کیا،

"آئینی اعتبار سے آج انگریزی بھی اسی طرح دستور میں مسلمہ ہندوستانی زبان ہے اور اسی طرح تحفظ کی مستحق ہے جس طرح اس ملک کے اور کسی گروہ یا طبقہ کی زبان۔"

جب ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ چکا چوندھ اور بوکھلاہٹ دور ہوئی اور حواس
ٹھکانے آئے تو علاقائی زبان بولنے والوں کو احساس ہوا کہ ہندی کے سرکاری زبان ہونے کے
کیا معنی ہیں۔ تمام بڑی سرکاری ملازمتوں میں جہاں دکن اور بنگال کے باشندوں کا غلبہ تھا۔ ہندی
کے آنے کے بعد نقشہ ہی بدل جائے گا۔ اب کیا کیا جائے۔ کوئی یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا کہ تامل یا
بنگلہ وغیرہ کو مرکزی زبان بنادو۔ ڈوبتے کو انگریزی کے تنکے کا سہارا ملا۔ مطالبہ یہ کیا گیا کہ ہندی بہت
پچھڑی ہوئی زبان ہے ابھی انگریزی کو چلنے دو۔ ادھر ہندی والے سمجھ بیٹھے تھے کہ ہندی کو رواج
مل گیا۔ انھیں جلدی تھی کہ انگریزی کو دیس نکالا دے کر ہندی کو سنگھاسن پر براجمان کردیا جائے۔
اس طرح نئے ہندوستان میں زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دنیا میں اور بھی ملک ہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانوں کے بولنے والے کافی تعداد میں ہیں
سوئٹزرلینڈ۔ کناڈا۔ بلجیم وغیرہ۔ لیکن ان میں دو تین زبانوں کا مسئلہ ہے اور عام طور سے ہر باشندہ
دونوں تینوں اہم زبانوں کو جانتا ہے۔ ہندوستان کی سی لسانی کثرت کہیں ہے تو روس میں۔ یہاں
دو سو زبانیں اور بولیاں ہیں جن میں سے ۱۶ اہم ہیں۔ ۱۸ کروڑ کی کل آبادی میں سے دس کروڑ
کی مادری زبان روسی ہے۔ ۳ کروڑ ۶۵ لاکھ کی یوکرینی، بقیہ میں بائلو روسی، ازبک اور تاتار وغیرہ
ہیں۔ مرکزی حکومت کا کام روسی میں ہوتا ہے لیکن سب قوانین اور گزٹ سولہ زبانوں میں چھپتے ہیں۔
روس کئی جمہوریتوں کا وفاق ہے۔ وہاں ہر ریاست نے اپنی مادری زبان کے لیے روسی رسم الخط
اختیار کرلیا ہے۔ روسی زبان پڑھنا اگرچہ لازمی نہیں لیکن ہر ریاست میں ہر شخص "اپنی مرضی" سے
روسی زبان پڑھتا ہے اس لیے مشترک زبان کے لیے کوئی دقت نہیں۔ روس کے نظام میں تو ہر شخص کی
مرضی ایک ہی جہت میں چل سکتی ہے۔ مشکل ہے تو ہندوستان میں جہاں ہر فرد کو بہت کچھ آزادی
دی گئی ہے۔ لیکن ہم روس کی اس بات کی تعریف کریں گے کہ وہاں ہر چھوٹی سے چھوٹی علاقائی
زبان کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس میں تخلیقی ادب کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ہمارے
ملک میں کم از کم اردو کی حد تک معاملہ اس کے برعکس ہے۔

ہندی کو ملک کی سرکاری زبان اس لیے بنایا گیا کہ اس کے بولنے والے دوسری کسی بھی زبان
کے بولنے والوں سے کہیں زیادہ ہیں لیکن بڑی کمی یہ ہے کہ ادبی اعتبار سے یہ کم از کم دو زبانوں بنگلہ
اور تامل سے نیچے بھی رہتی ہے اور عمر میں بھی کم ہے۔ مراٹھی کا ادب بھی ہندی سے کم نہیں۔ بنگال
اور مدراس وہ علاقے ہیں جن کا سب سے پہلے انگریزوں سے ملنا جلنا ہوا اور جس کی وجہ

سے انھوں نے سب سے پہلے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ ایک صدی کی پہل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علوم میں وہ بقیہ صوبوں سے آگے بڑھ گئے۔ ان کی زبانیں زیادہ ترقی کر گئیں۔ انگریز مستشرقین کلکتہ میں سنسکرت کالج کے قیام پر زور دیتے تھے لیکن راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء میں حکومت سے احتجاج کیا کہ سنسکرت کی بجائے انگریزی تعلیم دیں۔ انھوں نے کہا۔

"اگر برطانوی پارلیمنٹ کا منشاء ہندوستان کو جہالت میں مبتلا رکھنا ہو تو سنسکرتی نظام تعلیم اس مقصد کی تکمیل کے لیے بہترین آلہ تھا لیکن چونکہ مقصد ہندوستانی آبادی کی اصلاح ہے اس لیے جدید اور ترقی یافتہ نظام تعلیم جاری کرنا چاہیے۔"

مجلس تعلیمات عامہ دسمبر ۱۸۳۱ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو قدیم مشرقی تعلیم رائج کرنے میں کتنی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہر طرف انگریزی تعلیم کی مانگ تھی۔

ہندی علاقے سب سے بعد میں انگریزی عمل داری میں آئے اس لیے وہ جدید علم کے باب میں سب سے پچھڑے رہے۔ ہندی اُردو بولنے والے دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس وجہ سے بھی انگریزی میں کم مہارت رکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں مختلف زبانیں بولنے والوں کو دو مشترک زبانیں ملتی ہیں۔ انگریزی اور ہندوستانی۔ دوسری زبان والے اپنی ضرورت اکثر انگریزی سے پوری کرتے ہیں لیکن ہندوستانی بولنے والا ہر جگہ ہندوستانی سے کام چلا لیتا ہے۔

ہندی صوبوں کے بعد ہندی کے معاملے میں صوبہ بمبئی (جو اس وقت مہاراشٹر اور گجرات میں تقسیم نہ ہوا تھا) نے سب سے زیادہ جوش دکھایا لیکن اس صوبے کے ارباب حکومت کے ذہن میں ہندی کا نقشہ کچھ اور ہی ہے۔ بمبئی گورنمنٹ نے ۴۹ء میں گاندھی جی کی ہندی ہندوستانی کو اپنی زبان قرار دے لیا تھا لیکن جب دستور ساز اسمبلی میں زبان کے مسئلے پر غور کیا گیا تو بمبئی گورنمنٹ نے اپنا پہلا فیصلہ معطل کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں بمبئی گورنمنٹ کی ہندی ٹیچنگ کمیٹی نے اپنی رپورٹ دی جس میں ایک وسیع ہندی کی سفارش کی گئی۔ اس ضمن میں آئین کی دفعہ ۳۵۱ کی طرف دھیان دلایا گیا

It shall be the duty of the union to promote the speed of the Hindi language to develope it so that it may serve as a medium of expression for

---

[1] و [2] انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۸۴ از عبداللہ یوسفی

all the elements of composite culture of India and to secure its enrichment by assimilating without interfering with its genius the form, style and expressions used in Hindustani and in the other languages of Indian specified in the eighth schedule.

آٹھویں گوشوارے میں علاقائی زبانیں گنائی گئی ہیں ان میں ہندی بھی ہے۔ دلیل کی گئی کہ دفعہ ۳۵۱ میں مذکور مرکزی ہندی کو منجملہ اور زبانوں کے ہندوستانی اور خود علاقائی ہندی سے بھی استفادہ کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مرکزی ہندی علاقائی ہندی سے مختلف ہوگی۔ ماولنکر جی نے (جو بعد میں لوک سبھا کے اسپیکر ہوئے) پشچم بھارت راشٹر بھاشا سمیلن میں سنہ ۱۹۵۰ء میں کہا۔

"حالاں کہ قومی زبان کا نام ہندی رکھا گیا ہے تو بھی یہ یوپی یا راجستھان میں جیسے بولی جاتی ہے ویسا ماننا بڑی بھول ہوگی۔ اس پر مختلف صوبوں کی زبانیں کا اثر ہوگا اور شاید مختلف صوبوں میں اس کا رنگ مختلف ہوگا۔"

سنہ ۱۹۵۱ء میں بی۔ جی۔ کھیر نے (جو بعد میں سرکاری زبان کمیشن کے صدر ہوئے) کہا کہ دستور میں جو ہندی ہے وہ آہستہ آہستہ پیدا ہوگی اور یہ یوپی یا بہار یا مدھیہ پردیش کی ہندی نہیں بلکہ گاندھی جی کی ہندی ہندوستانی ہوگی۔ سی۔ پی۔ اسمبلی کے اسپیکر گھنشیام داس گپتا نے بھی یہی کہا کہ قومی زبان کے طور پر ہندی، دلی، لکھنؤ، الٰہ آباد یا رائے پور کی ہندی نہ ہوگی۔ کاکا کالیکر، مہا مہوپادھیائے پوندار، ہریجن کے ایڈیٹر مگن بھائی دیسائی سب کے ذہن میں ملکی ہندی کا یہی تصور تھا۔ خود کانگریس ورکنگ کمیٹی[1] نے اپریل ۵۴ء میں علاقائی ہندی اور قومی ہندی کا ذکر کیا۔ اس کے بعد پنڈت نہرو[2] نے کانگریس پارلیمانی کمیٹی کے بند اجلاس میں یہی کہا کہ علاقائی اور ملکی ہندی دو طرح کی ہوں گی۔ سرکاری زبان کمیشن کے ممبر مگن بھائی دیسائی نے ایک اختلافی نوٹ میں اسی وسیع ہندی کی مانگ

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۲۹۲

[2] ایضاً ص ۳۰۳

کی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں این۔وی۔ گیڈگل اور مہاراشٹر کے سابق وزیر صنعت ایس۔جی۔ بارے نے اسی ہندی کا تذکرہ کیا۔

بمبئی گورنمنٹ نے ۱۹۵۴ء میں طے کیا کہ ۱۹۵۵ء سے ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے۔ مدراس کے اخبار "ہندو" نے ۵ مارچ ۱۹۵۴ء کے اداریہ میں اس فیصلے کی سخت نکتہ چینی کی۔ اپریل ۱۹۵۴ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے طے کیا کہ شروع سے آخر تک پوری تعلیم علاقائی زبان میں ہوگی۔ ادھر لسانی صوبوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو بمبئی نے ہندی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کا فیصلہ تعطل میں رکھا۔

علاقائی زبانوں کے بجائے ہندی میں کام کاج ہو تو غیر ہندی عوام کو تقریباً وہی دشواری رہے گی جو انگریزی کے ہوتے ہے۔ اس لیے مہاتما گاندھی نے ہمیشہ اس بات کی وکالت کی کہ صوبوں کی سطح پر وہاں کی علاقائی زبان سرکاری زبان ہوگی۔ دفتروں میں جو زبان استعمال ہوتی ہے تعلیم یافتہ جوانوں کو اسی میں مہارت لے کر نکلنا چاہیے۔ اس لیے یہ بھی لازم ہوا کہ مختلف صوبوں میں شروع سے آخر تک تعلیم علاقائی زبان میں ہو۔ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں پہلے یونیورسٹی تعلیمی کمیشن دونوں نے علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش کی۔

اُردو نے دیکھا کہ نئے ہندوستان میں اس کے لیے تو کوئی جگہ ہی نہیں چناں چہ یوپی میں اُردو کے لیے دستخطی مہم جاری کی گئی۔ ۳۰ مئی ۱۹۵۳ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی گشتی چٹھی جاری ہوئی کہ علاقائی زبانوں کو بڑھاوا دینا چاہیے اور اس سلسلے میں اُردو کو بھی اس کا مناسب مقام ملنا چاہیے۔ یوپی کانگریس کی مجلس عاملہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یوپی میں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ دستخطی مہم کی حیرت انگیز کامیابی پر جھنجھلا کر لوک سبھا میں پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس یہاں تک کہہ گئے "اُردو بیرونی زبان ہے۔ اگر اس کی ہمت افزائی کی گئی تو یہ ہندوستانی کلچر کو مجروح کرے گی۔"[۵۱]

اس پر تبصرہ کرنا تضیع اوقات ہے۔ ٹنڈن جی کی یہ خواہش تھی کہ انگریزی کی جگہ علاقائی زبانیں نہیں بلکہ ہندی لے یعنی دوسری زبانوں کے علاقے میں بھی ہندی حاکم اور وہ زبانیں محکوم رہیں۔ ۲۹ جنوری ۱۹۵۳ء کو گورکھپور جن پد ساہتیہ سمیلن سے خطاب کرتے ہوئے کہا

"ملک کے بعض خطوں میں علاقائی زبانوں یا انگریزی کے لیے آوازیں اٹھائی گئی ہیں۔

---

۵۱ Our Language Problem. از ایم۔پی۔ ڈیسائی۔ ص ۱۴۲

۵۲ ایضاً ص ۱۴۱

ہندی ہماری لازمی زبان ہونی چاہیے اور مراٹھی، بنگالی، گجراتی اور دوسری زبانیں ثانوی زبان کے طور پر پڑھائی جائیں۔ کسی صورت میں انگریزی کو ہماری لازمی زبان نہ ہونا چاہیے۔"

تو ہندی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ سارے دیس کی بھٹ ماتی بن جائے۔ اس پر علاقائی زبانوں میں احتجاج کیا گیا۔ آج کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ مختلف صوبوں میں ہندی کو اوّل اور علاقائی زبانوں کو ثانوی حیثیت دی جائے۔

انگریز ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچا کر گئے لیکن وہ ہمیں کچھ نہ کچھ دے کر بھی گئے۔ پارلیمانی طرزِ حکومت، قانون کا راج اور نظامِ عدل، اور انگریزی زبان۔ انگریزی ملک کے تمام پڑھے لکھوں کی واحد مشترکہ زبان ہے۔ ملک ہی کیا، اب تو یہ دنیا بھر کی رابطے کی زبان ہو گئی ہے۔ ثانوی زبان کے طور پر یہ دنیا کے اکثر ملکوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ سرکاری زبان کمیشن کی رپورٹ سے ذیل کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

روس میں تقریباً چالیس فی صدی اسکولوں میں انگریزی زبان کا انتظام ہے جن میں ایک کروڑ بچے انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ مشرقی یورپ کے ملکوں میں روس کے بعد انگریزی کا سب سے زیادہ مطالعہ ہو رہا ہے۔ فرانس میں پچھلی جنگِ عظیم کے بعد سے اور اسکینڈنیویا کے ملکوں میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے انگریزی دوسری خاص زبان ہو گئی ہے۔ اٹلی، اسپین اور پرتگال میں گو فرنچ بہت مقبول ہے لیکن اب انگریزی بھی کافی بڑھتی جا رہی ہے۔ بحیرۂ روم کے کنارے کے دوسرے ملکوں مثلاً یونان، ترکی، مصر، لیبیا اور دوسرے ملکوں میں اب فرنچ کی جگہ انگریزی کا چلن ہوتا جا رہا ہے۔ انڈونیشیا میں ڈچ زبان کی جگہ ہائی اسکول میں انگریزی لازمی کر دی گئی ہے۔ جاپان میں اب یونیورسٹی کے پہلے دو سالوں میں انگریزی لازمی ہے۔

دنیا کے دوسرے ملک انگریزی کو خاص بیرونی زبان کی حیثیت سے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ کیا ہم اپنے قبضے میں آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا دیں۔ ہندوستان کے حصے میں جدید مغربی علوم سے جو کچھ آیا وہ محض انگریزی کے ذریعے سے۔ زبان کا ارتقا سماجی ضرورتوں کے مطابق ہوتا ہے جو تہذیب جتنی ترقی یافتہ ہوگی اس کی زبان بھی ویسی ہی ہوگی۔ ہندوستان جب تک معاشی اعتبار سے پچھڑا رہے گا اس کی زبانیں بھی پس ماندہ رہیں گی۔ انگلستان اور امریکہ کی مادّی ترقی کے باعث انگریزی زبان بھی دنیا کی سب سے متموّل زبان ہو گئی۔ ہم انگریزی زبان کے ذریعے دنیا کی کسی زبان

کے ادب کا مطالعہ کر سکتے ہیں خصوصاً سائنس اور دوسرے تکنیکی علوم کی ترقی کی ایک جھلک ہم انگریزی کی کھڑکی ہی سے دیکھ سکتے ہیں۔ روسی اور جرمن زبان جاننے والے تو ہمارے دیس میں نہ قابل لحاظ ہیں، نہ ہونے کا امکان ہے۔ سرکاری زبان کمیشن کو مدراس سرکار نے جو یادداشت دی تھی اس میں ہندی کو انگریزی پر ترجیح دینے کی وجہ لکھی تھی

English provides and Hindi can not provide direct access to creative modern thoughts.

اہل ہندی انگریزی پر دو اعتراض کرتے ہیں (۱) ہندوستان میں انگریزی جاننے والے ایک منفرد قوم بن گئے ہیں جو عوام کے سامنے احساس برتری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ (۲) ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی انگریزی صرف دو فی صدی لوگوں کو آتی ہے اس لیے اس کا چلن فوراً بند کر دینا چاہیے۔

جہاں تک احساس برتری کا سوال ہے ہندی میں اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے حضرات بھی اس نشے میں انگریزی والوں سے کم چور نہیں۔ اس کا تجربہ کسی اور کو ہو کہ نہ ہو ہندی علاقوں کے اردو والوں کو دن رات ہوتا رہتا ہے۔ جہاں تک تعداد کا سوال ہے دو فی صدی انگریزی جاننے والوں میں صرف انھیں کو شمار کیا گیا ہے جو ہائی اسکول پاس ہیں جب کہ ہندی کے پڑھے لکھوں میں ہر طفل مکتب کو گن لیا گیا ہے۔ یہ جو دو فی صدی انگریزی داں ہیں یہی ہندوستان کے فکر و فن کے امین ہیں پروفیسر۔ ڈاکٹر۔ انجینئر۔ سائنس داں۔ ماہر معاشیات۔ وکیل۔ جج۔ سرکاری ملازم۔ سیاسی رہنما۔ صحافی بڑے ادیب۔ مصور وغیرہ انھیں دو فی صدی میں ہیں۔ یہ قوم کے ذہنی قائد اور تہذیبی نمائندے ہیں۔

یہی نہیں ہندوستانی زبانوں کے جتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں وہ سب انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی پیداوار ہیں وہ اسی دو فی صدی نمک کا حصہ ہیں۔ انگریزی اداروں کے باہر جدید ہندوستانی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہی کہاں ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کا تقریباً تمام جدید ادب انگریزی دانوں ہی کی دین ہے۔ ہر ہندوستانی ادب پر مغرب کی گہری چھاپ ہے۔ آج اردو کے شعرا، نقادوں، صحافیوں، افسانہ نگاروں پر نظر ڈالیے۔ دو چار کے سوا سب انگریزی میں اچھا دخل رکھتے ہیں مشرق کی کلاسکی زبانوں سے ہمیں جو ملنا تھا وہ مل چکا۔ اب مغرب کے بحر بے پایاں سے ہمیں اپنی جھولی بھرنی ہے۔ اگر ہم انگریزی سے کھنچے کھنچے رہنے لگیں تو بس ہند کے گنبد میں بند ہو کر رہ جائیں گے۔

اہل ہندی کی ہمیشہ یہ مانگ رہی ہے کہ فوراً ہر جگہ ہندی کا نفاذ کر دینا چاہیے۔ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ پر غور کرنے کے لیے جو پارلیمانی کمیٹی بنی اس کی رو... ڈاکٹر رگھوویر، پرشوتم داس ٹنڈن

سیٹھ گووند داس وغیرہ نے اختلافی نوٹ لگائے۔ ان بزرگوں کی مانگ تھی کہ فوراً آج ہی سے ہائی کورٹ۔ سپریم کورٹ۔ مرکزی ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں، ہندی ریاستوں کے دفتروں وغیرہ میں ہندی میں کام کرنا شروع کردو۔ ان حضرات کے لیے زبان ایک مقصد کے حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں خود مقصود بن کر رہ گئی ہے۔ کے۔ ایم۔ منشی جو ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہ چکے ہیں انھوں نے سرکاری زبان کمیشن کو ایک یادداشت دی۔ اس میں ایسے ہی لوگوں کو نظر میں رکھ کر جو کچھ کہا وہ انھیں[1] کے الفاظ میں سنیے۔

"Movemnts are afoot to eliminate English rapidly from several spheres of life; Hindi can not take its place with equal speed. By an over enthusiastic effort at removing English from its place, Hindi has not gained; it has lost. Thoughts to the ordinary mind the elemination of English appears to be a highly patriotic performance. Our gratest danger today is militant regional linguism."

"If India has to stand completion with the world in intellectual equipment, it can not do with only a second class linguistic instrument which is yet in the process of making."

سرکاری زبان کمیشن رپورٹ میں دو ممبروں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی اور پی۔ سبّارین نے اختلافی نوٹ دیے ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے ممبرانِ پارلیمنٹ کی جو کمیٹی مقرر کی گئی اس کی رپورٹ میں فرینک اینتھونی کا اختلافی نوٹ قابلِ ذکر ہے۔ ان تینوں رپورٹوں کو پڑھیے تو غیر ہندی لوگوں کے دلوں کی دھڑکن، اپنی زبان سے والہانہ عشق اور ہندی سے ان کے خدشات کا اندازہ ہوگا۔ کمیشن اور پارلیمنٹری کمیٹی دونوں میں اردو کا ایک ایک نمائندہ تھا۔ انھوں نے کوئی اختلافی رپورٹ دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ان کے رویّے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ملک میں سب

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۳۲۱

سے زیادہ آسودہ اور مطمئن زبان ہے۔ ان سے بہتر تو اغیار ہیں جنھوں نے اُردو کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے۔ اُردو کے نمائندے اہلِ اُردو کے جذبات کی نمائندگی نہ کر سکے۔ انھیں لب کشائی کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ گورنمنٹ کے صرفے پر اُردو کے کیس کی کتنی اچھی اشاعت ہو جاتی۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ ہندی[1] انیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے ربع میں اُردو سے عربی فارسی الفاظ نکال کر بنی ہے۔ نیز یہ کہ مغربی اتر پردیش کی زبان اردو[2] ہے ہندی نہیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ڈاکٹر چیٹرجی کے یہ جذبات حُبِ معاویہ کی وجہ سے نہیں بلکہ بغضِ علی کا نتیجہ ہیں۔ آزادی سے پہلے لکھی ہوئی اپنی مشہور کتاب انڈو آرین اور ہندی میں ڈاکٹر چیٹرجی نے اُردو کے خلاف بہت کچھ زہر اگلا ہے۔ فرینک اینتھونی نے اپنے نوٹ میں جے پال سنگھ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

”آدی واسیوں کی سنتالی زبان کے بولنے والے کشمیری، آسامی اور اڑیہ سے زیادہ ہیں لیکن اسے دستور میں جگہ نہیں دی گئی۔ سو سال سے یہ رومن میں لکھی جاتی ہے لیکن حکومتِ بہار نے حکم دیا ہے کہ ناگری میں لکھی جائے۔“

اینتھونی نے اندیشہ ظاہر[3] کیا ہے کہ ابھی ہندی اینگلو انڈینوں، مسلمانوں، سکھوں اور آدی واسیوں کی زبانوں (انگریزی، اُردو، پنجابی اور سنتالی) کے خلاف ہے۔ جب اس میں توانائی آجائے گی تو دوسروں کی زبان کے بھی خلاف ہو جائے گی۔

۱۹۵۶ء میں لسانی صوبے بنائے گئے۔ لیکن مراٹھی، گجراتی اور پنجابی کو علیحدہ صوبے نہیں دیے گئے۔ ان زبانوں نے لڑ بھڑ کر بڑی مشکل سے اپنے صوبے حاصل کیے۔ لسانی صوبے اس لیے بنائے گئے کہ ان میں دفتری کام اور تعلیم اپنی علاقائی زبان میں ہو سکے۔ اس سے لسانی اقلیتوں کا مسئلہ سامنے آگیا۔ صوبائی تنظیم کمیشن[4] نے طے کیا کہ اگر کسی ریاست میں ۳۰ فی صدی یا اس سے زیادہ دوسری زبان کے بولنے والے ہوں گے تو وہ لسانی ریاست قرار دی جائے گی۔ نیز یہ کہ

---

۱ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۲۸۷

۲ ایضاً ص ۲۷۹

۳ سرکاری زبان پر پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ (انگریزی میں) ص ۹۴

۴ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۵۴

اگر کسی ضلعے میں ستر فی صدی یا اس سے زیادہ اشخاص ریاستی زبان سے مختلف زبان کے بولتے ہوں گے تو ان کی زبان کو ضلع کی سرکاری زبان مانا جائے گا۔

یوپی میں اُردو بولنے والے محض دس فی صدی ہیں اس لیے حکومت اور ہندی والے اُردو کو وہاں کی ثانوی زبان ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ ملک میں کوئی بھی ایسا ضلع نہیں جہاں کی ستر فی صدی آبادی اُردو بولنے والی ہو۔ اس طرح اُردو کی حد تک یہ سفارشیں بے سود ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ کے بعد دستور میں ایک نئی دفعہ 350A شامل کی گئی جس میں ہر ریاست اور میونسپلٹی وغیرہ کو ہدایت دی گئی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ اُردو کے معاملے میں اس پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے

زبان کا مسئلہ واشگاف ہو کر دو میدانوں میں سامنے آتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی زبان اور سرکاری دفتروں کی زبان۔ سرکاری زبان کمیشن نے جو ہندی کے شیدائیوں سے لبریز تھا ہندی اور علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش کی لیکن ساتھ ہی انگریزی کی اہمیت کا انکشاف یوں کیا

"ہمارے[1] ذہن میں یہ بات صاف ہے کہ جب ہماری یونیورسٹیوں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہے گی تب بھی ایک عرصۂ دراز تک ہمارے لیے ضروری ہو گا کہ یونیورسٹیوں سے نکلنے والے گریجویٹ بالخصوص سائنس کے مضامین والے انگریزی پر عبور لے کر نکلیں تاکہ ان کی رسائی علم کے اس مخزن تک ہو سکے جو ابھی ہندوستانی زبانوں میں میسر نہیں۔ ہمیں اس پر خاص دھیان رکھنا چاہیے کہ تعلیمی معیار گرنے نہ پائے۔"

"یونیورسٹی[2] گریجویٹ کو انگریزی کی اچھی معلومات لے کر نکلنا ہے تو سیکنڈری اسکول اسٹیج میں اچھی انگریزی سیکھ کر یونیورسٹی میں آئے۔"

آزادی کے بعد اٹھارہ سالوں میں تعلیم کا معیار یقیناً گرا ہے اور اس کی وجہ خاص ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں تعلیم دینا ہے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم رکھنے پر یہ ایک بجا اعتراض تھا کہ ہمارے دس بارہ برس انگریزی سیکھنے میں صرف ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہم دوسرے

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۵۴

[2] ایضاً ص ۷۹

مضامین کو خاطر خواہ وقت نہیں دے سکتے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ہٹا دیا گیا لیکن انگریزی زبان بی۔اے تک پہلے کی طرح لازمی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کو انگریزی نہیں آتی۔ بی۔اے کا طالب علم انگریزی میں کلاس لکچر نہیں سمجھ سکتا۔ انگریزی کی کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔ کم از کم ہندی علاقوں کا تو یہی حال ہے۔ لسانیات کے موسم گرما اسکولوں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کے گروہ میں ہندی والے طلبہ علمی حیثیت سے سب سے پچھڑے ہوئے ہوتے ہیں جب کہ اہل دکن، مہاراشٹری اور بنگالی ان سے کہیں آگے ہوتے ہیں۔ یہ فرق صرف انگریزی کی بدولت ہے۔

ہماری لائبریری کی زبان انگریزی ہے۔ ہندی میں اعلیٰ درجے کی کتابیں میسّر نہیں، کچھ گھٹیا سے بازاری ترجمے ہیں جنھیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیا جاتا ہے۔ یہی حال دوسری علاقائی زبانوں کا ہے اس لیے معیار گرتا جا رہا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ جب تک علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے گا ان میں اچھی کتابیں وجود میں نہیں آئیں گی۔ دس پندرہ سال کے عرصے میں ان کتابوں کا کسی قدر ذخیرہ بن سکے گا۔ ریاستی حکومتیں اپنی اپنی زبان پر توجہ دے رہی ہیں اور اس مقصد کے لیے مرکز کی معتد بہ امداد حاصل ہے۔ اُردو میں کتابیں تیار کرانے کا کام مرکزی وزارتِ تعلیم نے اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ چوں کہ علاقائی زبانوں میں اچھی کتابیں تیار کرانے میں دس پندرہ سال لگیں گے اس لیے اس دور میں نکلنے والے طلبہ کا معیار پست ہوگا۔ کتنی بڑی قربانی دینی پڑ رہی ہے لیکن اس سے مفر نہیں۔

سائنس کے معاملے میں اور بھی مشکل ہے۔ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ نے سائنسی اصطلاحوں کا بورڈ آف سائنٹیفک ٹرمنالوجی مقرر کیا تھا۔ اس کی سفارش[1] یہ تھی۔

"بورڈ یونیورسٹی کمیشن اور سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی رائے سے متفق ہے کہ ہندی اور خاص ہندوستانی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں میں حتی الامکان بین الاقوامی سائنسی اور تکنکی اصطلاحیں استعمال کی جائیں۔ تکنکی لغات میں بین الاقوامی اصطلاحوں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی رقم کر دیا جائے۔"

۱۹۵۳ء میں پونا میں ہونے والی کل ہند زبان ترقیاتی کانفرنس نے اس فیصلے میں ترمیم کر کے

---

[1] سرکاریِ زبان کمیشن رپورٹ ص ۶۲

کہا کہ بین الاقوامی اصطلاحوں، فارمولوں اور سائنسی بیانات کو عام طور سے سنسکرت کی مدد سے ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اگر وہ مناسب طریقے پر ترجمہ نہ ہوسکیں تو انھیں برقرار رکھا جائے۔ سرکاری زبان کمیشن بھی ترجمے کے حق میں ہے۔ دہرہ دون میں اس وقت کے مرکزی نائب وزیر تعلیم بھگت درشن نے بتایا کہ ہم ۳ سے ۲۵ فی صدی تک بین الاقوامی اصطلاحیں لیتے ہیں۔ ۲۰ فی صدی ہندوستانی زبانوں کی چالو اصطلاحوں کو لیا گیا ہے اور ۵۰ فی صدی سنسکرت کی مدد سے ترجمہ کی جا رہی ہیں۔

مرکزی سائنسی اصطلاحات کمیشن نے ڈھائی تین لاکھ ہندی اصطلاحیں تیار کر دی ہیں۔ یہ انگریزی اصطلاحوں کے مقابلے میں بالکل ناقابلِ فہم ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی اُردو اصطلاحیں بھی اسی طرح ناقابلِ فہم تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء تک اُردو کے ذریعے دی ہوئی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری کو انڈین میڈیکل کونسل نے تسلیم نہیں کیا کیوں کہ وہ ان کی رو سے ساقط المعیار تھی۔ آج ہندی علاقے کے کسی سائنس، ڈاکٹری یا انجینئری کے پروفیسر سے پوچھیے وہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو کسی بھاؤ پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کے مطابق ۱۹۵۵ء سے ہم باہر سے ہر مہینے چھ سو سائنسی اور تکنکی ماہنامے اور ہر سال ۱۲ سے ۱۴ ہزار تک کتابیں منگاتے تھے۔ ان کا ہندی میں کہاں تک ترجمہ کیا جائے گا۔ یہ مترجموں کی قوم بن کر رہ جائیں گی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سائنس کی تعلیم کے لیے کتابیں اگر ہندی اور دوسری علاقائی زبانیں آسان صوتیاتی رسم الخط یعنی اصلاح شدہ رومن خط میں لکھی جائیں تو بآسانی بین الاقوامی اصطلاحیں برقرار رکھی جا سکتی ہیں۔ ہندی کے ساتھ تو وہ میل کھاتی نہیں۔

ڈاکٹر کوٹھاری کی صدارت والے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے بعد یہ طے پایا کہ ڈگری جماعتوں تک علاقائی زبانوں میں تعلیم ہو اور پوسٹ گریجویٹ جماعتوں میں انگریزی میں۔ اس میں بھی قباحت ہے۔ جس منزل پر بھی ذریعۂ تعلیم بدلا جائے گا وہیں مشکل اٹھ کھڑی ہوگی۔

دفتروں کا کام کاج اپنے علاقے کی زبانوں میں کیا جانا چاہیے۔ ہندی علاقے ہی کو لیجیے اگر ہندی میں بولنا انگریزی کی نسبت سہل ہے تو لکھنا بھی سہل ہونا چاہیے لیکن ہندی کون سی؟ اُردو اور انگریزی الفاظ سے دامن بچانے والی نہیں بلکہ اُردو اور انگریزی کے تمام مروجہ الفاظ کو برقرار رکھنے والی۔ زبان کا واحد مقصد ترسیل ہے۔ مشہور ماہرِ لسانیات یسپرسن نے کہا ہے

" وہ زبان بہترین ہے جو ہر منزل پر زیادہ سے زیادہ النسانوں کو زیادہ سے زیادہ

سہولت کے ساتھ سمجھ میں آسکے۔"

لیکن سرکاری سطح پر بجلی کو ودیوت، دودھ کو دُگدھ اور پولیس کو آرکشا کہا جا رہا ہے
سینٹرل ریلوے کے ہندی ٹائم ٹیبل میں تीन शायका वाले शयनयान ؛ کا عنوان ہے
اسے تو عام ہندی والے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ معلوم ہوا کہ یہ تین تختوں والے سونے کے ڈبے سے
مُراد ہے۔ بنیادی انگریزی کے ساڑھے آٹھ سو الفاظ میں صرف ۲۵۲ الفاظ اینگلو سیکسن اصل
کے ہیں۔ بقیہ نصف سے زیادہ دوسری زبانوں سے لیے گئے ہیں۔ ہندی کو بھی انگریزی
الفاظ سے نہ جھجکنا چاہیے۔

شکل ہندی کے وکیل کہتے ہیں کہ ہندی کو اس لیے سنسکرت زدہ ہونا چاہیے کہ جنوبی
ہند والے مشترک الفاظ کی بنا پر اسے سمجھ سکیں۔ لیکن شمالی ہند میں جہاں اسے دن رات استعمال
کیا جاتا ہے۔ اگر وہاں ہی کوئی نہ سمجھ سکا تو دکنیوں کے سمجھنے سے کیا تشفی ہوگی اور اب تو
یہ بھرم بھی جاتا رہا ہے۔ اہلِ دکن ہندی کے اس لیے خلاف ہیں کہ یہ شمالی ہند کے غلبے اور آریہ تہذیب
کی نشانی ہے اسی وجہ سے وہ اب سنسکرت سے بھی دور ہٹنے لگے ہیں۔ تامل علاقے میں ۶۴ء
میں سہ لسانی فارمولے کے تحت ۵۰ ہزار طلبہ نے ہندی لی، دو ہزار نے سنسکرت اور دو سو
نے تیلگو لیکن بعد میں تامل ناڈو نے سہ لسانی فارمولے اور ہندی تعلیم دونوں پر اعتراض کر دیا۔
ان کو یہ شکایت ہے کہ ہندی کے پردے میں ہم پر ویدک کلچر لادی جا رہی ہے۔ ہندی ساہتیہ
سمیلن کے سابق صدر کے ایم۔ منشی نے سرکاری زبان کمیشن کو دیے گئے میمورنڈم میں کہا ہے

What I wish to struggle in the fashion of putting culture at the service of politics, no matter what politics. Probably the most glaring illustration of the reactionary process is the incredible and tragic story of Hindi in the making. Only the most childish argument against the use of the spoken word-arguments which the most elementary text books on linguistics would refute are solemnly trotted out. How can any one be free if his language is tied ?

آج سے بہت پہلے گریرسن کو بھی ہندی کی سنسکرت زدگی کھٹکتی تھی۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"ہندی سنسکرت کے ہلاک سائے میں آ گئی ہے۔ ہندی کے پاس اپنا ذخیرۂ الفاظ اتنا وافر ہے کہ سنسکرت سے لیے جانے والے الفاظ بےضرورت اور ناقابلِ فہم ہیں۔"

"ایسا ذخیرۂ الفاظ ہونے کے باوجود سنسکرت الفاظ استعمال کرنا فیشن ہو گیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ لاکھوں آدمی انھیں سمجھ سکیں، بلکہ چند لوگوں پر مصنف کے علم کی دھاک بیٹھ سکے۔"

آئین کی دفعہ 344 (3) میں سرکاری زبان کمیشن سے کہا گیا ہے کہ ہندی کے روپ رنگ ور روز افزوں استعمال کے بارے میں سفارش کرتے ہوئے کمیشن ملک کی تہذیبی، صنعتی اور سائنسی ترقی کی طرف مناسب دھیان دے گا۔

صنعتی اور سائنسی ترقی کے لیے ایک خاص قسم کے ذہن اور مزاج کی ضرورت ہے۔ یہ روشن ذہن انگریزی کے لگاؤ سے پیدا ہو سکتا ہے، سنسکرت سے نہیں۔

ریاستوں کی حد تک زبان کا مسئلہ صاف ہے۔ گتھی پڑتی ہے مرکز میں آکر۔ مرکز کی زبان اگر ہندی ہوتی ہے تو ہندی والوں کو دوسروں کی نسبت یقیناً بہت بڑا فائدہ ہوگا لیکن پالیسی یہ کہی جاتی ہے کہ زبان کی تبدیلی اس طرح ہونی چاہیے کہ کسی کو خلافِ معمول فائدہ یا نقصان نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں۔ اہلِ ہندی نفع میں رہیں گے ہی۔ غیر ہندی والے چاہتے ہیں کہ

(۱) جب تک ہندی کافی ترقی نہ کرے اُسے انگریزی کی جگہ نہیں دینی چاہیے۔

(۲) جب تک غیر ہندی والے ہندی پر عبور نہ کریں اس وقت تک مرکز کا کام انگریزی میں چلتے رہنا چاہیے۔

جب دوسرے علاقوں میں ہندی کے خلاف تحریک چلائی گئی تو پنڈت نہرو نے یقین دہانی کی کہ جب تک تمام غیر ہندی علاقے آمادہ نہ ہوں گے، ہندی کو ملک کی واحد سرکاری زبان نہ

۱؎ لسانی جائزۂ ہند جلد ۹ ص ۵۵

بنایا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی چھوٹی سی ریاست مثلاً ناگالینڈ بھی آمادہ نہ ہو تو ہندی کو غیر معینہ عرصے کے لیے ٹالا جا سکتا ہے۔

آئین میں کہا گیا تھا کہ پندرہ سال بعد انگریزی کی جگہ ہندی مرکز کی زبان ہو جائے گی ۱۹۶۵ء کے اوائل میں ہندی کو کاغذ پر انگریزی کے ساتھ مرکزی زبان کر دینے پر صوبۂ مدراس میں کتنی بڑی تحریک ہوئی۔ چند سال بعد حکومت ہند نے پارلیمنٹ میں لسانی پالیسی ریزولوشن رکھا جس میں ہندی کو مرکز کی اصلی زبان اور انگریزی کو اس کی ہمراہ زبان قرار دیا۔ اس پر شمال و جنوب دونوں میں بڑی ہل چل ہوئی۔ اہلِ ہندی کو شکایت تھی کہ انگریزی کو کیوں برقرار رکھا گیا ہے۔ لکھنؤ، دلّی، اندور وغیرہ میں طلبہ نے قیامت مچا دی: دکانوں اور مکانوں کے انگریزی سائن بورڈ اور موٹروں کی انگریزی نمبر پلیٹیں توڑ پھوڑ دیں۔ ریل کے ڈبے اور ڈاکخانے جلا دیے۔ دکن والوں پر اس کا ردّ عمل اس سے بھی شدید ہوا۔ وہ چراغ پا ہوئے کہ جب تک غیر ہندی علاقے رضامند نہ ہوں مرکز میں ہندی کو ذرا سا بھی بار کیوں دیا جائے۔ اگر شمال میں ریل کے ڈبے جلائے گئے تھے تو حیدرآباد میں پوری مسافر گاڑی جلا دی گئی۔ اس طرح حکومت چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پسی جا رہی ہے اور معاملہ تعطل میں پڑ گیا ہے۔

فی الحال مرکز کی زبان کے مسئلے کا حل یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ انگریزی اور ہندی بیک وقت مرکز میں استعمال ہوں۔ اس دو زبانیت کے کیا معنی ہیں؟ کیا سارا کام دو زبانوں میں ہوگا یا سرکاری ملازم کو اختیار ہوگا کہ وہ کوئی سی زبان استعمال کرے۔ گزٹ، قانون، اعلان، رپورٹیں وغیرہ تو دو زبانوں میں ہو سکتی ہیں لیکن دفتر میں فائل پر ایک ہی زبان میں لکھا جائے گا۔ کیا ہر ملازم کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنا نوٹنگ حسبِ منشا انگریزی یا ہندی میں کر سکے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر ملازم انگریزی اور ہندی دونوں میں ماہر ہو۔ اگر یہی ہونا ہے تو انگریزی اور ہندی میں سے ایک زبان کا علم اور استعمال خواہ مخواہ کا اضافہ ہی ہوا۔

ریاستوں سے کس زبان میں مراسلت ہوگی؟ ہندی، مراٹھی، گجراتی کی ریاستوں سے ہندی میں اور بقیہ سے انگریزی میں۔ لیکن مرکز کے ہر محکمے کو ریاستوں سے مراسلت کرنی پڑتی ہے اس کے معنی بھی یہی ہوئے کہ ہر مرکزی ملازم کو انگریزی اور ہندی دونوں جاننی ہوں گی لیکن گارنٹی تو یہ دی جاتی ہے کہ کسی کو ہندی نہ جاننے کی وجہ سے ملازمت سے محروم نہ کیا جائے گا۔ اگر محض انگریزی مرکزی ملازمت کے لیے کافی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مرکز کا کام محض انگریزی میں ہوگا، دونوں زبانوں میں نہیں۔ ہندی کا استعمال صرف ہندی ریاستوں سے مراسلت کے

لیے ہوگا۔ اس میں بھی مشکل ہے۔

مثال کے لیے ایک منصوبہ بندی کمیشن کو لیجیے۔ اسے ریاستوں سے بہت سابقہ پڑتا ہے۔ یا تو اس کے ہر ملازم کو ہندی بھی جاننی چاہیے یا ہندی ریاستوں کے متعلقہ دفتروں میں مرکز سے انگریزی میں کاغذات جائیں اور ریاست سے انگریزی ہی میں جواب اور رپورٹیں بھیجی جائیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ مرکز سے انگریزی میں کوئی رپورٹ آتی ہے تو صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں اسے چاک کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مرکزی دفتروں کی زبان انگریزی رہے گی دوزبانوں کی بات خود فریبی ہے۔

ایک اہم مسئلہ ہے مرکزی ملازمتوں کے ذریعہ امتحان کا۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کیوں کہ اس کا تعلق نہ صرف روٹی سے ہے بلکہ اقتدار سے بھی۔ ظاہراً انگریزی کی جگہ ہندی کو دینے کے لیے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے لیکن اس طرح ہندی والوں کو بے جا سہولت مل جائے گی۔ بارکر یہ تجویز کیا گیا کہ سب زبانوں کو ذریعہ امتحان بنا دیا جائے۔ آج یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شگوفہ اہل رکن نے چھوڑا ہے لیکن دراصل بحث میں آگ لگانے والی جماعت کانگریس ورکنگ کمیٹی ہے۔ ۱۴ر ۱۵ر اپریل ۱۹۵۴ء کو ورکنگ کمیٹی[1] نے طے کیا کہ یہ امتحان ہندی، انگریزی اور دوسری خاص خاص زبانوں میں ہوں گے۔

یہاں سے اشارہ پاکر مدراس قانون ساز کونسل نے ستمبر ۱۹۵۵ء میں قرارداد منظور کی "یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں انصاف برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ دستور میں درج کی ہوئی تمام زبانوں میں امتحان ہوں اور ہر زبان کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اسامیوں کی تعداد (کوٹا) مقرر کردی جائے۔"

چوں کہ ۱۴ (اب سندھی سمیت ۱۵) مختلف زبانوں میں لکھے ہوئے پرچوں کو ایک معیار سے پرکھنے کا کوئی طریقہ نہیں اس لیے یہ ضروری ہوا کہ زبان وار یا ریاست وار حصہ مقرر کردیا جائے۔ اندازہ یہ ہے کہ ملازمتوں میں حصہ مقرر کردینے کے بعد فوج میں بھی کوٹا کی بات کی جاسکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے حصے بخرے ہو جائیں گے۔ حکومت نے دو تین سال پہلے یہ

---

[1] M. P. Desai : Our Language Problem از ایم. پی. دیسائی ص ۱۰۹

[2] مرکزی سرکاری زبان کمیشن کی رپورٹ ص ۲۶۲

اعلان کر دیا ہے کہ یہ امتحانات تمام زبانوں میں ہوں گے لیکن سب کا یکساں معیار رکھنے کا مسئلہ اتنا ٹیڑھا ہے کہ سال بہ سال اس پر عمل درآمد ملتوی ہوتا جارہا ہے۔ کوتاکی اب کوئی بات نہیں کرتا لیکن مختلف زبانوں میں امتحان کا نتیجہ آنے دیجیے۔ پھر واویلا و غوغا مچے گا۔ ظاہر ہے کہ تامل میں لکھی کاپیوں کو تامل بولنے والا ممتحن دیکھے گا اور کشمیری میں لکھی کاپیوں کو کشمیری۔ یہ اپنی علاقائی قومیت کے زیر اثر اپنے ہم زبانوں کو اتنے نمبر دیں گے کہ اگر ہو سکے تو اس سال کی تمام کی خالی اسامیوں پر انہیں کے ہم زبان قبضہ کر لیں۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ مختلف ہائی کورٹوں کا کام بھی علاقائی زبانوں میں ہوگا۔ یوپی ہائی کورٹ کو قانونی طور پر ہندی میں کام کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن ابھی عملاً ایسا نہیں ہوا۔ اگر ہائی کورٹوں کا کام بھی مقامی زبانوں میں ہونے لگا تو ہمارے نیشنل یعنی نظام عدل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

یہ علاقائیت ملک کو پاش پاش کر کے چھوڑے گی۔ پندرہ بیس سال بعد ہندوستان کا کیا نقشہ ہو جائے گا۔ ہر ریاست کی درسگاہوں، دفتروں، عدالتوں میں علاقائی زبان میں کام ہوگا۔ ملک بارہ تیرہ آب خانوں میں بٹ جائے گا۔ مینارِ بابل کی طرح ایک کی بات دوسرا نہ سمجھے گا۔ ابھی یہ حال ہے کہ گرانڈ ٹرنک روڈ پر پنجاب سے گزر جائیے۔ بعض قصبوں کے بیچ سے سڑک گزرتی ہے، ہر جگہ گرمکھی میں نام لکھے ہوتے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ کون سا قصبہ ہے۔ میل کے پتھروں پر مقامی زبان میں لکھا ہوتا ہے جو باہر والے کے لیے ناقابلِ فہم رہتا ہے۔ علاقائی زبانوں میں تعلیم کا رواج ہونے کے بعد ایک ریاست سے دوسری ریاست میں پروفیسر یا ریسرچ اسکالر نہ جا سکیں گے۔ ہر شخص کی تعلیم، تصنیف اور تحقیق اپنی زبان کی حدود میں بند ہو کر رہ جائے گی۔ ملک گیر اخبار ختم ہو جائیں گے۔ وکیل بحث کے دوران دوسرے ہائی کورٹوں کے فیصلوں کی نظیر پیش نہ کر سکیں گے۔ ابھی ایک قاعدہ ہے کہ ہر ریاست میں آئی۔ اے۔ ایس۔ افسروں اور ہائی کورٹ ججوں کی ایک مقررہ تعداد باہر کی ریاستوں سے لی جاتی ہے۔ دس پندرہ سال بعد یہ کیونکر ممکن ہوگا۔

ملک کی وحدت اور سالمیت کے لیے ضروری ہے کہ ایک منسلک کرنے والی زبان (Link Language) ہو۔ دوسری زبان والوں کو اس مشترک زبان کا معمولی

کام چلاؤ علم کافی نہیں بلکہ اس پر اتنا عبور ضروری ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات ادا کر سکیں۔ ابھی ایسی زبان انگریزی ہے۔ بعد میں ہندی کو اس کی جگہ لینی چاہیے۔ انگریزی ابدالآباد تک تو ہندوستان کی مشترک زبان رہ نہیں سکتی۔ ہندی کے لیے ملک کے بہت سے حصے تیار ہیں۔

۱۹۶۵ء میں ہندی کے برائے نام مرکزی زبان کر دینے پر تامل علاقے میں کتنا شدید ردِ عمل ہوا۔ کئی سال پہلے آسام میں بنگالیوں کے خلاف بڑا فساد ہوا تھا۔ تامل علاقے میں سات جوانوں نے ہندی بیزاری ظاہر کرنے کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دی۔ پولیس کی گولیوں سے مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہمیں خودکشی کرنے والوں سے ہمدردی ہے لیکن ہم اس لسانی جنون کی تائید نہیں کر سکتے۔ مدراسیوں کی دیکھا دیکھی کیرالا، میسور، آندھرا، بنگال اور آسام سب نے واضح کر دیا کہ وہ عرصے تک انگریزی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

تامل ناڈ میں ہندی کی اتنی مخالفت ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت کبھی بھی ہندی کو لازمی نہیں کیا جا سکا۔ اب تو تامل ناڈ سہ لسانی فارمولے ہی کو نہیں مانتا۔ ہمیں شکر کرنا چاہیے کہ غیر ہندی علاقوں کے لوگ تامل یا بنگالی کو ہندی کے ساتھ مرکز کی زبان بنانے کی مانگ نہیں کر رہے۔ صرف انگریزی کا چلن ہی چاہتے ہیں۔ انگریزی ہمیں بھی درکار ہے۔ ملک کی سالمیت کے لیے یہ کتنی تھوڑی قیمت ہے۔ جو اہل ہندی اس مطالبے کو نہ مان کر جوابی کارروائی کرتے ہیں وہ ہندی کو کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کیا وہ بھول گئے کہ تقریباً چوتھائی صدی پہلے مذہب کے نام پر ملک تقسیم ہوا تھا۔ ایسی نوبت نہ آنی چاہیے کہ کوئی زبان کے نام پر یہی مطالبہ کرے۔ دراوڑ منیتر کڑاگم نے یہ مطالبہ تو کر دیا ہے کہ آئین میں سے سرکاری زبان سے متعلق فصل ہی نکال دی جائے تاکہ مرکز میں ہندی کی جڑ ہی کٹ جائے۔ ہندی کے شاعر اور سرکاری زبان کمیشن کے ممبر رام دھاری سنگھ دنکر[1] نے کیا خوب کہا تھا۔

" جمہوری نظام میں عموماً اکثریت حکومت کرتی ہے لیکن زبان، مذہب

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۲۹۵

اور کلچر جیسے بنیادی سوالوں پر اکثریت نہ صرف اقلیتوں سے سمجھوتہ کرتی ہے
بلکہ ان کو اپنی ترقی کا پورا موقع دیتی ہے "

پڑھنا ہو یا دفتروں میں کام کرنا، مادری زبان میں سہل ترین ہوتا ہے ۔ اس اصول کا تقاضہ ہے کہ ہر لسانی ریاست میں تدریس اور نظم ونسق علاقائی زبان میں ہونے چاہئیں۔ دوسری طرف قوم کی وحدت اور سالمیت کی مانگ ہے کہ سب ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں، رہ سکیں، روزگار کر سکیں۔ مادری زبان اور قومی وحدت کے متضاد تقاضوں نے ایسی گتھی پیدا کر دی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی ۔ کیا ہم ایک قوم ہیں ؟

مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال

نوٹ۔ اس لیکھ کی زبان ہندوستانی ہے جسے ہر ہندی والا پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس میں باپو کے سارے بول انجمن ترقیِ اُردو ہند کی کتاب مشترکہ زبان کے پہلے ایڈیشن سے لیے گئے ہیں۔

ہمارے نیتاؤں میں صرف مہاتما گاندھی ایسے تھے جنھوں نے زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی گتھی بھاشا کی ہے اور اس پر باپو نے بار بار بڑے خوب صورت ڈھنگ سے اپنے وچار ظاہر کیے ہیں۔ اگر ہم نے ان پر دھیان نہیں دیا تو گھاٹا ہمارا ہوا مہاتما جی جنتا کے آدمی تھے، جنتا کی نبض پر ہاتھ رکھتے تھے اس لیے وہ اسی بھاشا کو قومی بھاشا مانتے تھے جو جنتا بول چال (روز) کے کام میں لاتی ہو۔ بھاشا کے سائنس کے لحاظ سے بھی بھاشا کا بول چال کا روپ ہی اصلی روپ ہے۔ لکھاوٹی روپ جھوٹا اور نقلی ہے۔ بھاشا کے سوال پر مہاتما جی کا سب سے پرانا لیکھ ۱۹۰۹ء کے ہند سوراج میں ملتا ہے۔

"سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اُردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لیے بہت سے ہندوستانیوں کے لیے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم آپس کے بیوہار میں سے انگریزی کو نکال کر باہر کرسکیں گے۔"

کئی سال بعد انھوں نے ہندی کی یہ تعریف پھر دُہرائی۔

"ہندی بھاشا میں اسے کہتا ہوں جسے اُتر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا اُردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔"

جو اُردو اور ہندی کو دو الگ بھاشائیں کہتے ہیں ان کے لیے مہاتما جی کا جواب یہ تھا کہ اتری بھارت میں مسلمان اور ہندو دونوں ایک ہی بھاشا بولتے ہیں۔ فرق صرف پڑھے لکھوں نے پیدا

کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں مہاتما جی پہلی بار ہندی ساہتیہ سمیلن کے سبھاپتی ہوئی۔ اپنے بھاشن میں آپ نے پھر ہندی کی وہی تعریف کی۔ ۱۹۳۵ء میں آپ دوسری بار سمیلن کے سبھاپتی ہوئے اور اس بار سمیلن سے ہندی کی اپنی تعریف منوالی۔

آپ نے اپنے لیکھوں اور بولوں میں نہ صرف اُردو اور ہندی بلکہ ہندوستانی کو بھی ایک بھاشا مانا ہے۔

" ہندی، ہندوستانی اور اُردو شبد ایک ہی زبان کو ظاہر کرتے ہیں جسے اُتر بھارت میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے[1]۔"

" ہندی، ہندوستانی اور اُردو یہ تینوں شبد ایک ہی بھاشا کی طرف[2] اشارہ کرتے ہیں۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی مہاتما جی کے ایسے بول بھی بہت کافی ہیں جن میں اُردو اور ہندی اور ہندوستانی کو بھی الگ بھاشا کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر

" اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انھیں اُردو پڑھنی ہی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے[3]۔"

" ہندوستانی کو اصلی شکل دینے کے لیے ہندی اور اُردو کو اس کی پالنے والی بھاشائیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کانگریس کو ان دونوں کی طرف اچھے وچار رکھنے چاہئیں۔"

" کانگریس سے آزاد رہ کر ہندی اور اُردو برابر ترقی کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں میں اور اُردو مسلمانوں میں محدود رہے گی۔"

" ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو اس بات کا سپنا دیکھتے ہیں کہ یہاں خالی اُردو یا خالی ہندی ہی رہے گی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ناپاک سپنا ہے اور ہمیشہ سپنا ہی رہے[4] گا۔"

۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس میں بولتے ہوئے کہا

" ہندی اور اُردو دو ندیاں ہیں اور ہندوستانی ساگر ہے۔ ان دونوں میں سے ہمیں

---

[1] ہریجن سیوک ۳ر جولائی ۱۹۴۶ء

[2] ہریجن۔ ۵ر جولائی ۱۹۴۶ء

[3] نوجیون۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۲۷ء

[4] ہریجن سیوک ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

کسی سے نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں تو دونوں کو اپنانا ہے۔ ہندوستانی کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ وہ دونوں کو اپنا لے گی۔"

آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ یہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اگر بول چال کے روپ کو سامنے رکھیں تو اُردو، ہندی اور ہندوستانی ایک بھاشا ہیں۔ اگر ان کا لکھا ہوا روپ اور ساہتیہ دیکھیں تو اُردو اور ہندی الگ الگ زبانیں ہیں۔

اسی طرح ان کے لیکھوں میں ایک طرف بہت سے ایسے ٹکڑے مل جائیں گے جہاں انھوں نے زور دیا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی بھاشا نہیں مثلاً

"ہندی بولنے والے حصّوں میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کی مادری زبان ہندی ہی ہے اسی طرح ایسے ہزاروں ہندو ہیں جن کی ماتر بھاشا اُردو ہے۔"[1]

دوسری طرف کئی بار وہ اُردو بھاشا اور لپی کو مسلمانوں سے اور ہندی بھاشا اور دیوناگری کو ہندوؤں سے جوڑ دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر:

"اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انھیں اُردو پڑھنی ہی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔"[2]

یہ دونوں باتیں انمیل ہیں لیکن گہرائی میں جاکر دیکھا جائے تو دونوں اپنی اپنی جگہ سچ ہیں۔ اُردو پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان اور ہندی پڑھنے والے ہندو ہوتے ہیں لیکن سب مسلمانوں کی بھاشا اُردو ہی نہیں ہوتی اور کچھ ہندو ہندی نہ پڑھ کر اُردو پڑھتے ہیں۔

مہاتما جی سچ مچ ہندی اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے انھوں نے عام طور پر قومی زبان کو ہندوستانی کہنا شروع کیا۔ چناں چہ ان کے اشارے پر ۱۹۲۵ء میں کانپور کانگریس نے اپنے ودھان کی دفعہ ۳۳ یہ کردی کہ آئندہ سے کانگریس کی شاخوں اور ورکنگ کمیٹی کا کام ہندوستانی میں کیا جائے گا۔ جو بولنے والے ہندوستانی نہیں بول سکتے وہ انگریزی یا کسی صوبائی بھاشا کا استعمال کرسکتے ہیں۔

مہاتما جی نے بھاشا کی پوری اسکیم ۱۹۲۴ء کے ایک لیکھ میں یوں دی ہے۔

---

1. ہریجن سیوک ۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۶ء
2. نوجیون ۲۱ر جولائی ۱۹۲۴ء

"ایک خاص میعاد کے اندر ہر صوبے کی عدالتوں اور اسمبلیوں کا کام کاج اسی صوبے کی بھاشا میں جاری ہو جانا چاہیے۔ اپیل کی آخری عدالت کی زبان ہندوستانی قرار دی جائے لکھاوٹ چاہے دیوناگری ہو چاہے فارسی۔ مرکزی سرکار اور بڑی اسمبلیوں کی بھاشا بھی ہندوستانی ہی ہو انٹر راشٹری راج ویوہار کی زبان انگریزی رہے گی[1]"

مہاتما جی نے آدرش وادی کی طرح یہ سب لکھ دیا ہے۔ ان باتوں پر عمل کرنے میں جو مشکلیں ہیں ۱۹۲۴ء میں ان کا اندازہ مہاتما گاندھی کے لیے مشکل تھا۔ آج ہم سب کو معلوم ہے مثال کے طور پر ہائی کورٹوں کا کام صوبائی بھاشاؤں میں ہو اور سپریم کورٹ کا ہندوستانی میں تو قانون اور انصاف کے ڈھانچے کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر ہندوستانی میں یہ جان کہاں کہ وہ سپریم کورٹ پارلیمنٹ اور دلی سرکار کی بھاشا بن سکے۔ اس ذمہ داری کو اٹھاتے تو خالص ہندی یا خالص اردو کی نکلوانے لگتی ہیں۔ بہرحال ۱۹۲۴ء میں ایک موٹے اصول بلکہ آدرش کے روپ میں یہ مانگیں سراہنے کے لائق تھیں۔

ہندوستانی اور دکھنی ہندوالے۔ ہندی یا ہندوستانی کو قومی زبان بنانے سے اصل دقت دراوڑ صوبوں کے رہنے والوں کو ہوتی۔ ان سے مہاتما جی نے بار بار اپیل کی کہ باقی دیش واسیوں کی خاطر ہندی سیکھ لیں۔ لکھتے ہیں۔

"ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں صرف ۲ کروڑ ۸۰ لاکھ سے کچھ اوپر مدراسی لوگ ہندوستانی بولنے والوں کی بات تو سمجھ نہیں سکتے۔ اس علاقے کے ۲۸۰ لاکھ لوگوں کا دھرم کیا ہے کیا ان کے لیے ہندوستان انگریزی سیکھے یا پھر باقی ۲۷۷ لاکھ ہندوستانیوں کے لیے انھیں ہندوستانی سیکھنی چاہیے[2]"

بنگلور میں ۱۹۲۵ء میں ہندی پرچار سبھا کے کنووکیشن میں کہا۔

"بھارت کے بیس کروڑ آدمیوں سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کرناٹک کے ایک کروڑ دس لاکھ نرناریوں کو ان کی بھاشا ہندی سیکھنی چاہیے۔"

۵ رجولائی ۱۹۲۶ء کے ہریجن میں مہاتما جی نے پھر کرناٹک والوں سے اپیل کی کہ بیس کروڑ

---

[1] نوجیون ۲۶ دسمبر ۱۹۲۴ء

[2] ینگ انڈیا۔ ۱۲ رجنوری ۱۹۲۰ء

دیش بھائیوں کے ساتھ سمبندھ قائم کرنے کے لیے ہندی سیکھیں۔"

مہاتما جی کی ہندوستانی میں بڑی لچک تھی۔ وہ سنسکرت بھری ہندی اور عربی فارسی بھری اردو کے خلاف تھے لیکن یہ مانتے تھے کہ کبھی کبھی ہندوستانی میں سنسکرت یا عربی فارسی میں سے کسی ایک کا زور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دکھن والوں کے لیے ہندوستانی میں سنسکرت شبد ہونے ہی چاہئیں۔ لکھتے ہیں[1]

"اگر سنسکرت جاننے والے ہندو سنسکرت شبدوں کا ایک حد تک استعمال کرتے ہیں تو ان کا ایسا کرنا ضروری ہے۔ صرف عربی جاننے والے مسلمان بھی یہی کرتے ہیں۔ تامل یا تیلگو کی کسی چیز کا ترجمہ آپ ہندی یا ہندوستانی میں کریں اور اس میں سنسکرت شبد نہ آئیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا آنا قریب لازمی ہے کیوں کہ ان میں سنسکرت شبد بہت زیادہ ہیں۔ یہی حال عربی لفظوں کا ہے۔ عربی کی کسی چیز کا ترجمہ اگر ہم ہندی یا ہندوستانی میں کرنے بیٹھیں تو اس میں عربی شبدوں کو آنے سے ہم روک نہیں سکتے۔"

مہاتما جی نے ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ چوں کہ دکھن کی بھاشاؤں اور بنگالی میں سنسکرت شبد زیادہ ہیں اس لیے سنسکرت شبدوں سے بھری ہوئی ہندی ہی ان لوگوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ اسی طرح جیسے پنجاب والوں کی ہندوستانی میں عربی فارسی شبدوں کی ملاوٹ ہوگی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن مہاتما جی نے یہ غضب کیا کہ صوبائی بھاشاؤں والوں کو بار بار یہ صلاح دی کہ وہ اپنی بھاشا دیوناگری میں لکھنے لگیں۔ ۱۹۳۵ء میں بنگلور کے ہندی پرچار کنووکیشن میں مہاتما جی نے کرناٹک والوں پر زور دیا کہ وہ ہندی سیکھ لیں۔ اس پر وہاں کے ایک شخص نے بگڑ کر لکھا۔

> "تامل والا تامل کی جگہ انگریزی میں سوچتا ہے۔ آپ کی یوجنا کے بعد وہ ہندی میں سوچنے لگے گا۔ اس طرح اس نیتی کا صاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اور سا ری بھاشائیں مٹ جائیں اور صرف ہندی رہ جائے وہ بھی دونوں لکھاوٹوں میں کیونکہ سب بھاشاؤں کی لکھاوٹ تو دیوناگری ہی ہو جائے گی۔"

---

[1] ہریجن سیوک ۲۳ر جون ۱۹۳۶ء

اس پر مہاتما جی نے جواب[1] دیا۔

" اگر پورا راشٹر اپنی بھاشا کے سوا ایک کل بھارتی بھاشا جان لے تو کیا حرج ہے۔ یہ بھاشا ہندی یعنی ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ رہا ماتری بھاشا کا سوال تو آپ مجھے غلط سمجھے میں ماتری بھاشا کو پہلی جگہ دیتا ہوں۔ ہاں لپی کے بارے میں مجھے اپنی رائے پر پچھتاوا نہیں ہے۔ جو الگ الگ بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں یا جن کے ساتھ اس کا گہرا رشتہ رہا ہے پر جُدا جُدا لکھاوٹوں میں لکھی جاتی ہیں ان کی ایک ہی لپی ہونی چاہیے اور وہ لکھاوٹ دیوناگری ہی ہے۔"

اس کے بعد بھی مہاتما جی صوبائی بھاشاؤں کے لیے دیوناگری کی وکالت کرتے رہے، لکھتے ہیں[2]

"اس میں شک نہیں کہ دیوناگری لکھاوٹ کا ایک آندولن چل رہا ہے جس کا ساتھ میں دل سے دے رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں خاص کر جن صوبوں میں سنسکرت شبدوں کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے بولی جانے والی تمام بھاشاؤں کے لیے دیوناگری لکھاوٹ کو مان لیا جائے۔

" رومن لکھاوٹ نہ تو ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے۔ یہ برابری تو فارسی اور دیوناگری کے بیچ ہی ہو سکتی ہے اور اس کی بنیادی خوبیوں کو الگ رکھ دیں تو بھی دیوناگری ہی سارے ہندوستان کی سب کو منظور لکھاوٹ ہونی چاہیے کیوں کہ مختلف صوبوں میں چالو زیادہ تر لکھاوٹیں بنیادی طور سے دیوناگری ہی سے نکلی ہیں۔ . . . لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر یا دوسرے ایسے لوگوں پر جو اس سے انجان ہیں اسے زبردستی لادنے کی ہمیں کسی طرح کی کوئی خواہش نہیں کرنی چاہیے[3]۔"

مہاتما جی کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمام صوبائی بھاشائیں تو دیوناگری میں لکھی جائیں لیکن خود ہندی، دیوناگری اور اردو دونوں میں لکھی جائے۔ ایسا کچھ شبہ کسی اُتر بھارت والے کے دل میں اٹھا اور اس نے مہاتما جی سے کئی سوال کیے جن کا جواب ۲۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کے

---

[1] ہریجن ۱۵ر اگست ۱۹۳۶ء

[2] ہریجن سیوک ۲۰ر جون ۱۹۳۶ء

[3] ایضاً ۲ر جولائی ۱۹۳۷ء

ہریجن سیوک میں ملتا ہے۔سوال کرنے والے نے کہا تھا کہ
"اگر آپ ہندو مسلم ایکتا کے لیے اُردو سیکھنے کو کہتے ہیں تو بنگال، مہاراشٹر، گجرات، دکھنی بھارت وغیرہ کے مسلمان تو اُردو نہیں جانتے، صوبائی بھاشائیں بولتے ہیں۔اتر بھارت کی تمام بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں اور دکھنی بھارت کی بھاشاؤں میں سنسکرت شبد آگئے ہیں پھر ان میں عربی فارسی جیسی اجنبی زبانوں کے شبدوں کا پرچار کیوں کیا جائے؟"
دوسرا سوال لپی کے بارے میں تھا کہ زیادہ تر صوبوں کی لپیاں دیوناگری سے نکلی ہیں۔ صرف پنجاب اور سندھ والے ناگری کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ باقی لوگوں سے اُردو لپی سیکھنے کو کیوں کہا جاتا ہے۔
مہاتما جی نے جواب دیا آپ کی بات میں بہت سچائی ہے لیکن ہندو مسلم ایکتا کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔اگر دوسرے صوبوں والے دیش پریم کے ساتھ ایک اور لپی اُردو سیکھ لیں تو ان کا فائدہ ہی ہے۔
مہاتما جی اور انگریزی: آگے بڑھنے سے پہلے ہم انگریزی کے لیے مہاتما جی کے وچار جانتے چلیں۔وہ ۱۹۰۹ء سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ہمیں انگریزی کو نکال باہر کرنا ہے۔ ودیشی بھاشا ہمیں آزادی نہیں دلا سکتی لیکن انگریزی کی کوئی جگہ ہونی چاہیے یا نہیں۔اس کی طرف بھی انھوں نے اشارہ کیا ہے۔اندور میں ۱۹۱۸ء میں کہا۔
"یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ میں انگریزی بھاشا سے نفرت نہیں کرتا ہوں۔انگریزی ساہتیہ بھنڈار ہے۔میں نے بھی بہت سے رتنوں کا استعمال کیا ہے۔انگریزی بھاشا کے ذریعے ہم کو سائنس وغیرہ کی خوب جانکاری حاصل کرنی ہے۔اس لیے انگریزی کی جانکاری بھارت واسیوں کے لیے ضروری ہے لیکن اس بھاشا کو اس کی ٹھیک ٹھیک جگہ دینا ایک بات ہے اس کی پوجا کرنا دوسری بات ہے۔"
۱۹۴۲ء میں بھاشا سے متعلق مہاتما جی نے اپنی پوری اسکیم مکمل کر بیان کی۔اس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔اس میں انگریزی کو صرف دوسرے ملکوں سے کام کاج کے لیے باقی رکھا ہے ملک کے اندر کوئی جگہ نہیں دی۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں جھریا میں کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کی طرف سے مہاتما جی کو انگریزی میں ایک ایڈریس دیا گیا۔ آپ نے اسے سننے سے انکار کر دیا اور اسے پڑھے بغیر ہی پڑھا ہوا مان لیا گیا۔ ۲۰ر جنوری ۱۹۲۷ء کو نوجیون میں

مہاتما جی نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ آئندہ کسی سبھا کی کارروائی کسی ایسی بھاشا میں ہو جسے زیادہ لوگ نہ جانتے ہوں تو اچھا ہوگا کہ وہ لوگ اس سبھا سے اٹھ کر چل دیں ۔ ظاہر ہے کہ باپو کا اشارہ انگریزی کی طرف تھا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما جی پڑھے لکھوں کے لیے انگریزی جاننا ضروری نہ سمجھتے تھے ۔ صرف کچھ لوگ انگریزی پڑھ لیں اسے کافی مانتے تھے ۔ ہریجن میں لکھتے ہیں۔

"میں نے بار بار یہ سمجھایا ہے کہ ہماری ترقی میں انگریزی کی ایک مقرر جگہ ہے ۔ ہمارے راجیوں کی اور ساری پچھمی دنیا کی بات سمجھنے کے لیے اور پچھم کی اچھی سے اچھی باتیں ہندوستانی کو سکھانے کے لیے ہمارے کچھ آدمیوں کو انگریزی ضرور سیکھنی چاہیے ۔ کیوں کہ پچھمی بھاشاؤں میں اس کا سب سے زیادہ پرچار ہے ۔"

اس لیکھ میں انگریزی کو راجیوں کی باتیں سمجھنے کا ذریعہ بھی قرار دیا گیا ہے ۔ راجیوں سے مطلب صوبے ہی ہو سکتے ہیں ۔ صرف اس لیکھ کے سوا اور کہیں یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ مہاتما جی نے صوبوں کے بیچ میل جول کے لیے انگریزی کو ضروری سمجھا ہو ۔ سچ یہ ہے کہ مہاتما جی انگریزی کو دیس کی ترقی کے راستے میں روڑا سمجھتے تھے ۔ ایک جگہ انگریزی سیکھنے کو وقت برباد کرنا کہہ گئے ہیں ۔

"انگریزی زبان نے ہم پر جو جادو کر ڈالا ہے اس کے اثر سے ہم ابھی تک چھوٹے نہیں ہیں ۔ اس جادو کے جال میں پھنس کر ہم لوگ ہندوستان کو اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں ۔ جتنے سال ہم انگریزی سیکھنے میں برباد کرتے ہیں اگر اتنے مہینے بھی ہم ہندوستانی سیکھنے کی تکلیف نہ اٹھائیں تو سچ مچ ہی کہنا ہوگا کہ ہم عام لوگوں کی طرف اپنے پریم کی جو ڈینگیں ہانکا کرتے ہیں وہ نری ڈینگیں ہی ہیں ۔"

(رچناتمک کاریہ کرم)

آج تعلیم کے ماہر عام طور پر مانتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر پڑھے لکھے کو انگریزی ضرور پڑھنی چاہیے ۔

مہاتما جی اور اردو : مہاتما جی نے سب سے زیادہ حمایت اُردو کی کی لیکن دکھ کی بات ہے کہ ان کی سب سے زیادہ مخالفت اُردو والوں نے ہی کی ۔ یہ ایک سچائی ہے کہ آزادی سے

؎ ہریجن ۱۵ راگست ۱۹۳۵ء

پہلے کی اُردو تحریک مسلم لیگ تحریک کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ مہاتما جی اُردو کے پریمی تھے لیکن اپنی کچھ گول مال باتوں سے انھوں نے اُردو والوں کے من میں شک پیدا کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن میں انھوں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد بنانے کا سجھاؤ دیا جس کا مقصد صوبائی بھاشاؤں اور ان کے ساہتیہ کاروں میں میل جول پیدا کرنا تھا۔ اس پریشد کی بیٹھک ۲۴ راپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں ہوئی۔ پہلے ہی جلسے میں یہ پرستاؤ رکھا گیا کہ اس سبھا کا کام 'ہندی ہندوستانی' میں ہوگا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے سخت اعتراض کیا کہ جب کانگریس نے 'ہندوستانی' کو ملک کی زبان طے کیا ہے تو یہ ہندی ہندوستانی کیا ہے۔ مہاتما جی نہ مانے۔ اسے بدل کر 'ہندی اتھوا ہندوستانی' کرنے پر تیار ہو گئے۔ مولوی عبدالحق نے تجویز کی کہ 'ہندی ہندوستانی' کی بجائے صرف 'ہندوستانی' یا پھر 'ہندی یا اردو' کر دیا جائے۔ ان کی بات نہ مانی گئی اور وہ پریشد چھوڑ کر چل دیے۔ اردو والوں میں مشہور ہے کہ اس موقع پر مہاتما جی نے کہا تھا۔

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"[1]

یقین نہیں آتا کہ مہاتما جی نے ایسا کہا ہوگا۔ اُردو اور مسلمانوں کا کوئی مخالف بھی اس سے زیادہ کیا کہتا۔ باپو اُردو کے پریمی تھے لیکن جنوری ۱۹۴۲ء میں کسی اُردو والے نے مہاتما جی کو چٹھی لکھی جس میں دوسری باتوں کے سوا یہ بھی لکھا تھا۔

"آپ تو اُردو کو کھلم کھلا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جانے والی مسلمانوں کی بھاشا کہہ چکے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو بھلے ہی اس کی حفاظت کریں۔"

مہاتما جی نے یہ چٹھی اور اس کا جواب ۸ رفروری ۱۹۴۲ء کے ہریجن سیوک میں چھاپا ہے جہاں انھوں نے چٹھی کی دوسری غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ اوپر دی ہوئی بات کا کاٹ نہیں کیا، اس سے انکار نہیں کیا۔ ۸ رجنوری ۱۹۶۰ء کے 'ہماری زبان' میں اس کے ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور نے ایک ایڈیٹوریل لکھا 'کیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے'۔ اس میں اوپر لکھی ہوئی بات کو سچ مچ مہاتما گاندھی کی رائے سمجھ کر لکھا۔

"اُردو ہندو مسلم اتحاد کی یادگار اور ہماری مشترک قومی تہذیب کی نشانی ہے۔ اس کی اسں

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ص ۲۰

حیثیت کو لاکھ کچھ لوگ فراموش کریں یہ حیثیت برقرار رہے گی چاہے بقول گاندھی جی کے قرآن کے حروف میں لکھی جائے، چاہے مسلمانوں کا بیشتر مذہبی اور تہذیبی سرمایہ اس میں موجود ہو ہندوستان کے بیشتر مذاہب کے ماننے والوں کی زبان رہی ہے اور ہے۔"

اس پر مشہور گاندھی وادی ڈاکٹر جعفر حسین نے ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ء کے 'ہماری زبان' میں ایڈیٹر کو چٹھی لکھی جس میں اس بات کو لے کر اپنی اور باپو کی پوری چٹھی پتری دی ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسین صاحب کہتے ہیں کہ ہمیشہ یہ بات کھٹکتی تھی کہ مہاتما جی جیسی ہستی ایسی جاہلوں والی اور دل دکھانے والی بات کیسے کہہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر جعفر حسین نے ۱۵ ستمبر ۱۹۴۱ء کو مہاتما جی کو لکھ کر پوچھا کہ آپ کے نام سے یہ بول ان گنت بار نقل کیے جاتے ہیں۔ کیا آپ نے واقعی ایسا کہا تھا اور اب آپ کی کیا رائے ہے۔

مہاتما جی نے ۲۹ ستمبر ۱۹۴۱ء کو جواب دیا کہ میں نے وہ جملے کبھی نہیں کہے۔ تم وہ کوٹیشن بھیجو جس میں یہ بات مجھ سے جوڑی گئی ہے۔ میں نے تو خود اُردو سیکھی ہے اور مولانا شبلی کی سیرت النبی اور اُردو کی دوسری تحریریں پڑھی ہیں۔

ڈاکٹر جعفر حسین نے کچھ کوٹیشن بھیجے۔ اس کے بعد ایک بار جب ان کا مہاتما جی سے ملنا ہوا تو باپو کو بتایا کہ یہ بات آپ نے مولوی عبدالحق کے سامنے ناگپور میں کسی بھرے جلسے میں کہی تھی۔ اس وقت مہاتما جی نے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں ۳ اپریل ۱۹۴۲ء کو بردولی سے لکھا۔

> "میرا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میرے ریمارک اسی طرح کے ہو سکتے تھے جس طرح کا وہ ایڈریس تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مولانا صاحب کے اعتراض کو ٹھیک قرار دے۔"

اوپر دی ہوئی ساری چٹھی پتری ۲۲ اپریل ۱۹۶۰ء کے 'ہماری زبان' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد طے ہو جاتا ہے کہ مہاتما جی نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ مولوی عبدالحق کو یا تو سمجھنے میں بھول ہوئی یا انھیں غلط یاد رہ گیا۔

یہ جھوٹ سہی۔ لیکن 'ہندی ہندوستانی' کی بات اُردو والوں کے لیے ایسی ثابت ہوئی جیسے پاگل سانڈ کے لیے لال چیتھڑا۔ مولوی عبدالحق نے اُردو کے لیے ایک زبردست آندولن شروع کیا اور کہا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد اُردو کو ختم کرنے اور ہندی کو لادنے کی ایک زبردست سازش ہے۔

مہاتما جی نے ۱۶ مئی ۱۹۳۶ء کے 'ہریجن' میں 'ہندی ہندوستانی' نام کے لیکھ میں لکھا

کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد، ہندی ساہتیہ سمیلن کی پیدا وار ہے۔ ۲۵ برس کی پرانی سنستھا سے میں نام بدلنے کو کہوں تو یہ گستاخی ہوگی۔ اگر کسی کو ہندی نام سے چڑھ ہے تو اُسے جاننا چاہیے کہ 'ہندی' مسلمانوں کا دیا ہوا نام ہے۔

مہاتما جی نے ایک اور لیکھ میں اس بات پر دکھ ظاہر کیا کہ سمیلن نے ہندی کی تعریف میں اُردو لکھاوٹ کو ظاہر کرکے جو بڑا قدم اٹھایا ہے مسلمانوں نے اس کو نہیں سراہا۔

۱۹۳۷ء میں بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق میں ایک سمجھوتہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ اُردو ہندی کے قابل لوگ مل کر ایک ڈکشنری بنائیں۔ ہندی کے لیکھکوں نے جو اُردو شبد اور اُردو کے لیکھکوں نے جو ہندی شبد استعمال کیے ہیں وہ سب اس ڈکشنری میں جمع کیے جائیں اور یہ ہندوستانی بھاشا کا شبد بھنڈار مانا جائے گا۔ مہاتما جی نے اس سمجھوتے کو بہت سراہا لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا کام آگے نہ بڑھا۔ آخر کار ۱۹۳۸ء تک مہاتما جی کا پکا وچار ہوگیا کہ راشٹر بھاشا کا نام صرف ہندوستانی ہو۔ انھوں نے کانگریسیوں کو رائے دی کہ راشٹر بھاشا کا ذکر کرتے وقت وہ اُردو یا ہندی نہ کہہ کر ہندوستانی ہی کہا کریں۔ عجیب بات ہے ۵ جولائی ۱۹۴۶ء کے ہریجن میں انھوں نے دکھن والوں کو 'ہندی ہندوستانی' سیکھنے کی رائے دی۔

۲ مئی ۱۹۴۲ء کو مہاتما جی نے واردھا میں ہندوستانی پرچار سبھا بنائی لیکن دو چار مہینے بعد ہی 'بھارت چھوڑو آندولن' کے سلسلے میں پکڑے گئے اور کام رک گیا۔ ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء میں یہ کام پھر سے چالو ہوا۔ مہاتما جی ڈاکٹر تارا چند کی یہ بات مانتے تھے کہ شروع میں اتری بھارت میں ایک بھاشا تھی جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے تھے۔ جو ایک تھی وہ دو ہوگئی۔ ہندوستانی پرچار سبھا کا کام ان دونوں کو پھر سے ایک بنانا ہے۔ ۲۷ فروری ۱۹۴۵ء کو آپ نے مولوی عبدالحق کو واردھا بلایا اور کہا۔

"عبدالحق صاحب نے ناگپور میں جو بات کہی تھی اسے اس وقت میں نہ سمجھ سکا: "ہندی یعنی اردو" اسے میں نے مانا نہیں تھا۔ اس وقت ان کی بات مان لیتا تو اچھا ہوتا ..... ناگپور میں بھارتی ساہتیہ سمیلن کیا تھا لیکن وہ وہیں شروع ہوا اور وہیں ختم ہوا۔ ہم لوگ ملنے آئے تھے اور پھر الگ الگ ہوگئے۔ ایسے سمیلن سے کیا فائدہ ہوسکتا تھا وہ ہندوستانی

لہ ہریجن سیوک ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۸ء

نہیں بلکہ بھارتی ساہتیہ سمیلن تھا۔"

ہمیں معلوم نہیں کہ ہندی ساہتیہ سمیلن نے ہندی کی اپنی تعریف بدل دی تھی یا کچھ اور بات تھی کہ مہاتما جی نے ساہتیہ سمیلن کی ممبری سے استعفیٰ دینے کی بات سوچی۔ سمیلن کے سبھاپتی پرشوتم داس ٹنڈن اور مہاتما جی کے بیچ چٹھی پتری ہوئی۔ ٹنڈن جی مہاتما جی کے بہت بڑے بھگت تھے لیکن انھوں نے لکھا کہ میں آپ کے وچارسے کہ ہر ایک دیش واسی ہندی اور اُردو دونوں سیکھے، اتفاق نہیں کرتا۔ آخر ۲۵ر جولائی ۱۹۴۵ء کو مہاتما جی نے سمیلن چھوڑ دیا۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے بٹوارے کا فیصلہ ہوگیا تب بھی مہاتما جی اپنی بات پر اٹل رہے۔ اعتراض کیا گیا کہ جب پاکستان ایک حقیقت بن گیا ہے تو ہندوستانی زبان کو ہندی اور اُردو لکھاوٹوں میں پھیلانے کی کوشش ریت کی رسی بٹنا ہے اور پاگل پن ہے لیکن مہاتما جی اپنے وشواس پر قائم رہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ قومی زبان ہندی ہوگی جو دیوناگری میں لکھی جائے گی تو انھوں نے کہا کہ میں اس پر کبھی رضامند نہیں ہوسکتا۔

ہریجن ۱۰ر اگست ۱۹۴۷ء

۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی ڈائری میں لکھتے ہیں

" میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آیندہ سے یوپی کی سرکاری زبان ہندی، دیوناگری لپی کے ساتھ ہوگی۔ اس سے مجھے دُکھ ہوا۔ ہندو مسلمان میں برابر کے سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ اُردو لپی کو بھی باقی رکھا جائے۔ ایک ایسا ملک نہ بنانا چاہیے جہاں مسلمانوں کے لیے عزت کی زندگی ناممکن ہو جائے۔"

۱۸ر اکتوبر کو لکھتے ہیں۔

" ہماری قوم پرستی اگر دونوں لپیوں کے سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت گھٹیا قسم کی قوم پرستی ہے۔"

بھاشا کے بارے میں ان کے آخری بول ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"کیا اُردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کرکے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندوستانی ہوگیا۔ کیا وہ ایک اکھل بھارتی بھاشا کی سیوا کرسکتے ہیں۔ اگر اُردو لپی اور بھاشا کو اس سے نکال دیا جائے۔ میں ہمیشہ تو تمھارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رخصت ہوجانے

کے بعد میرے شبدوں کو یاد کروگے۔"

اور اگلے ہینے ہی وہ رخصت ہوگئے۔ انھیں کے ساتھ ہندوستانی بھی مرگئی۔ یہ مانا کہ آج بھاشا کی گتھی بہت الجھ گئی ہے اور اُردو، ہندی، ہندوستانی کا سوال نہیں رہا۔ اب ہندی اور تامل، ہندی اور بنگالی، ہندی اور انگریزی کا سوال ہے۔ پھر بھی ملک کی عام آپسی بول چال کی بھاشا کے بارے میں سوچا جائے تو باپو کے وچار آج بھی سولہ آنے کھرے دکھائی دیتے ہیں۔ یوپی۔ بمبئی۔ آندھرا اور کشمیر وغیرہ کے بازاروں میں جس بھاشا سے ہم اپنا کام چلاتے ہیں اُسے ہندی کہنا بھی جھوٹ ہے اور اُردو کہنا بھی غلط۔ وہ ہندوستانی ہے۔ بھاشا شاستر کے قاعدے سے اُردو ہندی کی تقسیم بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہے۔ بول چال کی بھاشا ایک، اور ادبیہ کی بھاشائیں دو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح انھیں سمو کر ایک کر دیا جائے۔

آج ہمارے دیش کی بھاشا ئی گتھی سلجھانے کے لیے باپو کی کتنی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر زورؔ کی لسانی خدمات

ڈاکٹر زورؔ، ماہر لسانیات، نقاد، محقق، مورخ، سوانح نگار، مرتب، مدیر سبھی کچھ تھے۔ اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان کی جولانیاں بعض صفحۂ قرطاس تک محدود نہ تھیں۔ وہ میدان عمل کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی ذات ہزار شیوہ ایک ادارہ تھی جس نے بہت سے ادارے بنائے۔

ایک بار میں نے بھوپال کے اسٹیشن پر ڈاکٹر زورؔ سے پوچھا کہ آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کس کتاب پر ملی تھی انھوں نے کہا کہ ہندوستانی صوتیات اور اردو شہ پارے پر۔ چوں کہ ڈاکٹر زورؔ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں مل چکی تھی اور یہ کتابیں اس کے بعد مرتب ہوئیں اس سے ظاہر ہے کہ ان کا تحقیقی مقالہ ان کتابوں کے نقشِ اول کا مرقع ہوگا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لسانیات کے باب میں اردو ہندی سے ۲۵ سال پیچھے ہے یعنی آزادی کے بعد اردو کی دکانِ لسانیات میں جو متاع فخر دکھائی دیتی ہے وہ ہندی میں کم از کم ۲۵ سال پہلے وجود میں آچکی تھی۔ لیکن ڈاکٹر زورؔ نے صوتیات پر جس وقت کام کیا اس وقت تک ہندی کے موجودہ علما میں سے کسی نے لسانیات پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ بابو شیام سندر داس کی بھاشا وگیان ۱۹۲۵ء تک ہندی لسانیات کی کل کائنات تھی۔ ڈاکٹر زورؔ لسانیات کی دنیا میں بڑی دھوم دھڑکے سے آئے۔ وہ نہ صرف اردو میں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں علم زبان کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس انھوں نے اپنے شوق کو جاری نہ رکھا۔ ۱۹۲۹ء میں لندن سے پی۔ ایچ ڈی کرنے کے بعد وہ ڈی۔ لٹ کے لیے پیرس پہنچے اور پروفیسر جیولز بلاک کی رہنمائی میں گجراتی فارم آف ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسے پورا نہ کیا۔ اگر مرحوم لسانیات سے دلچسپی لیتے رہتے تو ملک کے بڑے ماہرین لسانیات میں شمار کیے جاتے۔ لسانیات کے سلسلے میں ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ Hindustani Phonetics ۱۶ صفحات کا یہ انگریزی کتابچہ ۱۹۳۰ء میں

پریس سے شایع ہوا۔

۲۔ ہندوستانی لسانیات ۱۹۳۲ء

ان کے علاوہ دو مضامین میری نظر سے گزرے " اُردو اور پنجابی " یہ مضمون نقوش لاہور میں غالباً پہلی بار ۱۹۵۲ء میں شایع ہوا۔ دوبارہ یہی نقوش کے ادب عالیہ نمبر بابت اپریل ۱۹۶۰ء میں شامل کیا گیا۔

۲۔ 'اردو کی ابتدا' یہ مضمون دلّی یونیورسٹی کے رسالے " اردوئے معلّٰی " کے لسانیات نمبر جلد سوم شمارہ ۴۔۵ بابت ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا۔

ان کی کتاب ہندوستانی لسانیات اور ان کے اُردو مضامین سے قارئین اُردو متعارف ہیں۔ ان تحریروں میں اُردو کی ابتدا سے متعلق جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس سے اختلاف بھی کیا گیا ہے لیکن لسانیات میں ان کا اصل کارنامہ ہندوستانی فونیٹکس ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کا اُردو ترجمہ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اُردو دنیا اس کے نام سے بھی روشناس نہیں حالانکہ ڈاکٹر زور کو لسانیات کی تاریخ میں کوئی مقام دیا جائے گا تو اسی کی بدولت۔

ڈاکٹر زور کی لسانی تحقیقات، پچیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں لسانیات، بالخصوص صوتیات کا علم زمین سے آسمان تک پہنچ چکا ہے۔ آج ہمیں ڈاکٹر زور کی تحریروں میں سقم نظر آتے ہیں لیکن ۱۹۳۰ء میں یہی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ ذیل میں ان کے کارناموں کا سرسری تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی فونیٹکس (انگریزی میں)۔ اُردو دنیا ڈاکٹر زور کو تاریخی و تقابلی لسانیات کے ماہر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن ان کا زیادہ اہم کام صوتیات کے ضمن میں ہے۔ لندن اور پیرس کی تجربہ گاہوں میں ڈاکٹر زور نے آوازوں کا جو تجزیہ کیا 'ہندوستانی صوتیات' اسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں علم زبان کے وہ موتی بکھرے ہیں کہ جب بھی اس کی سیر کی جائے کوئی نہ کوئی گوہر غلطاں ہاتھ آہی جاتا ہے۔

تمہیدی باب میں مصنف نے اُردو کے آغاز کے بارے میں اپنا مشہور نظریہ پیش کیا ہے کہ بارھویں صدی سے قبل صوبۂ سرحد سے الٰہ آباد تک ایک زبان بولی جاتی تھی۔ بارھویں صدی کے بعد زبانوں کا اختلاف شروع ہوا۔ پنجاب میں پنجابی بن گئی یوپی میں کھڑی بولی۔ اُردو نہ پنجابی سے مشتق ہے نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس نے ان دونوں کے مشترک ماخذ سے تشکیل پائی ہے۔ میں اس

نظریے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کیوں کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اسے اچھی طرح پرکھ چکے ہیں۔ اس باب کے دوسرے جزو میں زورؔ صاحب نے شمالی اور دکنی اُردو کے اختلافات بڑی وضاحت اور تفصیل سے پیش کیے۔ اس سے پہلے کسی نے دکن کی خصوصیات کے بارے میں شاید ہی لکھا ہو۔ زورؔ صاحب نے دانائے راز کی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے پہلے صوتیاتی اختلافات کی شرح کی ہے بعد میں صرف و نحو کی۔ یہ سب ڈاکٹر زورؔ کے اپنے شاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ آیندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لیے ان کی یہ تحریر مشعلِ راہ ہے۔

دوسرے اور تیسرے باب میں اُردو کی اصوات میں ایک ایک کو لے کر اس کا تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اُردو میں ۹ مصوتے اور ۶ جڑواں مصوتے (Dipthong) قرار دیے ہیں جس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ مصمتوں میں انھوں نے نھ۔ لھ۔ رھ۔ ڑھ۔ دھ۔ نھ کو بھی شامل کیا ہے۔ حالاں کہ ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی اُردو یا ہندی عالم نے ان آوازوں کو مفرد تسلیم نہیں کیا لیکن ہندی ڑ کو اُردو مصمتوں میں جگہ دے کر انھوں نے حقیقت نگری کا ثبوت دیا ہے۔ پھر مختلف ماحولوں میں اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی شرح کی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے کم از کم ہر آواز کا ایک (Palatograme,) دیا ہے۔ پیلیٹوگرام تالو کے اس نقشے کو کہتے ہیں جس سے یہ واضح ہو سکے کہ کسی خاص آواز کو ادا کرتے وقت زبان تالو کے کس حصّے کو چھوتی ہے) اس کے علاوہ بعض آوازوں کے نازک اختلافات کو کائموگراف سے بنی ہوئی لکیر کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ اُردو کی ایک ایک آواز کو لے کر اس کا تجزیہ پیش کرنا ڈاکٹر زورؔ کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر تاحال اُردو اور ہندی کی کسی کتاب میں نہیں ملی۔ گو لنگ بہاری وِصل کی ہندی کتاب 'دھونی وگیان' میں انگریزی آوازوں کا اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے، ہندی آوازوں کا نہیں۔ اس میں پیلیٹوگرام دیے ہیں لیکن کائموگراف کے چارٹ نہیں دیے۔

مصمتوں کے تجزیے میں ڈاکٹر زورؔ نے کس باریک بینی اور عمیق نظر کا ثبوت دیا ہے وہ چند مثالوں سے واضح ہوگا۔

۱۔ لفظ کے آخری (ب) کے بعد ہم عموماً ایک نہایت خفیف مصوتہ بھی بولتے ہیں۔ ثبوت میں دو الفاظ 'تب' اور 'دُصب' کا کائموگرافی خط درج کیا ہے جس میں ب کے بعد ایک خفیف مصوتہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

۲۔ لفظ کا ابتدائی (ت)، درمیانی یا آخری (ت) کی نسبت زیادہ وضاحت سے ادا ہوتا ہے۔

۳۔ درمیانی (تھ) اور (دھ) میں ابتدائی (تھ)، اور (دھ) کی نسبت تنفیس یعنی ھکاریت کم ہوتی ہے

۴۔ درمیانی (ٹ) ابتدائی (ٹ) کی نسبت شدت سے ادا ہوتی ہے۔

۵۔ لفظ کے درمیان (ٹھ) کے بعد کوئی غیر مصمتی اسپھوٹ آئے تو (ٹھ)، (ٹ) کی آواز دیتا ہے مثلاً بیٹھنا اور کٹھ پتلی میں۔

۶۔ لفظ کا آخری (چ) نہایت خفیف ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ یہ پا در ہوا دعویٰ نہیں۔ ان سب کو پیلیٹوگراف یا کائموگراف کے نقشوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

آوازوں کے تجزیے کے بعد ڈاکٹر زور نے مرکب الفاظ کی ان آوازوں کی تفصیل درج کی ہے جو متعاقب آواز کے اثر سے کسی حد تک بدل جاتی ہیں مثلاً "چپ بیٹھو" میں (پ) کی آواز (ب) سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ "کتبہ" میں (ت) کی آواز (د) جیسی۔ "میچ دار" میں (چ) کی آواز (ج) کے مانند اور "بات چیت" میں (ت) کی آواز (چ) سے مماثل ہو جاتی ہے۔ اصولوں اور مثالوں کی کثرت ان کے مشاہدے کی وسعت اور ہر گیری کی غماز ہے۔

چوتھے باب میں بُل اور سُر لہرے بحث کی ہے۔ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے آج بھی قلم کو لرزش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اُردو زبان میں بُل اور سُر لہر کی تعیین جس وقت کی اس وقت تک کسی ماہر لسانیات نے اُردو یا ہندی کے اس پہلو پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے ڈاکٹر زور کے اصول غنیمت ہیں۔ انھوں نے دو رکنی اور سہ رکنی الفاظ کے بُل کو بڑی حد تک صحیح طور پر گرفت کر لیا۔ چنانچہ ان سے ۲۴ سال بعد لکھتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے انگریزی کتابچے میں ان کی تائید کی۔ زور صاحب کے اصولوں سے کہیں کہیں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ترقی کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں کیا لیکن ۱۹۲۷ء ۱۹۲۵ء کا زمانہ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر زور کے اجتہاد کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس باب کے دوسرے جزو میں اُردو کلام کی سُر لہر کی تشریح ہے اس موضوع پر ابھی تک کوئی دوسرا کام سامنے نہیں آیا۔

غرضکہ یہ رسالہ کوزے میں دریا سما دینے کی اچھی مثال ہے۔ اس میں محض اصول و نکات ہیں۔ حشویات یا اطناب کا نام نہیں۔ آج اُردو صوتیات کے کسی بھی مسئلے پر لکھنا ہو، ہندوستانی فونیٹکس کی ورق گردانی ناگزیر ہے کیوں کر جویائے علم کے لیے یہ رسالہ

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

کی مثال ہے۔

"ہندوستانی لسانیات" میں ڈاکٹر زور نے ان موضوعات پر لکھا جو نہ صرف اس زمانے میں بلکہ اس کے بہت بعد تک اُردو میں نئے تھے مثلاً زبانوں کی صوتی تبدیلی اور اس کے اسباب، دنیا کی زبانوں کے خاندان، ہند آریائی کی گروہ بندی وغیرہ۔ صوتی تبدیلی کا بیان آج کی معلومات کے لحاظ سے تشنہ ہے لیکن ہند آریائی کی تفصیلات آج بھی بیشتر صحیح ہیں۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں ہندوستانی کے آغاز اور ارتقا سے بحث کی ہے جس کا مرکزی حصہ ان کے اپنے نظریے کی تشریح ہے۔ اسے سب سے پہلے وہ اپنی انگریزی کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔

اس حصے کا ایک عالمانہ باب "ادبی بولیاں۔ گجراتی۔ دکنی۔ شمالی" اس میں ڈاکٹر زور کے ڈی لٹ کے نامکمل کام "گجراتی اردو" کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آج کے اہلِ علم میں کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دکنی اور گجری مختلف بولیاں ہیں۔ انھیں ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے لیکن زور صاحب نے دونوں بولیوں کے چار اختلافات پیش کیے اور اس طرح دکنی کو گجری سے ممیز کیا۔ اگر وہ اس کام کو جاری رکھتے تو اس بولی کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا۔ دکنی اور گجری میں فرق کرنے کے بعد ڈاکٹر زور نے دکنی اور شمالی اُردو کے اختلافات کا مجمل بیان کیا ہے۔ یہ وہی ہیں جو انگریزی رسالے میں تفصیل سے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اپنے دو مضامین میں ڈاکٹر زور نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی۔ اُردو سے متعلق اپنے نظریے کا اعادہ کیا ہے۔ ۱۹۳۲ء کے بعد اُردو اور ہندی کی تاریخی تحقیق بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن زور صاحب کو اپنے نظریے کی صحت پر یہاں تک اعتماد تھا کہ وہ بعد کی تحقیقات کی روشنی میں ترمیم کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر زور کی لسانیاتی خدمات کا صحیح اور منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نہ عقیدت کے جوش میں ہیرو پرستی کی گئی ہے نہ ۱۹۶۴ء کی عینک سے دیکھ کر خواہ مخواہ خوردہ گیری کی گئی ہے۔ اس جائزے سے روشن ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور کی طبیعت تاریخی لسانیات سے زیادہ تجزیاتی لسانیات بالخصوص صوتیات سے مناسبت رکھتی تھی۔ وہ ہمارے ملک کے ابتدائی علمائے صوتیات میں سے تھے۔ اگر وہ لسانیات سے قطع تعلق نہ کر لیتے بلکہ خود بھی پڑھتے لکھتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے لکھنے پر مائل کرتے تو اُردو زبان اس صنعت میں اتنی پچھڑی نہ ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش ہوتی۔

اُردو لفظیات میں اضافے

اقبال کا شعر ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں   ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

یہ بات زندگی کے کسی اور شعبے کے بارے میں درست ہو کہ نہ ہو زبان کے بارے میں باون تولے پاؤ رتی سچ ہے۔ زبان ذخیرۂ الفاظ کے معاملے میں اس تیزی کے ساتھ بدل رہی ہے جیسے ہم کسی چھوٹے اسٹیشن پر کھڑے ہوں اور سامنے سے راجدھانی ایکسپریس گزر جاتے۔ ادب کے مورخ متروکات کی بات کرتے آتے ہیں لیکن انھوں نے لفظیات میں اضافے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ زندگی کی گوناگونی اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ زبان اُردو بھی سمندر کے جوار کی طرح پھیلتی جا رہی ہے آج کل نسلوں کی خلیج کی جو بات کی جاتی ہے وہ زبان پر سب سے زیادہ صادق آتی ہے۔ ہر نسل کے ساتھ زبان پر اتنے الفاظ کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ چند نسلوں کے فرق کے ساتھ ایک دوسرے کی بات سمجھنا کٹھن ہو جائے گا۔ آج عربی فارسی اصل کے اتنے الفاظ ایسے ایسے نئے معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں کہ مثلاً غالب ہمارے بیچ آجائیں تو ہماری بات نہ سمجھ پائیں۔

اُردو نے ماضی میں عربی فارسی پر اپنا دام پھینکا۔ ایک صدی سے انگریزی کے ساتھ یہ عمل جاری ہے۔ مغربی تہذیب سے رابطے کے ساتھ آتے دن کتنے یورپی الفاظ ہماری زبان میں داخل ہو رہے ہیں۔ نئی نئی ایجادات کے ساتھ انگریزی میں ہر سال متعدد الفاظ بڑھ رہے ہیں۔ ہم ان میں سے بعض کو جوں کا توں لے لیتے ہیں۔ بعض کو ترجمہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ بعض قدیم لفظوں کو ایسے نئے معنی دے دیے گئے ہیں کہ اب انھیں ایک علیحدہ لفظ ماننا ہوگا مثلاً جوہر بمعنی ایٹم یا ایوان بمعنی اسمبلی۔ گزشتہ پچاس ساٹھ برس میں اُردو میں جن الفاظ کا اضافہ ہوا ہے

ان کا سیر حاصل جائزہ ایک کتاب کا موضوع ہے لیکن میں مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر آپ کے سامنے ان کی ایک جھلک دکھانے پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہماری تہذیب و تمدن میں اضافے کا ایک بڑا سبب سائنسی ایجادات ہیں۔ اُردو میں ان کے نام اکثر انگریزی سے جیوں کے تیوں لے لیے گئے ہیں لیکن کچھ کا ترجمہ کیا گیا۔ یہ الفاظ تو اب پُرانے ہو چکے ہیں۔

ریڈیو، براڈکاسٹ، نشر، نشریہ، ٹیلیفون، رسیور، بمبار، ہوائی اڈا، ایر پورٹ، ایروڈروم، ہیٹر، کولر، ایرکنڈیشن، ہیڑو میکس، ٹینک۔

لیکن ذیل کے الفاظ کے نئے پَن میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔

ایٹم بم، جوہری بم، ہائڈروجن بم، نیوکلیائی، تابکاری، راڈار، ہیلی کوپٹر، ہیلی پیڈ، راکیٹ، پیراشوٹ، اسپٹنک، خلائی سیّارہ، خلاباز، چاند گاڑی، لونِنگ، ایورو، کارویل، اسکوٹر، ریفریجریٹر، فرج، ٹیلی پرنٹر وغیرہ۔

اور سائنسی ایجادات کا تازہ ترین اضافہ آریہ بھٹ ہے جو کبھی کسی مہندس کا نام رہا ہوگا۔ اب تو ایک خلائی سیّارے کا نام ہے۔ واضح ہو کہ نام و اعلام بھی ذخیرۂ الفاظ کا جزو ہوتے ہیں۔ سائنس ہی کی ایک شاخ ڈاکٹری ہے۔ اس نے ہمیں انفلوئنزا۔ وارڈ وغیرہ کے بعد ٹٹنس، بلڈ پریشر، ایکس رے، کینسر، کارڈیوگرام جیسے بھیانک الفاظ دیے تو برتھ کنٹرول، فیملی پلاننگ، لوپ، نرودھ اور نس بندی جیسے لفظ بھی دیے جنھیں بولتے وقت کچھ شرم کچھ لذّت کا احساس ہوتا ہے۔

سائنس کے بعد لیکن اس سے کچھ زیادہ اہم سیاسیات ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبے پر کمند پھینک رہی ہے۔ خود لفظ سیاست ہی کو لیجیے۔ غالبؔ کے نزدیک اس لفظ کے معنی ڈرانے، دھمکانے کے تھے۔

ع دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا

لیکن موجودہ معنی میں سیاست ایک نیا لفظ ہے۔ سیاسی الفاظ کم از کم پچاس برس پُرانے ہوں گے۔

پارلیمنٹ، اسپیکر، کورم، اسمبلی، جمہور، ایوان، بورژوا، رجعت پرست۔ پرولتاری، جدلیات، فیڈریشن، اشتراکیت، اشتمالیت، نازی، فسطائی، فاشسٹ،

ڈکٹیٹر، ریپبلک۔

آزادی کی تحریک نے اُردو میں بہت سے الفاظ کا اضافہ کیا۔ بائیکاٹ، ستیہ گرہ، مرن برت، بھوک ہڑتال، اسٹرائک۔

ذیل کے الفاظ ضرور دوسری جنگ عظیم کے بعد کے ہیں۔

یو این او۔ یونسکو، آئین ساز، قانون ساز، دستور، دستور ساز، لوک سبھا، راجیہ سبھا، راشٹرپتی، راجیہ پال، بھودان، سرودے، سی آئی اے، ایمرجنسی، میسا، مافیا، پاکستانی، دَل بدل، جن سنگھ، سنگھی، سیکولر، سیکولرزم، ترقی پذیر، پنچ شیل، سٹرنارتھی، گھیراؤ، بندھ، عام ہڑتال، انکسالائٹ۔

سیاست کے مقابل ماہرینِ معاشیات کا دعویٰ ہے کہ ہماری پوری زندگی، بلکہ خود سیاست، معاشیات کے تابع ہے۔ کیسے کیسے نئے علوم اور ان کے نام ہمارے دیکھتے دیکھتے اُردو میں آگئے: معاشیات، اقتصادیات، بشریات، سماجیات، لسانیات، صوتیات، معنیات وغیرہ۔ قدما معاش کو اس معنی میں تو جانتے تھے۔

فکرِ معاش، ذکرِ بتاں، یادِ رفتگاں اتنی سی زندگی میں کوئی کیا کیا کرے

لیکن ان کے سامنے معاشیات کا لفظ کہا جاتا تو وہ ضرور ہمارا منھ تاکنے لگتے۔ اس معاشیات، اقتصادیات اور مالیات نے ہماری زندگی کے اِرد گرد کیا تانے بانے بُنے ہیں۔ ریزرو بینک، بنکاری، چیک، انشورنس، بیمہ، اسٹاک ایکسچنج، زرمبادلہ، بلیک مارکیٹ، راشننگ وغیرہ تو پرانی باتیں ہوگئیں۔ اب کوٹا، پرمٹ، اسٹیٹ بینک، پلان، پلاننگ کمیشن، منصوبہ، یوجنا، راشن ڈیلر کی بات کیجیے۔ تازہ ترین سکہ رائج الوقت، اسمگلر کی لوٹ لیجیے۔

موجودہ زندگی کی پیچیدگیوں کے ساتھ ہمارے نظم و نسق میں کتنے عہدے اور منصب پیدا ہوگئے ہیں۔ اُردو نے بیشتر انگریزی نام قبول کر لیے ہیں۔ راشٹرپتی اور راجیہ پال کا ذکر آچکا۔ مزید ملاحظہ ہوں۔

منسٹر، ڈائرکٹر، سپرنٹنڈنٹ، رپورٹر، چانسلر، وائس چانسلر، ڈین، اکزکٹو انجینیر، ریڈر، نامہ نگار، پائلٹ، ہوا باز، لیکھ پال۔

اور انھیں کے ساتھ خطابوں کو دیکھیے کہ اب وہ عہدوں سے کم نہیں۔

بھارت رتن، پدم وبھوشن، پدم بھوشن، پدم شری، ویرچکر، مہا ویرچکر، پرم ویرچکر وغیرہ۔

ادب، زبان اور لسانیات نے پڑھے لکھوں کو بہت سے الفاظ عطا کیے۔ ان میں سے بعض تو پُرانے ہو چکے ہیں مثلاً ترقی پسندی، اسٹائل، پیروڈی، سانیٹ، آزاد نظم۔ کچھ ایسے ہیں جو قدرے پُرانے ہیں لیکن ان کا رواج حال میں ہوا ہے مثلاً تاثریت، اظہاریت، اشاریت، ڈکشن، بوطیقا، وادائیت، ایغو، تحت الشعور، لاشعور، نرگیست، سرریلزم اور یہ الفاظ قطعاً آزادی کے بعد کے ہیں۔
غالبیات، اقبالیات، میریات، وجودیت، جدیدیت، جدیدیا، ہائکو، ترائیلے، رپورتاژ، مونتاژ، تناظر معروضی (Obtective) اور مصنوعی (Subjective) بھی نئے الفاظ کہلائیں گے۔

غیر فلسفیانہ لفظوں میں فوٹو سٹیٹ، گردپوش، قلم کار، فوٹو آفسیٹ، مفاسنہ (محفل افسانہ) کا ذکر کروں گا۔ لسانیات نے صوتیات، مصوتہ، مصمتہ، فونیم، مارفیم، معنیات، صوتیہ جیسے الفاظ رائج کیے۔ تعلیم نے مختلف عہدوں کے علاوہ جامعہ، فیکلٹی، ڈیپارٹمنٹ، شعبہ، ہوسٹل، اکیڈیمی، سیمینار جیسے الفاظ کا اضافہ کیا۔

اب ادب اور زبان سے زیادہ رنگین فنون کی طرف آتیے۔ سینما، ریڈیو اور موسیقی کے سلسلے کے یہ الفاظ میری زندگی ہی میں اُردو میں داخل ہوتے ہیں۔
ہیرو، ہیروئن، ولین، پروڈیوسر، ڈائرکٹر، ایکٹرس، ایکٹر، میوزک، گلوکار، اداکار، ہدایت کار، تزئین کار، صدابندی، پلے بیک، ٹکنی کلر، ٹیپ رکارڈر، اسٹیریو، اسکرین، شوٹنگ، اسکرپٹ، ٹوئسٹ، راک اینڈ رول، جاز، کیبرے، آکاشش وانی، گیت مالا وغیرہ۔

اور اگر آپ زیادہ سنجیدہ فنون پسند کرتے ہیں تو ان کے لیے اُردو میں بھارت ناٹیم، تجریدی، کینواس، پورٹریٹ جیسے الفاظ ہیں۔
کھیل کود کی دنیا میں بہت سے الفاظ اس صدی کی ابتدا میں آگئے تھے لیکن باسکٹ بال، باکسنگ، اسکیٹنگ، ہائکنگ، کوہ پیائی وغیرہ حال کے معلوم ہوتے ہیں۔
سماجی زندگی میں کثرت سے الفاظ کا اضافہ ہو رہا ہے۔

ریستوران، بار، موٹل، بوفے، لنچ، ڈینر، بیرا، ایش ٹرے، ٹورسٹ، رومانس، ہنی مون، ایر ہوسٹس، لپ اسٹک، باتھ روم، ڈیڈی، ممی، پاپا، آنٹی، ہپی، ساتڈ برن، بیٹل، ایل ایس ڈی وغیرہ۔

ملبوسات میں بش شرٹ، شرارہ، نائلن، ٹیریلین، کریپ، وائل، روبیا، سینفرائزڈ، ٹیری کاٹ وغیرہ کی طرف للچائی نظر ڈال کر گزرنا ہوگا۔ غذا میں راشن، ڈالڈا، بناسپتی کافی وغیرہ۔ غیر دلچسپ ہوں تو کوکاکولا، کوک، ملکا وغیرہ سے کسی کو پرہیز نہیں ہوسکتا ہاں میٹھا ممنوع ہو تو سیکرین کے لفظ پر توجہ کیجئے۔

بعض جغرافیائی نام بھی ذخیرۃ الفاظ میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں مثلاً آزادی کے بعد کے اضافے پاکستان، افریشیائی، ملیشیا، ویٹ نام، زانزتنزانیا، زامبیا، پختونستان، اُترپردیش، مدھیہ بھارت، وندھیا پردیش، آندھرا، کیرالا، ہماچل، میگھالے، اُرناچل اور وارانسی اور تری وینڈرم جیسے شہر۔

الفاظ بہت ہیں اور مہلت کم۔ لسانیات اعلام (اسم معرفہ) کو بھی ذخیرۃ الفاظ کا جزو مانتی ہے۔ اگر میں ناموں کو شمار کرنے لگوں تو پپو، ببلو، گڈو، نیٹو، مینو وغیرہ قطار لگاتے کھڑے ہیں کہ ہم بھی آزادی کے بعد کی پیداوار ہیں ہمیں بھی سامنے لاؤ۔ میں انھیں ٹاٹا کہتا ہوں۔ ٹاٹا سے مراد جمشید جی نہیں بلکہ خدا حافظ اور شب بخیر کا نیا روپ۔

یائے اضافت اور ہمزہ

زبان کے مسائل کے بارے میں دو نقطہ ہائے نظر عام ہیں جن کی نشاندہی علامہ کیفی نے یوں کی ہے ۔

"جہاں دنیائے اُردو میں ایسے اصحاب پیدا ہو گئے ہیں جو کسی قاعدے یا ضابطے کے پابند ہی نہیں ۔ وہیبت کا جن ان کے سر پر ایسا سوار ہے کہ ان کی گردن کسی اصول اور ہدایت کے سامنے خم ہونے میں نہیں آتی، ایسے اصحاب بھی عنقا کا حکم نہیں رکھتے جو قدیم ضابطے اور دستورالعمل میں سرِمو تبدیلی اور ترمیم کو کفر وارتداد کا مرادف سمجھتے ہیں ۔ ان کا جبر و استبداد سیاسی جبر واستبداد سے کم نہیں یہ ادبی سخت جان اور سخت گیر بھی زبان کے حق میں ایک طرح کا مزمن مرض ہیں ۔"[1]

ان دونوں گروہوں میں کیفی دوسرے گروہ سے زیادہ نالاں ہیں ۔ دراصل یہ جھگڑا زندگی کے ہر شعبے کی طرح نوجوان اور بوڑھے کے نقطۂ نظر کا ہے لیکن ان دونوں گروہوں کے بیچ ایک نسل ادھیڑ عمر والوں کی بھی ہوتی ہے موجودہ حالات کے مطابق روایتوں اور قدیم اصولوں میں ترمیم سے نہیں بھڑکتی لیکن نراج کے انداز میں نہیں بلکہ بعض بدلے ہوتے اصولوں کے تحت ۔ میں اسی میانہ روی کے حق میں ہوں ۔ واضح ہو کہ تحریر کی واحد غرض تحریر کو اس طرح کاغذ پر ٹانک دینا ہے کہ قاری ہر لفظ کا وہی تلفظ پیدا کر سکے جو کاتب کا عندیہ تھا ۔ طریق املا کی خوبی یہ ہے کہ ایک آواز کو ہر لفظ میں ایک ہی طرح پر لکھا جائے تاکہ لکھنے والے کو کسی لفظ کے ہجے یاد نہ کرنے پڑیں ۔ تلفظ سن کر وہ خود بخود صحیح املا لکھ سکے اور پڑھنے والا اس

---

[1] منشورات : مرتبہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صفحہ ۲۹ ۔ انجمن ترقی اردو، دلی ۱۹۶۸ء

لفظ کو لکھا دیکھ کر اس کا صحیح تلفظ کر سکے۔ انگریزی میں رومن رسم الخط کی اس طرح تخریب کی گئی ہے کہ کوئی نشان کسی لفظ میں کچھ آواز دیتا ہے۔ کسی میں کچھ۔ یہ خرابی مصوتوں سے بڑھ کر مصمتوں تک پہنچ گئی ہے۔ انگریزی خط میں کرنل اور لفٹنٹ جیسے الفاظ کو دیکھئے "ر" اور "ف" کی آواز موہوم حروف سے پیدا کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں ہر لفظ کے ہجے فرداً فرداً یاد کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس ناگری رسم الخط میں لفظوں کے ہجے یاد نہیں کرنے پڑتے۔ اُردو رسم الخط میں جہاں تک ہندوستانی آوازوں کا تعلق ہے، یہ دشواری نہیں لیکن عربی کے مخصوص حروف کا وقوع یاد کرنا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ بعض عربی فارسی الفاظ کو اس طرح لکھا جاتا ہے کہ وہ اُردو املا کے ہندوستانی مزاج پر تشدد کرتا ہے مثلاً:

لہٰذا، زکوٰۃ، عیسیٰ، فی النار، کما حقہٗ، فی نفسہٖ، دفعتاً، خواب۔

اس قسم کے الفاظ کا مقررہ املا ہر اُردو خواں کو مجبور کرتا ہے کہ ان کے ہجے اور ان کی ہیئت کو ازبر کر لے۔ املا اور ہجے کا بنیادی مقصد صوت کی نمائندگی ہونا چاہیئے۔ لیکن اُردو میں ستم یہ ہے کہ املا کو صرف (Morphology) اور اشتقاقیات (Etymology) کا تابع کیا جاتا ہے۔ "فی النار" کو "فنار" نہ لکھ کر "فی النار" اس لیے لکھیے کہ واضح رہے کہ یہ فی + ال + نار کا مجموعہ ہے۔ "عادۃً" کو الف کے ساتھ عادتاً نہ لکھیے تاکہ معلوم رہے کہ لفظ عادت میں تائے تانیث ہے۔ "وقتاً" صحیح "عادتاً" غلط۔ گویا ہر نو آموز کو ان الفاظ کے اشتقاق اور صرفی تجزیے سے بڑی دلچسپی ہے۔

ان استثنائی الفاظ کا املا کتنا ہی خلافِ معمول سہی اچھے پڑھے لکھے انھیں مقررہ ڈھنگ ہی سے لکھتے ہیں۔ مبتدیوں کی بات دوسری ہے۔ میں املا کی ایک ایک ایسی روش کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے عوام ہی نہیں بلکہ خواص کی بھی اکثریت فارسی کے مقررہ قواعد کے خلاف لکھتی ہے۔

غالب تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"یاد رکھو یائے تحتانی تین طرح پر ہے:

جزوِ کلمہ: مصرع ہمارے بر سرِ مرغاں ازاں شرف دارد

مصرع اے سرنامہ نامِ توعقل گرہ کشائے را

یہ ساری غزلیں اور مثل اس کے جہاں یائے تحتانی ہے جزوِ کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے۔ جیسے آسیائے چرخ یا آشنائے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدائے توشوم، رہنمائے توشوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے: یائے مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح: توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی مثلاً مصدری: "آشنائی" یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: "آشنائے" یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھوگے دانا نہ کہلاؤگے"[1]

مجھے یہ تسلیم ہے کہ فارسی قواعد کی رُو سے یائے اضافت کے ساتھ ہمزہ نہ چاہیئے لیکن اُردو کا چلن کیا ہے؟ کوئی رسالہ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھ لیجئے ۹۵ بلکہ ۹۹ فیصدی مقامات پر یائے اضافت کے اوپر ہمزہ لکھا ملے گا۔ صرف ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا عرشی صاحب اور مالک رام صاحب جیسے ماہرینِ علوم شرقیہ کی مطبوعہ تحریریں اس نسے پاک ہوں گی۔ ذیل میں چند معیاری رسالوں کی فہرست سے کچھ ایسے عنوانات درج کیے جاتے ہیں جن میں یائے اضافت پر ہمزہ موجود ہے۔ یہ عنوانات رسالے کے اندر جلی سُرخی میں بھی ہیں۔ ایسے نمایاں مقامات پر ہمزہ کا ہونا محض سہوِ کاتب ہی نہیں ہوسکتا بلکہ اسے ادارہ کی تائید بھی حاصل ہوگی۔

میر کی مثنوی دریائے عشق کا ایک ماخذ	:	ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں، اُردو، اپریل ۱۹۵۱ء ایڈیٹر مولوی عبدالحق
اُردوئے قدیم کے دو نادر مخطوطے	:	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، اُردو، جولائی ۱۹۵۲ء ایڈیٹر مولوی عبدالحق
گنج ہائے گراں مایہ	: افسر امروہوی	قومی زبان، مئی ۱۹۶۶ء

---

[1] خطوط غالب: مرتبہ مالک رام، صفحہ ۳۰ ۱۹۶۲ء

نوائے عاشقانہ : جگن ناتھ آزاد آج کل، ۱۵ فروری ۱۹۴۹ء
ایڈیٹر جوش، نائب مدیر عرش، جگن ناتھ آزاد

اجزائے لغت پر تنقید : وارث سرہندی اردو نامہ، جنوری ۶۸ء
نوائے سروش (نظم) ماہر القادری اردو ادب شمارہ ۳ ۱۹۷۰ء
سرسید کے نام رفقائے سرسید کے غیر مطبوعہ خطوط : ڈاکٹر اصغر عباس
اردو ادب شمارہ ۴، ۱۹۷۱ء
غازہ روئے گلعذار (نظم) جمیل مظہری شاعر ستمبر ۱۹۷۱ء
صدائے غالب (نظم) اقبال ندیم نیا دور، صفحہ ۴۵، دسمبر ۱۹۷۲ء
ایڈیٹر صباح الدین عمر

شیدائے امن کا ماتم : شاستری کی وفات پر اداریہ نیا دور فروری ۱۹۶۶ء
نیا دور جون میں صفحہ ۶۵ پر ایک کتاب 'گلہائے شگفتہ' پر تبصرہ ہے جہاں جلی حروف میں 'گلہائے شگفتہ' لکھا ہے۔ رسالہ اردو کے بابائے اردو نمبر ۱۹۶۶ء (مرتبہ سید وقار عظیم) میں سرورق پر اور اندر ہر جگہ 'بابائے اردو' ہمزہ کے ساتھ لکھا ہے۔ یہی کیفیت 'قومی زبان' کے بابائے اردو نمبر ۱۹۶۶ء کی ہے۔ میرے پاس نگار کے چند شمارے ہیں۔ ان میں فہرست مضامین میں تو یائے اضافت نہیں دکھائی دی۔ لیکن نگار مئی ۱۹۴۹ء میں صفحہ ۴ پر سالنامے کا اشتہار ہے جس میں 'دنیائے ادب' کا فقرہ ہے۔ اسی طرح جولائی ۱۹۵۰ء کے نگار میں صفحہ ۲ پر نگار بک ایجنسی کی کتابوں کے اشتہار میں جہاں کشائے نادری کا نام درج ہے۔ یہ دونوں شمارے نیاز فتحپوری کے مرتبہ ہیں۔ یہ تمام رسائل اور ان کے مدیر اردو میں اہم مرتبہ رکھتے ہیں۔

جہاں تک کتابوں کے ناموں کا تعلق ہے ان میں یائے اضافت لگانے کا عام رواج ہے۔ ذیل میں ایسی چند کتابوں کے نام درج کیے جاتے ہیں جن کے مولف مصنف قدیم علوم سے بے بہرہ نہیں۔

گنج ہائے گراں مایہ رشید احمد صدیقی ناشر مکتبہ جامعہ
انشائے ماجد حصہ اوّل عبدالماجد دریابادی

انشائے ماجد حصہ دوم — عبدالماجد دریا بادی
تذکرہ شعرائے جے پور — احترام الدین شاغل — ناشر مکتبہ جامعہ
بابائے اُردو عبدالحق — عبداللطیف اعظمی
جوئے شیر — آنند نرائن ملاّ

بکٹ کہانی: مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی و ڈاکٹر مسعود حسین خاں میں یائے اضافت پر شدّت سے ہمزہ پایا جاتا ہے مثلاً متن میں:

ع کسے رامی کُند رسوائے بازار (ص ۴۱۲)
ع بہ طوقِ حلقہ ہائے گوشِ دلدار (ص ۴۱۴)
ع گدا ہو کر پھروں رسوائے بازار (ص ۴۱۵)

اس کتاب کا عالمانہ مقدمہ ڈاکٹر مسعود حسین کے نام سے ہے۔ اس میں فارسی جملوں میں ص ۳۸۰ پر 'برائے خاطر' رضائے شما' رضائے ماہ کی تراکیب دکھائی دیں۔ صفحہ ۳۸۱ پر افضل کے فارسی اشعار میں " دلہائے شکستہ " "مینائے شکستہ " " تودہ ہائے عنبر" "مشکہائے اذفر" کی تراکیب ہیں اور سب میں یے پر ہمزہ ہے یہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے اس لیے سہو کاتب کا دخل نہیں۔ چونکہ یہ خاص اہتمام سے ترتیب دے کر چھاپی گئی ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس کے پروف توجہ سے پڑھے گئے ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کتاب کے فاضل مرتبین یائے اضافت پر ہمزہ لکھنے کے حق میں ہیں۔ میں نے یونیورسٹیوں کے ایسے اساتذہ کو جو فارسی یا عربی سے بخوبی واقف ہیں یائے اضافت پر ہمزہ لگاتے دیکھا ہے۔ ریڈر کی اسامی کے انتخاب یا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے انٹرویو میں دریافت کیا ہے کہ اضافت کی شکل میں یائے مجہول پر ہمزہ لکھنا چاہیے کہ نہیں۔ ہمیشہ جواب ملا ہے کہ "لکھنا چاہیے"۔ کہنے کی غرض یہ ہے کہ آج قدیم علوم کے چند ماہرین کے علاوہ اچھے پڑھے لکھوں کو بھی یہ علم نہیں کہ یائے اضافت پر ہمزہ نہیں لکھا جاتا۔

سیّد انشا نے دریائے لطافت میں اصول پیش کیا ہے۔

"یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہر لفظ جو اُردو میں مشہور ہو گیا' اُردو ہو گیا' خواہ وہ عربی ہو یا فارسی' ترکی ہو یا سریانی' پنجابی ہو یا پوربی' از روئے غلط ہو یا صحیح'

وہ لفظ اُردو کا ہے۔ اگر اصل کے مطابق ہے تو بھی صحیح ہے اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح ہے۔ اس کی صحت اور غلطی اُردو میں اس کے استعمال میں آنے پر منحصر ہے کیونکہ جو اُردو کے خلاف ہے غلط ہے خواہ وہ اصل زبان میں صحیح نہ بھی ہو"۔[1]

"ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اسے اُردو زبان کا گمنا کارنامہ کہا ہے، اس لیے کہ اس میں سب سے پہلے اُردو کی آزادانہ حیثیت منوانے کی کوشش کی گئی ہے انشا کے اس اصول کا اُردو املا پر بھی کیوں نہ اطلاق کیا جاتے۔ اُردو خط میں فارسی خط سے کئی حروف زیادہ ہیں۔ اس کا اپنا مزاج ہے۔ اسے کیوں عربی فارسی کا ضمیمہ بناتے رکھا جاتے۔ زبان کا ارتقا اسی طرح ہوتا ہے کہ کسی لفظ کو کوئی ناواقف شخص غلط تلفّظ کے ساتھ بولتا ہے۔ اس کے بعد کچھ اور لوگ اسی طرح کی غلطی کرنے لگتے ہیں۔ زبان کے خزینہ دار اس پر ناک بھوں چڑھانے لگتے ہیں اور اسے تغیّر زبان کے بجائے تخریب زبان قرار دیتے ہیں لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ وہی بگڑا ہوا تلفّظ عام ہو جاتا ہے اور اسے قبول کرنا پڑتا ہے۔ اب اسے اصلاح زبان کا نام دیا جاتا ہے 'چندر' سے 'چاند' اور 'راتری' سے 'رات' اسی طرح بنے ہوں گے آج ہمیں اُردو کے متعدد الفاظ دکھائی دیتے ہیں جن کا تلفّظ خواص و عوام دونوں میں بدل گیا ہے لیکن تحریر میں اب بھی وہی فرسودہ متروک تلفّظ مسند استناد پر متمکن ہے اور مروجہ تلفّظ ٹکسال باہر ہے۔ ایسے چند الفاظ ہوں:

کتابی تلفظ	تقریری تلفظ
تجربہ (ج ساکن، ر متحرک)	تجربہ (ج متحرک، ر ساکن)
شمع (فارسی میں م ساکن)	شمع (م متحرک)
آزمائش، فرمائش، قائم، دائم (ہمزہ مکسور)	آزمایش، قایم، فرمایش دایم یائے مفتوح

---

[1] دریائے لطافت اردو ترجمہ صفحہ ۲۶۱ بحوالہ منشورات صفحہ ۵۶

[2] مقدمہ منشورات صفحہ ۱۶

معاف، متعلق، متاخرین (ع یا الف متحرک) ۔ ماف، متعلق، متاخرین (ع یا الف ساکن)
غدر، صدر بازار (د ساکن) غدر، صدر بازار (د متحرک)

عوام بھی نہیں خواص بھی دوسرے کالم کا تلفظ کرتے ہیں لیکن کسی کی مجال ہے کہ تحریر بالخصوص شعر میں دوسرے کالم کا تلفظ ظاہر کر سکے۔ یہ دورنگی اور خود فریبی کیوں اور کب تک ؟

اس کے ساتھ ساتھ عربی کے باب تفعیل کے وہ الفاظ ملاحظہ ہوں جن میں "ع" کے مقابلے میں یائے معروف آتی ہے جس کی وجہ سے املا میں دو "ی" جمع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً تعیین، تضییع، تغییر۔ فارسی میں ان کی پہلی "ی" کو ہمزہ سے بدل دیا گیا کیوں کہ ہم یہاں یائے مکسور بولنے پر قادر نہیں اور ان الفاظ کو تع۔این، تض۔ ایع، تغ۔ ایر بولتے ہیں۔ یہی کیفیت آیندہ، مایل، سایل کی ہے جہاں اصلاً یائے مکسور ہے لیکن ہم "ی" کی جگہ ہمزہ مکسور بولتے ہیں اور اسی لیے اُردو میں ان الفاظ کو آئندہ، مائل، سائل لکھنے کا رواج ہو گیا ہے لیکن سرگشتگانِ عربی و فارسی اب بھی اُردو میں تعیین اور آیندہ لکھنے پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کی وفاداری اُردو تلفظ سے نہیں عربی فارسی روایت سے ہے۔ ایک محترم بزرگ فارسی لفظ آئینہ کو بھی "دی" سے آیینہ لکھنے پر اصرار کرتے ہیں حالانکہ آہن سے آہینہ بنا اور آہینہ سے آئینہ۔ پہلی "ی" کا سوال ہی نہیں۔ جس طرح وقت کے ساتھ بعض الفاظ کا تلفظ بدل جاتا ہے۔ اسی طرح تلفظ کے استحکام کے باوجود بعض الفاظ کا املا بدل جاتا ہے۔ عہد بہ عہد کے مخطوطات اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اب کوئی پانو، پہونچنا۔ دھنواں نہیں لکھتا بلکہ پاؤں پہنچنا، دھواں لکھا جاتا ہے۔ یائے اضافت کے ہمزہ کی بھی یہی کیفیت ہے کہ وہ اب عام استعمال میں داخل ہو گیا ہے۔ اس سے انکار کرنا بدیہیات سے انکار اور چلن سے لڑنا ہے۔ عام چلن سے قطع نظر صوتی حیثیت سے دیکھا جائے کہ اُردو املا کا مزاج اس موقع پر ہمزہ مانگتا ہے کہ نہیں ؟

غالب کے وضع کردہ اصولوں کو سامنے رکھ کر اوّل میرے کہے ہوئے دو مصرعے ملاحظہ ہوں۔ املا مروجہ فارسی اصولوں کے مطابق ہے۔

ع نہ دارد زردائے گداتے درت

(تیرے در کا گدا کوئی چادر نہیں رکھتا)

اس مصرع میں "ردائے گداتے" میں آخری آواز یکساں ہے۔ پھر ایک جگہ ہمزہ لکھنا اور دوسری جگہ نہ لکھنا چہ معنی؟ اب دوسرا مصرع ملاحظہ ہو۔

ردا تے گدا تے نہ دُزدد کسے

(کسی فقیر کی چادر کوئی نہیں چراتا)

دونوں مصرعوں میں دو الفاظ " ردا تے گداتے" مشترک ہیں۔ ان کی آخری آوازیں بالکل یکساں ہیں لیکن فارسی کے روایتی املا میں ان میں ہمزہ کا مقام بدل جاتا ہے۔ اس خلفشار کی صوتی وجہ؟ اگر عقل کو گالی دینے کا فقرہ کسی موقع پر چسپت کیا جا سکتا ہے تو یہاں پر۔ املا کی غرض آواز کی ترجمانی کرنا ہے۔ یا لفظ کا صرفی تجزیہ کرنا؟ میں ان دونوں مصرعوں میں دونوں لفظوں پر ہمزہ لکھنا پسند کروں گا، لیکن ٹھہریے، مجھے فارسی املا میں ترمیم کا اختیار نہیں۔ فارسی میری زبان نہیں۔ میں اُردو املا تک ہی محدود رہوں گا۔ اُردو نثر و نظم میں اگر کوئی عربی فارسی ترکیب آتی ہے تو اسے بھی اُردو املا کے اصول پر لکھا جاتے گا۔

اُردو میں ہمزہ کی نوعیت بالیقین محض الف متحرکی ہے جب کہ عربی و فارسی میں اس کے علاوہ بھی ہے۔ عربی میں ہمزہ کی بابت ڈاکٹر محمد عقیل نے لکھا ہے:

" عربی میں ہمزہ کی واضح صورتوں کا استعمال دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ بندشی (Plosive consonant) کا ہے اور دوسرا حلق بندی[1] آوازوں (Glotta Stop) کا لیکن اُردو میں ہمزہ کا کام مصوتہ کا ہے جو کبھی اکیلے اور کبھی جڑواں مصوتہ (Diprthong) کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔[2]

عربی ہمزہ کے بارے میں ڈاکٹر عقیل کو کچھ التباس ہوا ہے کیونکہ بندشی اور حلق بندی آوازوں میں تعارض نہیں (Glotta stop) بھی (Plosive consonant)

---

[1] (The Phonetics of Arabic By W.H.T. Gaindel p. 30-31, 1925.

[2] اُردو میں ہمزہ کا استعمال از ڈاکٹر محمد عقیل۔ ہماری زبان ۲۲ فروری ۱۹۶۶ء

ان میں صرف جُزو اور کُل کا رشتہ ہے۔ میں عربی سے نابلد ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ عربی میں ہمزہ بعض مقامات پر مصمتہ بھی ہوتا ہے جب کہ اُردو میں ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ فارسی میں ہمزہ کے ایک رُخ کے بارے میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھتے ہیں:

"دراصل پہلوی زبان میں علامت اضافت (ی) ہے جو آج بھی ایسے تمام الفاظ پر آتی ہے جو الف یا واؤ (مصوتوں) پر ختم ہوتے ہیں جیسے خدای سخن' روی خوب' ہمزہ ملینہ نصف ی ہے اور پرانے نسخوں میں (ی) کی شکل میں برابر ملتی ہے۔ عربی علامتِ ہمزہ جو حرف (ع) کے شوشے کی طرح (ء) لکھی جاتی ہے وہ فارسی مخطوطات میں نہیں ہے۔ اس سے بخوبی ظاہر ہے کہ علامت اضافت و توصیف دراصل مخفف "ی" ہے ہمزہ نہیں ہے[1]"

معلوم ہوا کہ ہمزہ کی شکل (ء) عربی ہے اور (ر) فارسی۔ فارسی میں یائے اضافت پر ہمزہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ پہلوی روایات کے مطابق اضافت زیر سے نہیں بلکہ ی سے ادا کی جاتی ہے۔ ایک یے پر دوسری نصف ی کیوں لکھی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو میں بعض حضرات مثلاً نیاز فتحپوری الف یا واؤ مصوتہ پر ختم ہونے والے الفاظ کے بعد اضافت کے لیے محض ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ مثلاً سوءِظن' علماءِ اسلام میرے نزدیک اب یہ طریقہ مستحسن نہیں کیونکہ اُردو میں ہمزہ نہ نصف 'ی' کی قائم مقامی کرتا ہے نہ سالم ی کی۔ اُردو لفظ کے بیچ ہمزہ صرف وہی کام کرتا ہے جو الف متحرک کرتا۔ اُردو یائے اضافت کے ہمزہ کو پہلوی روایت سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر نذیر احمد کے بیان سے واضح ہوا پہلوی میں اضافت کا اظہار (ی) سے کیا جاتا تھا جسے ہم نے اُردو میں یائے معروف کا نشان قرار دیا ہے۔ ہمزہ اسی (ی) کا نصف ہے لیکن اضافت کی شکل میں اس کی آواز یائے معروف کی نہیں یائے مجہول کی ہوتی ہے بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ یائے مجہول کی

---

[1] یائے مخفی اور اس سے متعلق دستوری و املائی مسائل از ڈاکٹر نذیر احمد مشمولہ فکر و نظر شمارہ ۱، ۲ ۱۹۷۲ء صفحہ ۷۳

امداد کرتی ہے۔ اس طرح اُردو میں یائے اضافت کا ہمزہ واقعی تلفظ کا صوتی ترجمان ہے اور بس۔

اُردو رسم الخط کا یہ عجوبہ ہے کہ یے اور واؤ دونوں حروف ایک مصمتے کی آواز کی بھی نشانی ہیں اور بعض مصوتوں کی بھی۔ واؤ فی الوقت زیرِ بحث نہیں۔ یائے تحتانی کی مختلف آوازیں یہ ہیں:

۱۔ مصمتہ۔ ان تمام صورتوں میں جہاں تحتانی متحرک ہوتی ہے، مثلاً یار، دیار، کیا، زاویہ، عندیہ، مصمتے کی صورت میں تحتانی کے معروف یا مجہول ہونے کا سوال نہیں۔

۲۔ مصوتہ۔ ان تمام صورتوں میں جہاں تحتانی ساکن ہوتی ہے۔ یہاں تین مصوتوں کا کام دیتی ہے۔

الف۔	یائے معروف	پیلا لڑکی
ب۔	یائے مجہول	اکیلا، لڑکے
ج۔	یائے لین	کیسا، ئے

مندرجہ چار آوازوں کو ایک حرف تحتانی سے ادا کیا جاتا ہے۔ ان میں تحتانی کی بنیادی آواز کیا ہے؟ مصمتے کی یا مصوتے کی؟ اُردو رسم الخط میں قاعدہ یہ ہے کہ ہر حرف کے نام کی پہلی آواز اس حرف کی بنیادی آواز ہوتی ہے۔ عبرانی میں تحتانی کا نام یود (ید) تھا جو عربی میں 'یا' کہلایا۔ اس سے ظاہر ہے کہ تحتانی کی بنیادی آواز یود اور یا کی ابتدائی مصمتہ آواز ہے جو ہندی میں य سے اور انگریزی y سے ادا کی جاتی ہے۔

کیا تحتانی تنہا لکھی جاکر مصوتہ کی آواز دے سکتی ہے۔ اُردو رسم الخط کی روایات کو دیکھ کر میرا جواب ہے "نہیں۔"

مصوتے مختصر ہوتے ہیں یا طویل۔ اُردو خط میں مختصر مصوتے اعراب (زبر، زیر پیش) سے ادا کیے جاتے ہیں۔ طویل مصوتے اعراب + تحتانی یا واؤ سے یعنی فتحہ + تحتانی = اے۔ کسرہ + تحتانی = اے یا ای۔ اردو خط کا دوسرا عجوبہ یہ ہوا کہ طویل مصوتے کی مفرد آواز کو اردو رسم الخط میں دو یا تین آوازوں کا مجموعہ فرض

کرلیا گیا ہے ۔

" ایک" کے ہجے ہیں   الف زیر ی ے ساکن ، ک موقوف

" کے " کے ہجے ہیں   ک زیر ی ے

گویا لفظ کا وسط ہو یا آخر ۔ تحتانی سے مصوتے کا کام لینے کے لیے اس کا ماقبل مکسور (یا مفتوح) ہونا ضروری ہے ۔ آتے ، گاتے میں ہماری آواز مصوتے کی ہے جو محض ی سے ادا نہیں ہوسکتی بلکہ ی ماقبل مکسور سے یہ کسرہ ہمزہ پر ہے جو الف کی بدلی ہوئی شکل ہے یعنی (یے) برابر ہے (اے) کے ۔ ہمزہ نہ ہو تو تحتانی مصمتہ رہ جائے گی " گاتے میں ہمزہ نہ لکھا جاتے تو اس کا تلفظ ग + ए ہوگا ۔ یعنی آخری آواز وہی ہوگی جو راجیہ ، مدھیہ ، کی ہوتی ہے ہندی میں جاتے ، گاتے جیسے الفاظ کو गाए نہ لکھ کر गाय نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ان الفاظ کو بروزن فاع ظاہر کرنا مقصود رہے ए بڑی ماترا ہے गाए لکھنے سے اس کا تلفظ گا + اے (بروزن فعلن) ہوجاتا ۔ اس سے بچنے کے لیے य لکھا گیا ۔ ناگری خط کو کیا کیا جاتے وہاں تو جے ، وجے ، کو [illegible] لکھا جاتا ہے حالانکہ اب ان الفاظ کا تلفظ صاف صاف जे किते ہے ۔ اُردو میں گاتے بغیر ہمزہ کے لکھی جاتے تو ہم بھی اسی غلطی کے مرتکب ہوں گے جو ہندی میں جاتے ، گاتے ، جے ، وجے جیسے الفاظ کے य سے املا میں ہوتی ہے ۔ یعنی مصمتے سے مصوتے کا کام لینا ۔ اُردو میں آئنے ، جاتے پر ہمزہ لکھنے کا رواج خواہ مخواہ نہیں ہوگیا ۔

الف یا واؤ ساکن کے بعد یے کی آواز کی دو نوعیتیں ہوتی ہیں ؛ ایک طویل ، دوسری خفیف ۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے ان مقامات پر ہمزہ کے استعمال کے کچھ قاعدے بناتے جو یہ ہیں ۔

" اس بات کو نہ بھولنا چاہیئے کہ ہمزہ الف کا قائم مقام ہے ۔ پس جب دو حروف علت اپنی اپنی آواز الگ الگ دیں تو ان کے بیچ میں ہمزہ آسکتا ہے نہیں تو نہیں ، اس لیے :

ؤ ، جاؤ ۔ گیت گاؤ ۔ دو لڑکے آئے ۔ آپ آئے ۔

یں آؤں تو کیا لاؤں ۔

میں چاہتا ہوں کہ آرام سے سوؤں۔
وغیرہ میں ہمزہ لکھا جاتے۔ مگر
"بناؤ سنگھار، بھاؤ تاؤ، نبھاؤ، گھاؤ، کڑھاؤ۔"
میں ہمزہ کا کچھ کام نہیں۔ اسی طرح گائے۔ چائے۔ رائے اور ہائے
میں بھی ہمزہ نہ چاہیئے اور یہی حال" دیوا اور سیوا اور ریوڑ یا' وغیرہ
کا ہے۔ ان لفظوں میں" الف ی" الف و" یا" بے و" مل کر ایک
آواز دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے بیچ میں ہمزہ کی گنجائش نہیں" [1]

موصوف کا مطلب ہے کہ جب الف یے' الف و' یے و مل کر ایک صورت رکن (Syllable) ہوں تو ہمزہ نہ لکھنا چاہیئے۔ دیو۔ سیو کو فی الحال چھوڑ یے کیونکہ ان میں و مصمتہ ہے۔ بقیہ لفظوں میں 'یے' یا 'و' خفیف مصوتے ہیں۔ اس اصول کا تجزیہ کرنے کے لیے طویل اور خفیف دونوں آوازوں پر فرداً فرداً غور کیا جاتے اوّل طویل آوازکو لیجئے۔

آتے، جاتے کا دوسرا جزو اگر طویل مصوتہ ہو یعنی یہ الفاظ بروزن فعلن (ع 'کہ یہ لوٹا ہوا تارامہ کامل نہ بن جاتے') ہوں تو ان میں دوسرے جزو "ئے" میں ہمزہ دراصل الف کی نمائندگی کر رہا ہے۔ یعنی یہ" اِے" ہے جو لفظ کے درمیان آنے کی وجہ سے ہمزہ کی شکل میں لکھی گئی ہے۔ اب ذیل کے مصرعوں میں یاتے اضافت ملاحظہ ہو جہاں" ہے" طویل ہے۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
بیابانِ فنا ہے بعد صحرائے طلب غالب
نوائے خفتۂ الفت اگر بے کار ہو جائے (غالب)
گلشن میں کہیں بوئے دم ساز نہیں آتی اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی
(ثاقب)

---

[1] اُردو املا از ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مشمولہ "اُردو میں لسانیاتی تحقیق" صفحہ ۶۲ طبع اوّل از ڈاکٹر عبدالستار دلوی کمبئی ۱۹۷۱ء

سوئے حرم چلا ہے انبوہ بادہ خواراں ہے اب بھی وقت زاہد ترمیم زہد کر لے
(فیض)

ان تمام مصرعوں میں "یئے" کی آواز "اِے" کی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تلفظ کو اُردو املا میں ہمزہ کے بغیر محض ایک تحتانی یے سے کیوں کر ظاہر کیا جا سکتا ہے "بوے" لکھ کر اسے بو + اِے بر وزن فعلن پڑھنے سے قاصر ہوں میری رائے میں ایسے موقعوں پر اُردو تحریر میں ہمزہ نہ لکھنا نا روا ہی نہیں نا درست بھی ہے اور اگر میری بات تسلیم کر لی جائے تو وہ اصول تو ختم ہو گیا کہ یائے اضافت پر ہمزہ نہ چاہیئے۔

اب دوسری صورت ملاحظہ ہو جہاں الف اور واو کے بعد "ی" کی آواز خفیف ہوتی ہے یعنی "آئے" بروزن فاع ہوتا ہے مثلاً

ع آتے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالبؔ

یائے اضافت کی شکل میں اس کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

ع تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں
ع یک مشتِ پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل
ع بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے صاف یائے اضافت کا ذکر نہیں کیا لیکن ان کا اصول یہی ہے کہ ایسی صورت میں ہمزہ نہ لکھا جائے۔ ان کا سہو یہ ہے کہ انھوں نے فرض کر لیا کہ بعض الفاظ میں آخری یے یا واؤ ہمیشہ طویل بولے جاتے ہیں (مثلاً ان کی مثالوں میں آؤ، گاؤ، جاؤ، آئے، آؤں، لاؤں) اور بعض دوسرے الفاظ میں ہمیشہ خفیف (مثلاً ان کی مثالوں میں بنھاو، گھماو، ہائے وغیرہ) اب حقیقت یہ ہے کہ گو ہم ان تمام الفاظ کو عموماً خفیف یے یا واؤ سے بولتے ہیں۔ لیکن بعض اوقات طویل بھی بولتے ہیں جیسا کہ اشعار میں کھل کر سامنے آتا ہے۔ خفیف تلفظ والے الفاظ میں ہمزہ کے حذف کا جواز ہو سکتا تھا لیکن اُردو میں الف یا واؤ ساکن کے بعد آنے والے یے یا واؤ کی کتابت میں ان کے طول یا اختصار کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ مثلاً

طویل	خفیف
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جاتے	کہ داماں خیال یار چھوٹا جاتے ہے مجھ سے
آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی	ہونٹوں پہ ترے دیکھوں ہنسی آتی ہوئی سی
پھر چھپ کے مجھے پکارتا ہے کوئی	کوئی مرتا ہے کیوں خدا جانے
یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ	دور سے چھیڑے دکھاؤ نہیں

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے ایک مضمون[1] میں دو مصوتوں کے بیچ ہمزہ کے لانے پر بہت زور دیا ہے۔ بہت سی مثالیں دے کر بار بار لکھتے ہیں

۱۔ اُردو میں ہمزہ محض دو ساتھ ساتھ آنے والے مصوتوں (Conjunct) (Vowels) کے جوڑ کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۸۔

۲۔ " ہمزہ کی اپنی کوئی الگ سے آواز نہیں بلکہ یہ دو مصوتوں کے ساتھ ساتھ آنے کا املائی اعلان کرتا ہے ..... اُردو میں اسے املائی سہولت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے الف کے بعد واو یا یے کی آوازیں بغیر ہمزہ کے ادا ہو ہی نہیں سکتیں۔ صفحہ ۱۹

۳۔" ان کی کئی تصریفی صورتوں کو اُردو میں ہمزہ کے بغیر لکھے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر دیکھئے۔ آنا سے آؤ ر، آئیں، آ، آئے، آئیے، جائیے کی مثالیں دے کر لکھتے ہیں۔

۴۔" یہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں۔ اس لیے ہمزہ کا استعمال ضروری ہے " صفحہ ۲۲۔

۵۔ ان تمام الفاظ میں جہاں دو مصوتے ساتھ ساتھ آتے ہیں ان کے بیچ میں ہمزہ لگتا ہے۔ البتہ مسئلہ اور جرأت اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں ؛" صفحہ ۲۴)

جرآت اور قرآت الف پر ہمزہ لکھنے کے کیا معنی ہیں ؟ الف متحرک اور ہمزہ کی آوازیں یکساں ہیں۔ اور اسی لیے ان الفاظ کو یا 'جرآت'، قرآت لکھا جانا چاہیے یا پھر جرئت، قرئت لکھنا ممکن ہوتا۔ چلن الف کے ساتھ لکھنے کا ہے۔ میری رائے

---

[1] ہمزہ کیوں ؟ مشمولہ اُردو میں لسانیاتی تحقیق۔ مرتبہ ڈاکٹر عبدالستار دلوی۔

میں اُردو میں ان الفاظ میں الف پر ہمزہ لکھنا زائد ہے۔

آمدم برسرِ مطلب۔ صوتیات اور املا کی بناپر ہمزہ کی ضرورت شدو مد سے تعیّن کرنے کے بعد جب ڈاکٹر نارنگ یائے اضافت پر آتے ہیں تو منتہیان عربی و فارسی کی ہیبت سے وہ اپنے وضع کردہ اصول کو بھلا دیتے ہیں اور لکھتے ہیں۔

"اگر مضاف اُردو میں الف یا واؤ پر ختم ہو تو اضافت یائے مجہول سے لکھی جائے گی۔" صفحہ ۲۶

اب دو مصوتوں کے بیچ ہمزہ کی ناگزیری کا اصول کیا ہوا؟ یہ صوتیاتی سطح سے ہٹ کر صرفی سطح پر چلے جانا ہے۔

ڈاکٹر نارنگ نے یائے لین کی اضافت کا سوال بھی اٹھایا ہے۔ لکھتے ہیں:

"وہ الفاظ جن میں یائے مجہول الف کے بعد نہ ہو بلکہ ماقبل مفتوح ہو۔ مثلاً پے، مے ان کا معاملہ مختلف ہے..... ایسے الفاظ کو کسرہ سے مضاف کرنا چاہیئے۔ پےِ معرفت، مےِ ہوش رُبا، نےِ لطیف۔" (صفحہ ۲۶)

مجھے تسلیم ہے کہ فارسی دستور کی رو سے یہاں ہمزہ نہیں لکھا جاتا۔ لیکن میری درخواست ہے کہ تلفظ اور صوتیات پر دھیان دیجیئے۔ ہم ان صورتوں میں ہرگز م + یے = میے मये نہیں بولتے بلکہ م + اِے मए بولتے ہیں۔ یعنی "مئے ہوش ربا" میں "مے" کا تلفظ بالکل "گئے" کے وزن اور قافیے کا ہے۔ اس لیے میری سفارش ہے کہ اُردو لکھتے وقت ان الفاظ میں ہمزہ لکھا جائے تاکہ املا اُردو تلفظ کی بہتر ترجمانی کر سکے۔

ص، ض کی طرح کی ہمزہ کی مخصوص آواز نہیں اس لیے اس میں اُردو میں مماثل فارسی اور ہندی الفاظ کی کتابت میں فرق کرنا پسند نہ کروں گا۔ بعض بزرگ آئے، جاتے جیسے ہندی الاصل الفاظ میں بے تکلف ہمزہ لکھتے ہیں لیکن جب وہ فارسی الفاظ رائے، وائے پر آتے ہیں تو ان کا قلم یے پر ہمزہ لگانے کو تیار نہیں ہوتا۔

اسی قسم کا امتیاز عروض میں ملتا ہے۔ ہندی الاصل الفاظ کے آخری الف۔ و۔ ی دبانے کی اجازت ہوتی ہے لیکن عربی فارسی الفاظ کے آخر میں نہیں۔ گویا اُردو زبان میں دیسی الفاظ دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ ان کے آخری۔ الف۔ و۔ ی

نحیف ہیں کہ انھیں حسب ضرورت دبایا جاسکتا ہے ۔ جو حضرات فارسی لفظ راتے کے یے پر ہمزہ لگانے کی ضرورت نہیں سمجھتے گویا ان کے نزدیک یہ تحتانی بہت قوی ہے ۔ وہ ہندی الفاظ آئے، جاتے کی یے پر ہمزہ لکھتے ہیں گویا یہ تحتانی بہت نحیف ہے اور اسے ہمزہ کے سہارے کی ضرورت ہے ۔ ان سے میری گزارش ہے کہ ایک ہی اُردو میں اب فارسی اور ہندی الفاظ کے بیچ اس امتیاز کو ترک کر دیجیے ۔

جب تک آتے، جاتے، گاتے، چاتے وغیرہ پر ہمزہ لکھنے کا چلن ہے ۔ میں جاتے استاد اور نواتے غالب میں بھی ہمزہ لکھنا مرجح قرار دوں گا ۔ میں اضافت کے ہمزہ کو حذف کر سکتا ہوں بشرطیکہ اُردو میں آتے، جاتے کے علاوہ آئی، آؤ، سوئی، کوئی وغیرہ کا ہمزہ بھی حذف کر دیا جاتے کہا جاتے گا کہ پھر آس گھاس کے 'س' کی مماثلت پر " خاص " کو بھی 'س' سے لکھنے کا مطالبہ کرو ۔ میرا جواب ہے کہ بیشک صوتی تقاضا خاص کو بھی 'س' سے لکھنے کا ہے لیکن اُردو میں اس کا چلن خواص تو درکنار عوام میں بھی نہیں ۔ جب کہ یائے اضافت پر ہمزہ لکھنے کی صوتی اور املائی غرض بھی ہے اور بھرپور چلن بھی ہے ۔ جنھیں شک ہو وہ اُردو کی کسی کتاب، رسالے اور دستی تحریر کو اٹھا کر دیکھ لیں ۔ ۹۵ بلکہ ۹۹ فی صدی صورتوں میں یائے اضافت پر ہمزہ ملے گا ۔ اگر یہ قواعد کی رُو سے غلط ہے تو املا میں بھی غلط العام کو صحیح مان لیجیے ۔

1. Gleason : An Introduction to Descriptive Linguistics 1961.
2. Hocbett : A Cource in Modern Linguistics.
3. A Manual of Phonology, 1955.
4. Block and Trager : Outline of Linguistic Analysis 1942.
5. Jesperson : Language.
6. Gray : Foundation of Language 1960.
7. D. Jones : An Outline of English Phonetics 1956.
8. D. Jones : The Phoneme, its nature and use 1949.
9. Max Muller : Lectures on the Science of Language, London 1891.
10. Whitney : Language and its study of Language, London 1884.
11. Sturtevant : Linguistic Change, 1961.
12. Bloomfield : Language, 1955.
13. Graff : Language and Languages.
14. Diamond : The History and Origin of Language, 1959.
15. Jacobson : Preliminaries Survey of India Vol. IX.
16. Dr. Zore : Hindustani Phonetics 1930.
17. Dr. Masud Husain Khan : A Phonetic and Phonological study of Word in Urdu.
18. Official Language Commission Report.
19. Report of the Parliamentary Committee on Official Language.
20. Madan Gopal : This Hindi and Devnagri 1953.
21. M. P. Desai : Our Language Problem.
22. Ambika Parshad Bajpai : Persian Influence on Hindi.